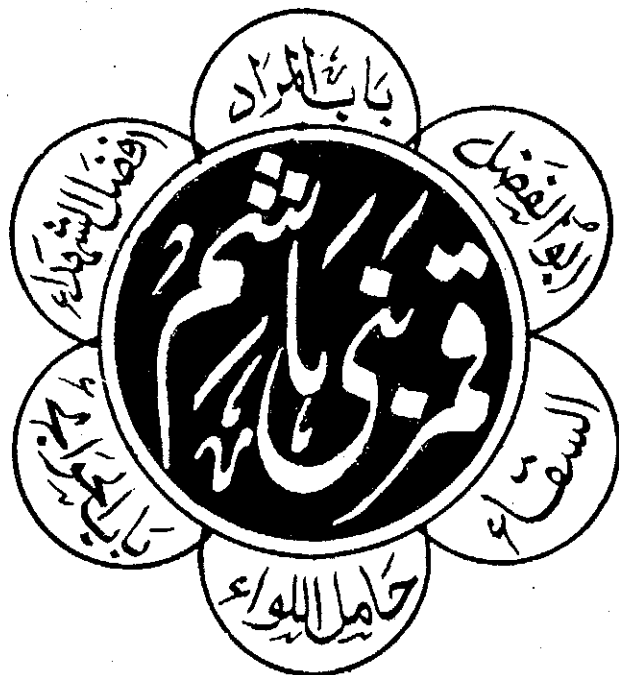


بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



تصنيف

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

حماہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نقش زندگی

اسم گرامی	عباسؑ
پدر بزرگوار	حضرت علی ابن ابی طالبؑ
مادر گرامی	فاطمہ کلابیہ
ولادت	۴ شعبان المعظم ۲۶ھ شنبہ
محل ولادت	مدینہ منورہ
شہادت	۱۰ محرم ۶۱ھ جمعہ
زوجہ محترمہ	لبابہ
اولاد	فضل، قاسم، عبید اللہ وغیرہ

تیسرا ایڈیشن	ایک ہزار
سنہ طباعت	اکتوبر ۱۹۶۶ء
پرنٹر پبلشر	محمد انعام نقوی
طباعت	پرنٹ آرٹ ۱۶ نور اللہ روڈ الہ آباد

ناشر

مذہبی دنیا

۱۹۵- بخشی بازار الہ آباد ۳

فون: ۶۰۶۶۳۶

آيَاتُ كِبَالَاتٍ

” إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ
بِأَنَّهُ لَهُمُ الْجَنَّةُ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ
وَيُقْتَلُونَ “

قرآن حکیم
” أَنْظِرْ إِلَى امْرَأَةٍ قَدْ وَلَدَتْهَا الْفُحُولَةُ مِنَ الْقَرِيبِ
لَا تَزِدْجَهَا فَتَلِدَ لِي غُلَامًا مَافِرِسًا “ (عمدة الطالب ص ٣٤)
امیر المومنین
” الْآنَ انْكَسَرَ ظَهْرِي وَقَلَّتْ حِيلَتِي وَشِيتَ
بِي عَدُوِّي “

(امام حسین)
” رَحِمَ اللَّهُ عَصِيَّ الْعَبَّاسِ فَتَقَدَّرَ الْفَرْدُ الْبَلِيَّ وَفَدَى
أَخَاهُ بِنَفْسِهِ حَتَّى قُطِعَتْ بَدَأُ فَا بُدَّ لَهُ اللَّهُ عَنَّا وَجَلَّ
مِنْهُمَا جَنَاحَيْنِ يَطِيرُ بِهِمَا مَعَ الْمَلَائِكَةِ فِي الْجَنَّةِ
كَمَا جَعَلَ لِيَجْعَلَ بَيْنَ أَبِي طَالِبٍ وَإِنِّ لِلْعَبَّاسِ عِنْدَ
اللَّهِ وَتَعَالَى مَنْزِلَةٌ يَغِيْطُهَا بِهَا جَمِيعُ الشَّهَدَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ “
(خصال صدوق ص ٣٥)

امام زين العابدين

«كَانَ عَمَّنَا الْعَبَّاسُ بْنُ عَلِيٍّ نَافِذَ الْبَصِيرَةِ صَلَبَ
الْإِيْمَانِ جَاهِدَ مَعَ أَخِيهِ الْحُسَيْنِ وَأَبْلَى بِلَاءً أَحْسَنًا
وَمَضَى شَرِيدًا» وَقُتِلَ وَلَهُ أَرْبَعٌ وَثَلَاثُونَ سَنَةً
(عمدة السید الداودی)

امام جعفر صادق
«السَّلَامُ عَلَى أَبِي الْفَضْلِ الْعَبَّاسِ بْنِ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ الْحُسَيْنِ
أَخَاهُ بِنَفْسِهِ الْأَخِي يَعِزُّهُ مِنْ أَمْسِهِ الْفَادِي لَهُ الْوَاقِي
السَّاعِي إِلَيْهِ بِمَاءِهِ الْمُقْطُوعِ يَدَا» (زيارت نامه)
(امام عصر عجل الله فرجه)
«كَانَ الْعَبَّاسُ وَسِيْعًا جَبِيْلًا يَرْكَبُ الْفَرَسَ الْمَطْهَمَ
وَرَجُلًا لَا يَخْطُرُ فِي الْأَرْضِ وَيَقَالُ لَهُ قَمَرِي هَاشِمٍ
(مقاتل الطالبيين)

ارباب مقاتل

نُقُوشِ رَاةُ

نفسه چند

تحریک

قلت مصادر

تظلم تاریخ ————— مادرِ ناهربان

تاریخ و حدیث

تاریخ و مقتل

تاریخ کتب

شهید دین مرتضیٰ

اسلام

تاریخ اسلام

روح اسلام

زقار اسلام

اصطفا، دار لقضاء

۱۱

۱۳

۱۹

۲۳

۳۱

۳۳

۴۲

۵۷

۵۷

۶۴

۷۲

۷۸

۷۹

۸۶	مطلع وفا
۸۹	دوران خون ادر دهنی کیفیات
۹۲	امتیازی وجود
۹۵	مشاورت
۱۰۰	شجره طیبه
۱۰۷	عقد امام البنین
۱۱۵	طلوع قمر
۱۱۸	ادوار حیات
۱۲۱	دور اول — در اشتی صفات
۱۲۳	کمال ایمان
۱۳۱	وفا
۱۳۹	علم و فقه
۱۵۱	طلعت قمر
۱۵۴	عصمت
۱۵۹	سقايت
۱۸۶	شجاعت
۱۹۵	علمداری
۲۱۵	منازل قمر
۲۱۷	منزل اول — دور امیر المومنین
۲۲۴	مشاهدات

۲۲۱	صفین
۲۲۳	وقت آخر امیر المومنین
۲۲۶	منزل دوم — دور امام حسن
۲۴۵	شهادت امام حسن
۲۷۸	ایک المیه
۲۸۰	غسل امام حسن
۲۸۵	منزل سوم — دور امام حسین
۲۹۲	رضعت امام حسین
۲۹۵	منازل راه
۳۰۳	ساحل مقصود
۳۱۲	نصب خيام
۳۱۷	فلسفه جهاد
۳۲۹	سقائی
۳۶۳	فیصله کن لمح
۳۷۶	تجدید عهد
۳۸۱	معرکه کارزار
۳۸۶	کشمکش جذبه و عقل
۳۸۹	گرئی بازار شهادت
	قربان گاه وفا
۴۲۰	شان جهاد

نفسے چندر

۲۲۲	اندازِ رجز
۲۲۶	تاثرات
۲۲۷	امام حسینؑ
۲۲۹	امام زین العابدینؑ
۲۳۱	جناب زینبؑ
۲۳۲	مخدرات
۲۳۳	جناب سکینہ
۲۳۵	راہِ کوثر و شام
۲۳۷	شام
۲۳۹	قافلہ اہل حرم مدینہ میں
۲۴۱	مدفن
۲۴۲	زیارت
۲۴۸	بوئہ قبر
۲۴۹	مرثیے
۲۵۲	مرثیہ ام البنین
۲۵۲	مرثیہ فضل بن حسنؑ
۲۵۴	ازواج و اولاد
۲۶۰	ابوعلیٰ حمزہ
۲۶۳	باب المراد - کرات و اعجاز کرامات

تحریر

شب میں سب سے پہلے حج و زیارت کی سعادت حاصل کر کے دارِ سرزمینِ ممبئی ہوا تھا۔ اور اس وقت فخر الدین بھائی "ممبئی" کی دکان پر بیٹھا تھا کہ اچانک ایک ٹیلیفون آیا۔ "آپ سے ضروری مسائل پر گفتگو کرنا ہے۔" میں نے عرض کی۔ "آجائے۔"

تھوڑی دیر بعد ایک صاحب نازل ہوئے۔ اور یہاں سے شروع ہوئے
 ”میں نے ایک پبلیکیشن قائم کر دیا ہے۔ اس میں جدید اصولوں پر نئے انداز کی کتابیں شائع
 ہوں گی۔ اور آپ کو اس کے ادارہ تحریر کا ایک ممبر نامزد کر لیا گیا ہے۔“
 میں نے کہا۔ قلم چلانا میری زندگی ہے۔ میں اپنی زندگی
 کے کسی لمحہ کو بیکار نہیں کرنا چاہتا۔ تنہائی میں بھی اپنے شعری ذوق کو تسکین

دیتا ہوں۔ اور جب حالات قدرے سازگار بن جاتے ہیں تو قلم اٹھالیتا ہوں۔
 میں نے ۲۲ سال کی زندگی میں کم و بیش ۲۳ کتب و رسائل تالیف و ترجمہ کی منزل سے
 گزرا رہے ہیں۔ میں صاحب زبان و ادب نہیں ہوں کہ مجھے قلم کا یہی میں کوئی وقت
 ہو۔ اور مدعی عصمت بھی نہیں ہوں کہ خطا و اشتباہ سے بالاتر اقدام کر سکوں۔
 میں اپنے علم و معلومات کی روشنی میں کام کرتا ہوں اور جب کوئی مخلص کسی
 غلطی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے تو فوراً اصلاح کر لیتا ہوں۔

میری نظر میں خوف خطا و نسیان سے قلم نہ اٹھانا علم و ہنر کی موت ہے اور خطا و
 نسیان کے بعد اصلاح کی طرف قدم اٹھانا شرافت و عزت کی تباہی۔

میری کتاب میں مختلف ممالک سے شائع ہو رہی ہیں اور اب بھی دوران سفر ایک کتاب
 تالیف کر کے لایا ہوں جو انشاء اللہ بہت جلد منظر عام پر آئے گی۔

میری سب سے زیادہ محبوبی ملک کے حالات اور ارباب ایمان کی قوت خرید کی کمزوری ہے
 چند سو روپے بلا اشاعت پڑے ہوئے ہیں۔ کون رقم فراہم کرے۔

کون اشاعت کرے اور پھر کون فروخت کرے! آخر میں کون خریدے؟
 اگر کوئی صاحب دل تیار ہو جاتا اور کچھ رقم صرف کر سکتا تو یہ بے قیمت ذخیرہ بھی

ضائع نہ ہوتا۔

موصوف نے نہایت ہی اطمینان و سکون کے ساتھ کہا۔
 "اب آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ وقت آگیا ہے کہ آپ کی یہ حسرت بھی نکل جائے گی
 اور یہ کام میرے ہی ذریعہ منزل تکمیل تک پہنچے گا۔ بس آپ کمر ہمت باندھ لیں اور لکھنا
 شروع کر دیں۔"

میں نے کہا کہ ابھی لکھنے کا کیا ذکر ہے! ابھی تو بعض مسودات پہلے ہی سے لکھے ہوئے
 رکھے ہیں اور ان کی اشاعت نہیں ہو سکی ہے۔ پہلے آپ ان کی اشاعت کا قصد کریں۔

پھر اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

انہوں نے فرمایا کہ پہلے آپ میری فرمائش کی کتاب لکھیں۔ اس کے بعد تمام
 کتابیں شائع کی جائیں گی۔

میں نے کہا۔ آپ کی فرمائش کیا ہے؟

فرمایا قمر بنی ہاشم حضرت عباس علیہ السلام کی سوانح حیات۔

میں نے بے ساختہ کہا کہ اس کام کی کیا ضرورت ہے۔ اس موضوع پر میرے برادر
 محترم حضرت نجم الدین مولانا نجم الحسن صاحب قلم کی کتاب "ذکر العباس" موجود
 ہے۔ آپ اس کی اشاعت کر دیں۔ ایک موضوع پر متعدد کتابیں لکھنے سے بہتر مختلف موضوعات
 پر کتابیں شائع کرنا ہے۔

"ذکر العباس" سے زیادہ جامع اور جامع گیر کتاب لکھنا تقریباً ناممکن ہے۔
 برادر محترم نے اس موضوع پر سارا مواد جمع کر دیا ہے۔ اور اس قدر دیدہ ریزی سے کام
 لیا ہے کہ جس روایت یا کتاب میں حضرت عباس کا نام نظر آ گیا اسے بھی درج کتاب
 کر دیا ہے۔

ایسے حالات میں جدید کتاب کا لکھنا۔ اور اس کتاب سے ہٹ کر لکھنا جو نئے
 شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

موصوف نے نہایت خاموشی سے یہ ساری باتیں سنتے رہے اور آخر میں یہ فیصلہ سنایا کہ
 مجھے اس کتاب کا علم ہے۔ لیکن میں آپ سے گزارش کر رہا ہوں۔
 میں نے کتاب لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ کتابوں کی فہرست سنانے کی فرمائش
 نہیں کی۔

میں نے تعلقات و روابط اور جذبات و عواطف کی قدر کرتے ہوئے اس مطالبہ کو
 منظور کر لیا اور کوشش کی کہ "ذکر العباس" کو سامنے رکھنے سے پہلے اپنے غور پر چھان بین

کا جائے۔ شاید کوئی خاص چیز نظر آجائے۔

کتاب کو پیش نظر رکھنے کے بعد تالیف "تقلید" کی حیثیت پیدا کر لیتی ہے اور کتاب سے قطع نظر کر کے تالیف نئے رخ سے نئے انداز اور نئے سلیقہ کی نشاندہی کرتی ہے۔

اس سلسلے میں مجھے کافی زمختیں بھی اٹھانا پڑیں۔ کافی وقت خدا بخش لائبریری میں صرف ہوا۔ کچھ استفادہ فخر الالقیاء مولانا دمی صاحب قبلہ کی لائبریری سے کیا۔ کچھ چیزیں جو ادبیہ کالج سے فراہم کیں۔ اور خدا کا نام لے کر قلم اٹھالیا۔ قلم کا اٹھانا تھا کہ باب الحوائج کے الطان و مرام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور کثرت مشاغل کے باوجود اتنی بڑی کتاب منظر عام پر آگئی۔

میرے رفقاء میرے مشاغل سے باخبر ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ میری زندگی کا کیا انداز ہے۔ وہ مولائے اس کرم کا بہتر انداز کر سکیں گے کہ حضرت باب المراد سے کس طرح سے میری کشتی آرزو کو ساحل مراد تک پہنچا ہے۔

تین ماہ کی یہ مسلسل زحمت آپ کے پیش نظر ہے۔ برادر محترم طالب شاہ کی راہنمائی اپنے مقام پر ہے۔ ان کی کتاب سے کافی مدد ملی ہے۔ یہ ادربات ہے کہ میں نے اپنا انداز فکر و نظر اور طرز نگارش ان سے بالکل الگ رکھا ہے۔ انہوں نے واقعات پر زور دیا ہے اور میں نے استنباط و نتائج پر۔ انہوں نے عنادین قائم کئے ہیں اور میں نے موضوعات۔ انہوں نے حالات کو تسلسل سے لکھا ہے اور میں نے ابواب کے تحت انہیں مرتب کیا ہے۔

ان کے پیش نظر سوانح عمری تھی اور میرے پیش نظر سیرت نگاری۔

خدا انہیں جزائے خیر دے کہ انہوں نے پہلی کادش پیش کی اور اسے اپنے طرز پر ردیف آخر بنا دیا ہے۔ اب اس کے بعد جو قلم بھی اٹھے گا وہ ان کا منوں کرم رہے گا۔

سیرت نگاری

قدیم طرز فکر و انداز نگارش میں سیرت نگاری آغاز حیات سے لے کر وفات تک کے حالات کے مرتب کر دینے کا نام تھا۔

سیرت نگار کا کام انتہائی درجہ تقلیدی ہوا کرتا تھا اور اس کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ جستجو اور تفحص کر کے حالات پیدا کرے اور پھر انہیں زندگی کے سن و سال کے اعتبار سے مرتب کر دے۔

دور حاضر میں یہ انداز فکر بالکل بدل چکا ہے۔ اب سیرت نگاری واقعات کے جمع کر دینے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ واقعات کے تسلسل کا نام ہے۔ ایک سیرت نگار پر فرض ہے کہ وہ واقعات کے تسلسل پر نظر رکھے، ان کی کڑیوں کو تلاش کرے۔ وجہ و اسباب پر غور و فکر کرے اور ان کے درمیان سے ایسے نتائج فراہم کرے جہاں تک عام ذہنوں کی رسائی نہ ہو۔

سیرت کی طرح سیرت نگاری بھی ایک بڑا اہم مرحلہ ہے۔

ایک انسان کی سیرت کی تشکیل میں بے شمار عناصر کا دخل ہوتا ہے۔ اس کے داخلی اور خارجی کیفیات دیکھے جاتے ہیں۔ نسلی اور قومی اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ حالات اور ماحول کے اعتبار سے بدلتی ہوئی قدروں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ انقلابات کے مقابلہ میں طرز عمل کا حساب کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح کے لاتعداد مسائل ہیں جن کے بغیر سیرت کی تشکیل مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

سیرت نگاری کے مرحلہ میں واقعات کی قدر و قیمت بھی الگ الگ ہو جاتی ہے۔

ایک واقعہ انتہائی اختصار کے باوجود عظیم تاریخی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور بلند ترین

نفسیاتی کیفیات کی نشاندہی کرتا ہے اور ایک واقعہ انتہائی طولانی خطبے کے باوجود بنیادوں کے اعتبار سے بے حد کمزور اور غیر مفید ہوتا ہے۔

تاریخ اسلام میں سیرت خذرق، انگلشری عراب کی قدر و قیمت معروف و مشہور ہے عمل لمحات کے لئے تحقیق اثر و معنی قیامت تک کے لئے ہے۔ سیرت کی ان پیچیدگیوں کو نظر میں رکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سیرت نگاری آبائی حالات سے زیادہ ان واقعات پر زور دینے کا مطالبہ کرتی ہے جن کا براہ راست کردار پر اثر پڑتا ہے یا جن کی روشنی میں انسان اپنا طرز عمل مرتب کرتا ہے۔

جناب عباس کی سیرت پر قلم اٹھانا ایک عجیب و غریب محبت کا کام ہے۔ یہ سیرت ایک نابھجنا پیدا کرتا ہے جس میں سفینہ محبت کے ٹوٹ جانے کا قوی امکان رہتا ہے۔

یہ سیرت ————— وہی اور کسی کمالات کے درمیان کی منزل ہے جہاں خطوط طرا اور نقوش منزل کا معین کرنا بے حد مشکل ہے۔

حضرت عباسؓ کے حالات میں ایک طرف الہی عنایات کا پرتو ہے جس نے آپ کو سرحد عصمت سے قریب تر کر دیا ہے ————— اور دوسری طرف گہر و تربیت کا اہتمام جس نے عام انسانوں کی مغفوں سے ملانے کے باوجود ایک مخصوص امتیازی درجہ دے دیا ہے۔

ایسے نازک موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے بڑا حوصلہ درکار ہے ————— ہر قدم پر لغزش فکر و قلم کا اندیشہ ہے اور ہر منزل پر حفظ مراتب کا خیال دین کو مضطرب اور پریشان کئے رہتا ہے۔

مختصر وقت اور غفلت کے باوجود کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب میں سیرت کو سیرت کے عنوان سے پیش کیا جائے۔

واقعات سے استنباط و استنتاج بھی ہر اور جزئی واقعات نظر انداز بھی نہ ہونے پائیں۔

چنانچہ ہر موضوع کو حسب حیثیت اہمیت دی گئی ہے اور غیر ضروری امور کو مرن تبرکاً نقل کیا گیا ہے۔

قلت مصادر

ایسے موضوعات پر قلم اٹھانے کے لئے ایک مزید زحمت یہ ہوتی ہے کہ قدیم ترین مآخذ کی قلت ہے۔ اور ان مآخذ نے ان موضوعات پر کام کرنے کی زحمت نہیں کی۔ ابتدائی کوشش یہی تھی کہ واقعات کو قدیم ترین مآخذ سے جمع کیا جائے۔ لیکن جب ان کا دامن خالی پایا گیا تو دوسروں کے دروازوں پر حاضری دینا پڑی۔

حیرت انگیز بات ہے کہ اتنی بڑی بڑی شخصیتوں کا تذکرہ مرن چند سطر دوں میں کیا جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دنیا میں آنے کے بعد یوں ہی خالی ہاتھ چلے گئے۔ نہ اپنی دنیا کو کچھ دیا۔ اور نہ ان سے کچھ لیا۔

ان کی زندگی کسی ایسے حجرے میں گڑی ہے۔ جہاں تک تاریخی شاعروں کی رسائی ہی نہیں ہوئی یا سرخ کی نگاہ پہنچنے ہی نہیں پائی۔ عام طور سے قدیم مصادر میں حضرت عباسؓ کا ذکر دو موضوعات کے ذیل میں ملتا ہے ————— اولاد امیر المومنین اور شہداء کربلا۔

مومنین کو اس کے علاوہ سیرت طیبہ میں کوئی پہلو ملا ہی نہیں جسے اپنے یہاں جگہ دے سکتے۔ اور سیرت نگاروں کے لئے قدرے سہولت فراہم کر سکتے۔ ہمارا "مذائق تصنیف" اس اس پر مزید ستم ہے۔

ملکی ماحول اور سماجی حالات نے ہمارے ذہنوں کو اختلافات کے سانچے میں اس طرح ڈھال دیا ہے کہ بحث و مباحثہ اور جنگ و جدل سمانا اور صفا بھینونا بن گیا ہے۔ عوام سے لیکر خواص تک جسے دیکھو سب کا انداز نظر اور سب کا طرز نگارش یکساں ہے۔ بیانات میں مناظرہ کی جانی نہ آئے تو ان میں البیان السخیر، "کامعداق نہ بنیں۔ اور تحریر میں غیر کا حوالہ نہ آجائے تو استناد و اعتبار نہ پیدا ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا استناد "الزام" ہی سے پیدا ہوتا ہے اور سارا اعتبار اغیار کے مقدر ہوتا ہے کہ دیا گیا ہے۔

تحقیق کا تعلق انا تو یہی تھا کہ ہر فریق کے روایات کو لیکر ان کو مقررہ معیاروں پر پرکھا جائے اور معتبر روایات پر اعتماد کیا جاتا۔ چاہے وہ کسی فریق سے تعلق رکھتی ہوں۔

اغیار کے روایات میں منہجوں کا مل جانا "الزام" کی منزل میں کام آ سکتا ہے لیکن تحقیق کی منزل میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس کے لئے بہر حال معتبر اور مستند روایات کو تلاش کرنا پڑے گا۔

اس طرز نگاہ نظر کے ذریعہ نقصانات بھی ہوئے ہیں ایک عوامی سطح پر اور ایک خواص کی سطح پر۔

عوامی سطح پر یہ نقصان ہوا ہے کہ عوام مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔ انھیں ہر مسئلہ پر ایک ہی تحقیق درکار ہے کہ یہ روایت غیروں کے یہاں ہے یا نہیں؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نہیں ہے تو معتبر ہی نہیں ہے۔ حالانکہ صحیح دہ داری چہی ہے کہ اپنے یہاں کی روایت کو میزائوں پر تول کر غیروں کے سامنے پیش کیا جاتا اور ان کے ذہنوں سے یہ خیال نکال دیا جاتا کہ تمہاری کتاب میں درج

نہ ہونے کا مطلب "عدم اعتبار" ہے۔

اندراج عدم اندراج مولف و مصنف کے ذوق کا نتیجہ ہے۔ اس میں واقعہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

واقعہ اپنے جملہ خصوصیات کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اب مولف کو یہ اختیار ہے کہ وہ کتنے اجزاء کو قبول کرے اور کن اجزاء کو ترک کر دے۔

خواص کی سطح پر عظیم نقصان یہ ہوا ہے کہ زیادہ حصہ قوت مطالعہ اغیار کے لٹریچر پر صرف ہونے لگی ہے اور اپنا لٹریچر برباد ہو رہا ہے۔ جسے دیکھتے وہ انگریزوں کی تالیف پڑھ رہا ہے۔ جسے دیکھتے وہ مسلم و بخاری کا مطالعہ کر رہا ہے۔ جس پر نظر ڈالنے وہ طبری اور ابن اثیر سے نقوش قدم تلاش کر رہا ہے۔

انہی کتاب پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں اور اپنا لٹریچر کہنے و بوسیدہ ہوتا جا رہا ہے۔

اغیار کے جدید ترین مولفین نے ایک انداز یہ بھی نکالا ہے کہ "ہمیں" اپنے لٹریچر کے مطالعہ میں لگا دیا ہے۔ اور خود ان مباحث کو "اخلاقی" کہہ کر دوسرے موضوعات میں لگ گئے ہیں۔

اس طرح ہمارا وقت تو بہر حال صرف ہوتا ہے اور وہ دوسرے میدانوں میں اپنی کارگزاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

عوامی ذہنوں پر حالات کی اثر اندازی کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ ہمارے مناظراتی ماحول میں جب کسی شخص کے سامنے کوئی روایت نقل کی جاتی ہے اور اس کا کوئی ربط و تعلق مقصود کے فضائل سے ہوتا ہے۔ تو وہ پہلا سوال یہ کرتا ہے۔ "یہ روایت غیروں کی کس کتاب میں ہے؟"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فضائل معصومین غیروں کے اندراج کے محتاج ہیں یا اغیار کے

توک کر دینے سے فضائل کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے یا ہماری ساری ذمہ داری صرف اغیار پر محبت تمام کرتا ہے۔ اپنے جذبہ مودت کی تسکین یا اپنے علم و عرفان کا اعناذ کوئی شے نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اگر ایران و عراق کے ماحول میں روایت کے ساتھ اغیار کا نام لے لیا جائے تو فوراً چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اور بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اپنے کسی عالم و مصنف نے اس واقعے کو نہیں نقل کیا۔ اگر انھوں نے نہیں نقل کیا تو روایت کا کیا اعتبار؟ اغیار کے نقل پر اعتماد کرنا خلاف عقل و انصاف ہے۔

وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے معاشرے نے روز اول سے "بین الاقوامی" ماحول میں زندگی گزار رہی ہے۔ ہمارے سامنے مختلف اقوام، دین اور ان کے نظریات و افکار رہے ہیں یا بھی اختلافات اور معاصرانہ چشمک "انسانی فطرت" کا تقاضا ہے جس کے بعد اس ذہن کا پیدا ہونا کوئی خاص بات نہیں ہے۔

دوسرے ملک کے ارباب ایمان نے اس ماحول سے ہٹ کر زندگی گزار رہی ہے۔ ان کے سامنے ایسے تلخ تجربات "نہیں ہیں۔ وہ" ہوائے اتحاد" کے پروردہ اور "نصائے محبت" کے باشندے ہیں۔ انھیں اپنوں سے محبت ہے غیروں سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہے۔ اب چونکہ مسئلہ حالات کی پیداوار ہے اور ذوق مقامی نفع سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کسی مقام پر یہ بھی ممکن ہے کہ حالات میں تبدیلی آجائے اور ذوق کیسے و گروں ہو جائے۔

تاریخ — ناہربان

ہماری ذاتی خواہش یہی تھی کہ کتاب کے جملہ مطالب تاریخ سے اخذ کئے جائیں اور تاریخ ہی کو اپنا مددک و ماخذ بنایا جائے لیکن حکم

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

منتہا تھا کہ تاریخ "مادر معلومات" ہوا کرتی ہے۔ اس کے دامن میں ماضی کے جملہ حالات پائے جاتے ہیں۔ اس کے حافظ میں ہر حقیقت محفوظ رہتی ہے اور اس کا خزانہ کسی وقت بھی خالی نہیں ہوا کرتا۔ وہ انقلابات زمانہ کے ساتھ حقائق کی پرورش کیا کرتی ہے۔

لیکن دیکھائیے کہ تاریخ ایک "مادر ناہربان" کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ حالات کی پروردہ۔ درباروں کی تنگ خوار۔ بارگاہوں کی حاضر باش۔ اور ارباب قلم کی "منت کش" ہے۔

تاریخ صرف واقعہ نگاری ہوتی تو بھی اس پر اعتماد کرنا مشکل تھا۔ واقعہ
”قلم کار“ کی گردش قلم سے یکسر تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔ اس کی روح دوسرے قالب میں چلی
جاتی ہے اور وہ اپنی واقعت کو کھو بیٹھتا ہے۔

چربائیکہ بقول ابن خلدون تاریخ واقعات کی کڑیوں کے تلاش کرنے کا نام ہے۔ مورخ
کا کام اسباب و علل کی جستجو کرنا ہے۔ اور ان کی روشنی میں واقعات کا مرتب کرنا ہے۔
جس کے بعد یہ امکان قوی اور مستحکم ہو جاتا ہے کہ ہر مورخ اپنے ذوق کے مطابق حالات کو
مرتب کرے اور جس واقعہ کو جہاں مناسب سمجھے۔ جگہ دیدے۔

واقعہ سی بات ہے کہ دنیا کا ہر انقلاب ابتدائی طور پر ”بغادت“ کہا جاتا ہے
بغادت کے بعد مقصد حاصل ہو جائے تو وہی بغادت انقلاب بن جاتی ہے۔ دورہ
بغادت کی بغادت ہی رہ جاتی ہے۔

کامیابی اور ناکامیابی بھی خیالات و رجحانات سے وابستہ ہے۔ انگریز مورخ ”تھوکر
آزادی“ میں حصہ لینے والوں کو ”باغیوں“ کے ذیل میں جگہ دیتا ہے اور ہندوستانی مورخ انھیں
افراد کو ”مجاہدین“ کی صف میں بیٹھاتا ہے
واقعہ ایک۔ حالات ایک۔ افراد ایک۔ لیکن تاریخ میں اتنا

بڑا فرق !

کیا یہ اس بات کا زندہ ثبوت نہیں ہے کہ تاریخ مورخ کے خیالات کی آئینہ دار ہوتی
ہے۔ اور اس کے مندرجات پر آنکھ بند کر کے ایمان لانا ایک نادانی و غفلت کے سوا کچھ
نہیں ہے۔

اسلامی تاریخ کے مورخین نے بھی اسی ذہنیت کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے
جب بھی اپنے مقصد کے خلاف کوئی آواز دیکھی تو آواز اٹھانے والے کو ”باغی“ اور ”شورش
پند“ کا عنوان دیدیا۔

اور جب مقصد کی مخالفت کا سامان دیکھا تو قبل مسلم، زمانے محض جیسے جرائم کے باوجود ”فنا
اعظم“ کے لقب سے نوازا دیا۔

یہ بات نقل قول کے انداز پر ہوتی تو مورخ کی نیت کا اندازہ نہ ہوتا اور اسے ”نیک
دل“ قرار دے دیا جاتا۔ لیکن قیامت یہ ہے کہ یہ مورخین کے استنباطات میں
انھوں نے ہی ابواب قائم کئے ہیں۔ انھوں نے ہی ہر شخص کو الگ صف میں جگہ دی ہے۔ اور
ہر ایک کی جدا گانہ منزل معین کی ہے۔

تاریخی حقائق

دور حاضر میں حریت، مساوات، جمہوریت، ضمیر جیسے بے شمار لائینی الفاظ کی طرح
ایک لفظ ”تاریخی حقائق“ بھی ہے۔

اس لفظ کا استعمال صبح و شام عمل میں آتا رہتا ہے لیکن چند ہی ایسے افراد ہوں گے جو
اس کے معنی سے باخبر اور اسکے نتیجہ کی طرف متوجہ ہوں۔

عالم یہ ہے کہ کوئی بھی واقعہ تاریخ کی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا اور وہ ”تاریخی حقیقت“
بن گیا۔ کوئی کلمہ مورخ کی زبان قلم سے نکلا۔ اور اسے ”تاریخی حقائق“ کا درجہ
حاصل ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی حقائق کا ثبات ارض و سما میں وجود کے پابند نہیں ہیں
بلکہ ان کا تعلق صرف مورخ کے ذہن و قلم سے ہے۔ مورخ کہہ دے تو حقیقت در نہ بے
ارزش۔

یہ رجحان اس حد تک آگے بڑھا کہ مسلمان ذہن کا طرز فکر ہی بدل گیا۔ کتب احادیث
میں کوئی روایت دیکھی تو یہ کہہ کر ہال دیا کہ یہ تو ”روایت“ ہے۔ اور تاریخ کی کتاب میں
وہی روایت دیکھی تو اسے ”تاریخی حقیقت“ سمجھ لیا۔

معیار صرف یہ ہے کہ کتاب کا "عنوان" بدلنے سے واقعات کی نوعیت بدل جایا کرتی ہے۔ احادیث کی کتاب میں منقول واقعہ روایت ہوتا ہے۔ اور تاریخ کی کتاب میں مندرجہ روایت واقعہ بن جاتی ہے۔

اس "تغافل شعار" دور میں صحیح حقائق سے روشناس کرنا اور ان کی بنیادوں کو یاد کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ اس کا اندازہ صاحبانِ فکر ہی کر سکتا ہے۔

اساس تغافل

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ذہن کہاں سے پیدا ہوا اور اس قدر "روایت بیزاری اور تاریخ پسندی" کا جذبہ کہاں سے آیا؟

حقیقت یہ ہے انسان اپنی شخصیت کو بیدار پسند کرتا ہے۔ اپنے علوم و انکار پر نازاں رہتا ہے اور اپنے معلومات ہی کو کمالِ علم کا معیار سمجھتا ہے۔ سائنس داں کو سارا شرف سائنس میں نظر آتا ہے۔ اور طبیب کو سارا کمال طب میں۔

محدث کا کمال حدیث میں پوشیدہ ہوتا ہے اور مورخ کا کمال تاریخ میں۔

ان اختلافات کا سبب "افتادِ طبع" کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہر انسان ایک فطری ذوق رکھتا ہے۔ اور اسی ذوق کے نتیجہ میں قدم آگے بڑھتا ہے۔ جس کا ذوق تاریخ و جغرافیہ سے مانوس ہوتا ہے وہ اس راستہ پر چل کھڑا ہوتا ہے اور جس کا ذوق دینی ہوتا ہے وہ فقہ و اصول کی راہوں پر گامزن ہو جاتا ہے۔

ذوق کا یہ اختلاف نہ ہوتا تو مختلف علوم کے ماہرین کہاں سے عالم وجود میں آتے؟

اس حد تک اختلافِ ذوق مناسب اور قابلِ تحسین ہے۔ نظامِ کائنات کے لئے اختلافِ ذوق ضروری ہے۔

لیکن اس کا ذہنی ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ ہر علم کا طالب علم دوسرے علم کو لغو و جہل اور اس کے حاصل کرنے والے کو بے وزن و بے مصرف تصور کرنے لگتا ہے۔ مورخ محدث کو لغو سمجھتا ہے اور محدث سائنسدان کو۔

اس اختلاف سے تعصب کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں اور علوم کی "سرد جنگ" شروع ہو جاتی ہے۔

ہر صاحبِ علم دوسرے صاحبِ علم کے ذہن کو تباہ کرنے کی فکر کرتا ہے اور صاحبِ فن دوسرے فنکار کو جہل سمجھتا ہے۔

نتیجہ کچھ بھی ہوں۔ اس حقیقت سے بہر حال انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس طرح نہ متعلق بن سکتے ہیں اور نہ بدل سکتے ہیں۔

تاریخ پر ایمان کا بنیادی سبب یہ ہے کہ دورِ حاضر کے مردِ جہل نظامِ تعلیم میں ہر علم کو ایک مرتبہ حاصل ہے۔ ادا سے ایک ضرورت قرار دیا گیا ہے لیکن علوم دین و مذہب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

نصابِ تعلیم سے اخلاق، مذہب، دین و کردار سب کو خارج کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے ماہرِ فن بھی "گھبرے ہوئے ماحول" کا پروردہ نہ ہو تو انتہائی غیر مجذب ہوتا ہے اور اس کا اخلاق و کردار سے کوئی ربط نہیں ہوتا۔

تاریخ کا مزید امتیاز یہ ہے کہ اس کا تعلق ہر علم و فن سے ہے۔ اور جدید طریقہ تعلیم میں ہر علم کے مسائل کے ساتھ اس کی تاریخ بھی پڑھائی جاتی ہے۔ گویا طالبِ علم پر ایک لاشعوری اثر یہ ہوتا ہے کہ علمِ تاریخ تمام علوم و فنون کی بنیاد ہے اور تاریخ کے بغیر علم کے راستہ پر قدم رکھنا اندھیرے میں راستہ طے کرنے کے مترادف ہے۔ اس لاشعور کا اثر آئندہ زندگی پر پڑتا ہے اور تاریخ کی اصالت ہر ذہن کو اپنے سانچہ میں ڈھال لیتی ہے۔ اب تاریخی بیان ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اور باقی بیانات کچھ

نہیں ہوتے۔

علوم دین و مذہب کی "حرماں نصیبی" کا یہ عالم ہے کہ انھیں مدارس میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ نصاب تعلیم میں ان کی کوئی منزل ہی نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا قابل انسان بھی ان کے مقابلہ میں "جابل مطلق" ہوتا ہے۔ اور جہالت زعم علم سے مکر اگر ایک نئی شورش وجود میں لے آتی ہے۔

تاریخ کی عظمت کا دھندلور اٹھایا جاتا ہے اور مسائل دین و مذہب کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اس طرح اپنا علم کام بھی آجاتا ہے اور اپنی جہالت کی پردہ پوشی بھی ہوجاتی ہے۔

تاریخی حقائق کا پردہ پگندہ کسی تاریخ کی عزت و وقار کے تحت نہیں ہے بلکہ صرف اپنے علمی وقار کے تحفظ کے ذیل میں ہے۔

"حیرت ان ارباب علم پر ہے جو دونوں قسم کے قدیم و جدید علوم سے باخبر ہیں اور اس کے باوجود روایات و احادیث کے مقابلہ میں تاریخ کے بیانات کو اہمیت دیتے ہیں۔"

تاریخی استیاز

علوم شریعت کے مقابلہ میں تاریخ کا ایک امتیازیہ بھی ہے کہ شریعت کے علوم و فنون کا تعلق ایک محدود دنیا سے ہے۔ اس سے انسان کے عقائد ہی جذبات و میلانات وابستہ ہوتے ہیں اور تعصب و تنگ نظری کے امکانات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ تاریخ کے مسائل اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اس سے عام طور پر جذبات و احساسات کا رابطہ نہیں ہوتا اور یہ کہنے کا امکان رہتا ہے کہ مورخ نے غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔

تاریخی مسائل میں "مشرقیین" کی ساری اہمیت یہی ہے کہ انھیں مسلمانوں کے معالفا

میں "غیر جانبدار" فرض کیا گیا ہے اور اس طرح ان کے بیانات کو "وحی منزل" کا درجہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ نگاہ غائر سے دیکھا جائے تو نہ تاریخ کے موضوعات غیر جانبداری کے موضوعات میں اور نہ مورخ ان مسائل میں غیر جانبدار ہو سکتا ہے۔

تاریخی مسائل کی دو قسمیں ہیں۔ بعض مسائل کا تعلق عمومی زندگی سے ہے جس میں عقیدہ و عقیدت کا کوئی دخل نہیں ہے اور فنی و اثباتی مورخ کی نظر میں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اور بعض کا تعلق مذہبی و مذہباتی دنیا سے ہے کہ اس میں دنیا کا کوئی بھی انسان غیر جانبدار نہیں رہ سکتا جیسے صدر اول کی تاریخ کہ اس میں مورخ اپنے خیالات کو مخصوص رجحانات سے الگ نہیں رکھ سکتا۔

مورخ کا یہ کہہ دینا آسان ہے کہ میں نے غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ اور مسائل کو صحیح صورت میں درج کیا ہے۔ لیکن حقیقی اعتبار سے ایسا عمل ممکن نہیں ہے۔

مذہبی جذبات داخل سے تعلق رکھتے ہیں اور تاریخی بیانات خارج سے۔ داخلی کیفیات خارجی بیانات پر بہر حال اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ لیکن خارجی واقعات داخلی کیفیات کی تشکیل نہیں کر سکتے۔

دنیا کے کسی بڑے سے بڑے غیر متعصب اور غیر جانبدار کی تاریخ لے لیجئے۔ صرف ایک نظریہ معلوم ہو جائے گا کہ مورخ کا مذہب و عقیدہ کیا ہے اور اس نے کس نظریہ کے تحت کتاب کو مرتب کیا ہے۔

معمولی بات یہ ہے کہ بعض مورخین رسول اکرمؐ کا ذکر کرتے ہوئے "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھتے ہیں اور بعض "صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم"۔

یہ فقرات تاریخی واقعات نہیں ہیں کہ ان میں تحریف و ترمیم یا کثرت بیعت کی جستجو کی جائے

اور یہ طے کیا جائے کہ اصل واقعہ کیا ہے اور مصنف نے کس طرح درج کیا ہے۔
 — یہ صرف ایک احترام ہے لیکن اس کے باوجود نظریات درجانات کی غامضی ضرور کر رہا ہے۔
 — اور تاریخی آسانی محسوس کر سکتا ہے کہ مورخ کا عقیدہ و نظریہ کیا ہے؟
 یہی حال ابواب و فصول کا ہے کہ مورخ افراد کی جگہ خود معین کرتا ہے اور یہ تعین اس کے خیالات کی نشان دہی کرتا ہے۔

اہم تاریخی شخصیتوں کو حکمرانوں کے باغیوں میں شمار کر دیا جائے تو مورخ کا ایک عقیدہ ہے اور انہیں "مجاہد اور انقلابی" کا درجہ دے دیا جائے تو مورخ دوسرے عقیدے کا ہے۔

یہ باتیں واقعات و حقائق سے اجنبی ہیں لیکن نظریات کے استنباط میں مکمل مدد کر رہی ہیں۔

بات صرف یہ ہے کہ مسلم مورخ غیر جانبدار بن سکتا ہے لیکن غیر جانبدار ہو نہیں سکتا۔ حالات و واقعات تاریخی ہونے کے علاوہ عقائدی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اور عقائد انسان کی فکر و نظر کو پابند اور مقید بنا لیا کرتے ہیں۔

تاریخی حقائق

کا پر و پیگندہ کرنے والوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ بیانات بیان کی حد تک کیسے ہی کیوں نہ ہوں ایک مولف کے مذاق و تالیف کے پابند ضرور ہیں۔ اور مذاق و تالیف واقعہ کو حقیقت کا درجہ نہیں دے سکتا۔

تاریخ میں درج شدہ واقعات کو تاریخی اندراج کے اعتبار سے "حقائق" کہا جاسکتا ہے لیکن مولف کے اعتبار سے اس کے خیالات سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

تاریخ و حدیث

"تاریخ کے مندرجات کو حقیقت کا درجہ دے کر روایات و احادیث کا مذاق اڑانے والوں کو ان امتیازات پر کبھی نظر کرنا چاہیے جن سے تاریخ و حدیث کا فرق واضح ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے مقابلہ میں تاریخ کی اہمیت کیا ہے؟
 حدیث و تاریخ کا ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حدیث کے موضوعات دین و مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تاریخ کے موضوعات عام ہوتے ہیں۔

دین و مذہب کے مسائل میں تعصب اور تنگ نظری کا امکان ضرور رہتا ہے لیکن شدت احتیاط کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

ہر انسان دینی مسائل میں دنیا کے اعتبار سے کہیں زیادہ محتاط ہوتا ہے اور یہ لحاظ رکھتا ہے کہ دنیاوی واقعات کے بیان کرنے میں اشتباہ ہو تو ہر لیکن مذہب میں اشتباہ نہ ہونے پائے۔

تاریخی واقعات اس احتیاط سے بے نیاز ہیں۔ وہاں مورخ اہتمام کو کر سکتا ہے لیکن احتیاط کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

بہی وجہ ہے کہ حدیث کے مضامین "عیون الفاظ" کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں۔ اور تاریخ کے واقعات سب "بالمعنی" نقل ہوتے ہیں۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ "عیون الفاظ" کے ساتھ نقل ہونے والے مضامین "بالمعنی" نقل ہونے والے واقعات سے کہیں زیادہ محفوظ ہوں گے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ محدث روایت کے بیان میں ان اشخاص پر کبھی نظر رکھتا ہے جی سے اس واقعہ کو نقل کیا اور ان کی وثاقت و اعتبار کے بغیر نقل کرتے ہوئے اپنے کو شری

جرم سمجھتا ہے۔

مورخ کے یہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا کام زیادہ سے زیادہ واقعات کا فراہم کر دینا ہے۔ چاہے ان کی کوئی بنیاد نہ ہو اور وہ صرف خیالات کا درجہ رکھتے ہوں۔

محدث دومورخ کی ذمہ داریوں نے دونوں کے میدان الگ الگ کر دیئے ہیں
محدث کی ذمہ داری واقعات کی صحت کا اہتمام کرنا ہے اور مورخ کی ذمہ داری واقعات کی کثرت کا فراہم کرنا۔

محدث اپنے حوالے کو بیان کر دیتا ہے تاکہ دوسرا آدمی صحت و مقیم قوت و ضعف کا خود فیصلہ کرے اور مورخ فیصلہ کرنے کے بعد واقعہ کو بیان کرتا ہے۔

جس کے بعد تاریخی حقیقت ایک انسان کے نظریہ سے زیادہ کوئی شے نہیں رہ جاتی ہے۔

متم باؤں تم یہ ہے کہ مسلسل راپروہوں کے ساتھ نقل ہوتے والی حدیث میں "علم رجال" کے ذریعہ بیانات کی چھان بین کے وسائل جھیا کئے گئے ہیں اور تاریخی بیانات کے لئے ایسا کوئی معیار نہیں ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مورخ کے بیانات "وحی الہی" ہیں۔ _____ ان کی تحقیق و تفتیش ایک مذہبی جرم ہے۔ اور ان پر تنقید و تبصروں کا عذاب آخرت کا باعث ہے دنیا کا قاعدہ ہے کہ عدالت میں بیان کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کرنے کے لئے پہلے بیان کرنے والے کی حیثیت پر نظر کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کے بیان کی نوعیت پر توجہ دی جاتی ہے۔

علوم شریعت میں علم رجال اسی ضرورت کے تحت مرتب کیا گیا ہے کہ روایت سے پہلے راوی کی حیثیت دیکھ لی جائے اور فیصلہ انتہائی احتیاط کے ساتھ کیا جائے۔

- تاریخ اس امتیاز سے سراسر محروم ہے۔ وہاں راوی کے حالات پر دو راویین رتبہ ہیں۔

تنقید و تبصروں اور چھان بین کا سوال ہی نہیں ہے۔

حدیث کے مقابلہ میں تاریخ کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ مورخ نہ ان واقعات کا خود شاہد ہوتا ہے جنہیں اس نے بیان کیا ہے اور نہ اس کے رواۃ کا۔ سلسلہ آخری منزل تک پہنچتا ہے۔

تاریخ میں "ما قبل تاریخ" واقعات کا اندراج اظہر من الشمس ہے اور وہ اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ مورخ کے پاس واقعات کا مشاہدہ یا ان کا تسلسل محفوظ نہیں ہے۔

حدیث کی دنیا اس سے کہیں زیادہ مستحکم ہے۔ اس میں اصل راوی واقعہ کا مشاہد ہوتا ہے اور بعد کے رواۃ اس راوی سے بالمشاہدہ نقل کرتے ہیں۔

مشاہدہ کا سلسلہ ٹوٹ جائے تو روایت بے اعتبار ہو جائے اور اس کا بصر م کھو جائے۔

تاریخ کے مقابلہ میں حدیث و روایت کے امتیازات پر نظر رکھنے والے مورخ کے بیانات کو "تاریخی حقائق" کہہ کر قطعیات کا درجہ نہیں دے سکتے۔

تاریخ و مقتل

دو حاضری مفروضات میں ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ تاریخ کا اعتبار مقتل سے زیادہ ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے مندرجات کو "حقائق" کہہ کر پیش کیا جاتا ہے اور مقاتل کے مندرجات کو روایت۔ ان مندرجات کے منفع کے لئے یہی جملہ کافی ہے ہے کہ "مقاتل کا بیان ہے"

ضرورت ہے کہ تہبیدی طور پر تاریخ اور مقتل کے فرق کو بھی پہچان لیا جائے

تاکہ آئندہ دونوں کے امتیازات سمجھنے اور فیصلہ کرنے میں کوئی زحمت نہ ہو۔

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ تاریخ اور مقتل دو الگ حقیقتیں اور دو جدا گانہ انداز تحریر ہیں۔ تاریخ کے مندرجات کا انداز کچھ اور ہوتا ہے اور مقتل کا انداز کچھ

اور

بعض لوگ تو یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ مقتل روایات کا مجموعہ ہوتا ہے اور تاریخ حقائق کا اور ضمناً حقیقت دروایت کا فرق بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

حالانکہ غور و فکر کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اور مقتل تاریخ کے ایک جز کا نام ہے۔

تاریخ کے دامن میں ہر خشک و تر اور ہر امر دین و دنیا کا انبار لگا رہتا ہے۔ علماء اسلام نے واقعات کو بلا کی مستقل اہمیت کے پیش نظر اس حصہ کو تاریخ سے الگ کر کے از سر نو مرتب کر دیا ہے اور اسے "مقتل" کا نام دے دیا ہے۔ ورنہ یہ براہ راست تاریخ کا ایک جز تھا جسے کسی طرح بھی اس سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر مقتل میں مورخین کے غلط بیانات اور ان کے مذموم روایات کا اندراج بھی ہو گیا ہے۔

مقتل کوئی نیا انداز تالیف ہوتا تو اس میں جملہ عقائد و رجحانات مذہب پیش نظر رکھے جاتے اور ایسے روایات کے اندراج سے پرہیز کیا جاتا جن میں دشمن مورخ کی وسیہ کاری نے قلم تحریف چلا دیا ہو۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ علماء اسلام نے تاریخ سے مورخ کے بیانات کو نکال کر اور مستقل طور پر محفوظ کر دیا ہے اور ضمناً وہ تمام اغلاط بھی مقتل میں چلے آئے ہیں جن کا صرف تاریخ میں رہنا مناسب تھا۔

اس کا واضح ثبوت حضرت شیخ مفید کا ارشاد ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "ارشاد"

میں واقعات کو بلا کو درج کرتے ہوئے ابتداء ہی میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ ان بیانات کا تعلق تمام تر ارباب تاریخ و سیر سے ہے۔ میں نے صرف اس مقام پر نقل کر دیا ہے۔ ایسے حالات میں تاریخی اغلاط کا منتقل ہو جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے!۔ تاریخ کے مقابلہ میں مقتل کو ضعیف کہنا یا سمجھنا "ضعف عقل" یا "ضعف لہجہ" کی علامت ہے۔

مقتل تاریخ پر ایک امتیاز رکھتا ہے۔ کہ تاریخ کے مرتب کرنے والے عموماً جاندار یا متعصب قسم کے لوگ رہے ہیں جن کا انداز نگارش خود آواز دیتا ہے کہ انھیں کہ بلا کے واقعات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اسے صرف "ضرورت الیفا" کی بنا پر نقل کر رہے ہیں۔

اس کے برخلاف مقتل کے تالیف کرنے والے عموماً اصل واقعہ کے غلط رہے ہیں اور اسی اخلاص کی بناء پر "قلم تاریخ" کی روشنی میں قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس کرتے رہے ہیں۔

اس سے بالاتر ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ کسی واقعہ کا نقل کرنا اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک انسان واقعہ کی روح سے باقاعدہ آشنا نہ ہو اور اس کے متعلقات کو بہت قریب سے محسوس نہ کر چکا ہو۔

میرزا پیش آنے والا واقعہ ہر راہرہ کی زبان پر رہتا ہے۔ لیکن صحیح وصف دہی بیان ہوتا ہے جو واقعہ کو "قریب سے" محسوس کرنے والا انسان بیان کرتا ہے۔ واقعہ کو بلا کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

مورخین نے اس کے ساتھ عظیم نا انسانی برقی ہے اور واقعات کو صرف واقعات کے انداز سے نقل کر دیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے درج کر بلا کو محسوس ہی نہیں کیا اور طریق کی صحیح

واقعہ کربلا کے سلسلہ میں مورخین کے بیانات ایک ”روزنامہ“ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

مورخ کی ذمہ داری اس سے زیادہ ہے اور دوسرے موضوعات میں مورخین نے اس کا لحاظ بھی رکھا ہے۔ صرف کربلا کے معاملہ میں یہ حقیقت نظر انداز ہو گئی ہے اور اس ذمہ داری کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

روح کو بلا کے احساس و عدم احساس کا یوں فرق یہ ہے کہ تاریخ کے دامن میں واقعات کی "تڑپ" کا نشان نہیں ہے۔ مودعہ نے ایک غیر جانبدار انسان کی طرح بے تعلقی کے ساتھ واقعات کو بیان کر دیا ہے اور بس۔

مقتل نہ ہوتا تو بے شمار جذبات و احساسات گھٹ کر رہ جاتے، اور لاتعداد چھوٹے چھوٹے واقعات تاریخ کی غفلت شعاری کی نذر نہ ہر جاتے۔

کی یہ کمزوری ضرور ہے کہ اس میں جذبات کی ترجمانی کے عنوان سے اکثر مقامات پر ”ذبا“
حال ”کا ذکر کبھی آگیا ہے۔ اور اس طرح کتاب واقعات سے ہٹ کر مؤلف کے خیالات
کی سرحد تک پہنچ گئی ہے۔

لیکن یہ بات انادیت کی منزل میں معیوب نہیں ہے۔ حالات اپنے پورے خصوصیات کے ساتھ بیان کر دیئے جاتے ہیں تو زبان حال سے اتفاق یا اختلاف کا فیصلہ بھی آسان ہو جاتا ہے اور حالات ہی میں اختصار ہو جاتا ہے تو صورت واقعہ کے سمجھنے میں بھی بے حد دشواریاں پیش آتی ہیں۔

کالا ایک نمایاں فرق یہ کبھی ہے کہ تاریخ نے ہمیشہ درباروں اور میدانوں پر زور دیا ہے اور اپنے واقعات انھیں منزلوں سے فراہم کئے ہیں، مقابل کا ایسا کوئی التزام نہیں رہا ہے۔

اس فرق کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مورخین نے اپنی کتابوں کو سلاطین وقت کی فرمائش یا ان کی خوشامد میں مرتب کیا ہے اور ایسی کتابوں میں ان کے کارنامے اور ان کے دشمنوں کے عیوب کا ذکر ہونا بلکہ اسی کا موضوع بنانا ناگزیر ہوتا ہے۔

مقتل کا مزاج اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ مذہبی جذبات اور دینی احساسات کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس میں نہ درباردارسی ہوتی ہے اور نہ بارگاہِ یرستی کو مل جاتی ہے اور ماؤں کے دلوں میں ٹڑپتے ہوئے جذبات کبھی

وہ میدان کے مجاہدات بھی نقل کرتا ہے۔ اور قیدی خانوں کا اندازِ عبادت و ریاضت بھی۔
مقتل کو مقتول کہہ کر نظر انداز کر دینا "مقتل" "قاتل" ہے اور نتیجہ میں خود واقعہ کا قاتل عام۔

ایک اہم سوال

اس مقام پر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جب مقابل کی ترتیب و تدوین میں تاریخ ہی کا سہارا لیا گیا ہے۔ تو اس کے دامن میں مندرجات کے ماسوا مطالب کہاں سے آگئے۔ اور صاحبِ مقتل کا منفرد مدرک کیا ہے۔
اس سوال کا جواب دینے کے لئے خود تاریخ کے مدرک پر غور کرنا پڑے گا اور یہ دیکھنا پڑے گا کہ مورخ کے پاس اس کی "دستاویز" کی سند کیا ہے؟
عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مورخ کے معلومات کسی آسمانی وحی والہام کا نتیجہ ہوتے ہیں اور وہ یکشم خود مشاہدہ کر کے یا "الہامی" انداز سے واقعات کو فراہم کرتا ہے۔ اور اسی لئے اس کی وثاقت و اعتبار پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ اکثر آیاتِ قرآنی کی تاویل تاریخ ہی کی بنیاد پر کر دی جاتی ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔

مورخ اپنے معلومات دوسرے افراد کے بیانات ہی سے فراہم کرتا ہے اور یہ بیانات کبھی تحریری شکل میں مورخ تک پہنچتے ہیں اور کبھی زبانی سننے میں آتے ہیں۔ مقتل کا انداز کبھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ صاحبِ مقتل اپنے معلومات کو دوسروں کے بیانات ہی سے فراہم کرتا ہے۔
کبھی تاریخ کی تحریروں کا سہارا لیتا ہے اور کبھی ان علومِ سنیہ پر اعتماد کرتا ہے

جو ظلم تاریخ کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور جنہیں مورخ نے اپنی تالیف میں جگہ نہیں دی ہے۔

"علمِ سنیہ" کوئی مضر یا معمولی شے نہیں ہے۔ خود کیا جائے تو تاریخ بھی علمِ سنیہ ہی کی نمونہ کرم ہے اور اس کے بیانات بھی اسی طرح جمع کئے گئے ہیں۔ یہ ادوات ہے کہ دامن تاریخ میں آنے کے بعد غیر جانبدار اور "حقائق" کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔

والشہد طالبِ حقائق کا فرض ہے کہ مندرجات کتاب اور علمِ سنیہ دونوں پر وقتِ نظر کے ساتھ غور کرے اور یہ دیکھے کہ صورتِ حال کے پیشِ نظر کون سی بات ترین قیاس ہے اور کون سی بات خلافِ عقل؟

مجھے یاد آتا ہے کہ میرے ایک استاد نے نجف اشرف میں طالبِ علم اور عالم کے علوم کا فرق واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ۔

"طالبِ علم کتاب پر اعتماد کرتا ہے اور عالم تحقیق و تمحیص پر۔"

طالبِ علم سے اہم سے اہم مطلب بیان کر دیجئے۔ اسے اعتبار نہ ہو گا لیکن اگر اسی مطلب کا کسی معمولی کتاب سے حوالہ دے دیجئے تو فوراً باد کر لے گا چاہے مصنف انتہائی معمولی درجہ کا انسان رہا ہو۔

عالم کا یہ انداز نہیں ہوتا۔ وہ تحریری اور تقریری دونوں قسم کے مطالب کو "میزانِ عقل و تحقیق" پر تولتا ہے اور اس کے بغیر قبول نہیں کرتا۔

دورِ حاضر کا عمومی ذہن اس بات کی زندہ دلیل ہے کہ کسی معمولی سے معمولی کتاب کا حوالہ دے کر روایت بیان کر دیجئے تو بات صحیح اور قابلِ اعتماد ہے اور اہم سے اہم مدرک سے نقل کیجئے۔ صرف کتاب کا ذکر نہ ہو تو بات ناقابلِ اعتماد ہے

اسی طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ تاریخ کے پرستار "مقاتل" پر الزام لگادیتے ہیں کہ اس کے اکثر دیشتر مطالب علم سینہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور "علم سینہ" معتبر نہیں ہوتا ہے۔

حالانکہ سنجیدگی کا تقاضا یہ ہے کہ علم سینہ ————— واقعا علم سینہ ہو تو مندرجات کتاب سے کہیں زیادہ وقعت رکھتا ہے۔ مندرجات کتاب دوسروں کو پیش نظر رکھ کر لکھے جاتے ہیں۔ ان میں رعایت، مردت، دیا کاری اور ونا داری کے جذبات شامل ہو جاتے ہیں۔

سینہ میں وہی مطالب محفوظ کئے جاتے ہیں جن سے انسان کو داخلی سہر دی اور دلچسپی ہوتی ہے۔

ان کے اعتبار اور عدم اعتبار کا بہترین پیمانہ خود صاحب علم ہے ————— وہ قابل اعتبار ہے تو اس کا بیان معتبر ہے اور وہ ناقابل اعتبار ہے تو قطعاً غیر معتبر۔

تاریخ کو یہ شرف بھی نصیب نہیں ہے کہ اس کے مندرجات کے بارے میں "صاحب بیان" ہی کے اعتبار سے قیصلہ کر دیا جائے اور یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ زادی کس پایہ کا ہے اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟

حق نمک

تاریخ کی کمزوری کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ یہ فن خود ہی حکومت کی نگرانی میں وجود میں آیا ہے اور اس پر روز اول سے اقتدار کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ روز اول اس کی ترتیب و تدوین کا کام اقتدار کے زیر نگران انجام پایا ہے۔ اور خلیفہ دوم کے احکام کے تحت اس کی تدوین ہوئی ہے۔

حد یہ ہے کہ تاریخ کی ابتداء طے کرنے میں بھی انھیں کی رائے شامل رہی ہے۔ اور انھیں کے مشورہ کی بنا پر ہجری سنہ کے اعتبار سے واقعات مرتب کئے گئے ہیں یہ بات حیرت انگیز ضرور ہے کہ اسلامی تاریخ کا سنہ ہجرت سے کون مقرر ہوا ہے۔

عیسائیوں نے اپنی تاریخ کا سن اپنے پیغمبر کی ولادت سے شروع کیا ہے ————— دیگر اقوام نے بھی اسی نکتہ کا تحفظ کیا ہے ————— یہ صرف مسلمانوں کو کیا ہو گیا تھا کہ انھوں نے ولادت اور وفات دونوں کو چھوڑ کر درمیان سے تاریخ شروع کر دی۔

تقاضائے الفان تو یہی تھا کہ ولادت مسل اعظم سے ابتدا کی جاتی اور ہجرت سے پہلے کے اہم واقعات کو بھی جزا تاریخ بنایا جاتا۔ ————— اور اگر یہ ممکن نہیں تھا تو وفات سے سلسلہ شروع ہوتا کہ تاریخی مطالب کو کیسوی حاصل ہوتی۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور ہجرت کو بنیاد تاریخ قرار دے دیا گیا۔

ایسے حالات میں یہ کہنا قطعاً صحیح ہو جاتا ہے کہ تاریخ کی تدوین کا عمل انجام دینے والی حکومت نے اپنے حالات کا جائزہ لیا اور یہ دیکھا کہ ہماری تاریخ میں نہ ولادت نہ وفات سے کوئی کارنامہ وابستہ ہے اور نہ وفات سے۔

ہمارا اسارا کارنامہ ہجرت سے وابستہ ہے ————— اس لئے مناسب یہی ہے کہ سن تاریخ کو ہجرت سے شروع کیا جائے تاکہ ابتدائے تاریخ ہی میں اپنا تذکرہ آجائے اور آغاز سن کے بیان ہی سے اپنا ذکر وابستہ ہو جائے۔

ایسا نہ ہوتا تو مسلمان قدیم طرز فکر سے قطعاً الگ نہ ہوتے۔ ————— اور دیگر اقوام کی تقلید ہی کو اپنی فلاح و نجات کی ضمانت سمجھتے۔

اس تحقیق سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ تاریخ کی بنیادوں پر حکومت واقفدار

کا پہرہ ہے اور اس کی نشوونما دولت و سلطنت کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ ایسے حالات میں اس سے سنجیدگی فکر یا سلامت بیان کی توقع رکھنا قطعاً اشتباہ ہے۔

تاریخ کا سارا استناد و اعتماد یہ ہے کہ وہ غیر دل کے گھڑی ہے اور انھیں کی آغوش ترتیب میں پر دان چڑھی ہے۔ اب اگر اس کے دامن میں کوئی مفید مقصد ہے۔
یا خلاف مفاد دولت مضمون مل جاتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حقیقت اس قدر واضح اور روشن تھی کہ مورخ نہ اس پر پردہ ڈال سکا اور نہ تاویل و توجیہ کی ضرورت محسوس ہو سکی۔

تاریخ — ایسے ہی مقامات پر کار آمد مفید ہو سکتی ہے۔ ورنہ عقائد کی منزل میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ تاریخ سے عقائد کا فیصلہ کرنا ایک گھٹ جہالت اور مستند روایات کے مقابلہ میں تاریخ کا حوالہ دینا "غیر پرستی" ہے جو خالص مذہبی جذبہ کے قطعاً منافی ہے۔

کتبِ تاریخ

فنِ تاریخ اور مورخین کی اجمالی کمزوریوں کا جائزہ لینے کے بعد ایک نظر کتبِ تاریخ پر بھی ڈالنا ضروری ہے۔

تاریخ نویسی کا سلسلہ باقاعدہ طور پر تیسری صدی ہجری کے ادائل سے شروع ہوا ہے اور آج تک برابر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ مختلف ادوار و حالات میں مختلف کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔

ضرورت ہے کہ ان کتابوں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے ان کے مصنفین کے دور حیات کی تعیین کر لی جائے تاکہ تاریخ کی قدامت و اقربیت الی الحقائق کا صحیح فیصلہ کیا جاسکے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ "واقعاتی اعتبار" سے جو کتاب زیادہ قدیم ہوگی اس کے مندرجات زیادہ معتبر ہوں گے۔ درمیان میں راویوں کا سلسلہ بھی کم ہوگا اور حالات کو غلط بیانی پر مجبور کرنے کا موقع بھی کم ملا ہوگا۔
علمائے اسلام کے نقل کے مطابق کتبِ تاریخ کے تالیف کا زمانہ مورخین کی تاریخ وفات کے اعتبار سے حسب ذیل قرار پاتا ہے۔

سیرت ابن ہشام	عبد الملک بن ہشام	۲۱۳ھ
طبقات	محمد بن سعد البصری	۲۲۰ھ
الامم و الایات	عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ	۲۶۰ھ
الاخبار المطول	احمد بن داؤد	۲۸۲ھ
طبری	محمد بن جریر طبری	۳۰۰ھ
مروج الذهب	مسعودی	۳۴۶ھ
کامل	ابن الاثیر غزالدین علی بن محمد الجزری	۶۳۰ھ
نحری	فخرالدین محمد بن علی بن طباطبا	۷۰۹ھ
المختصر فی اخبار البشر	ابو الفدا اسمعیل بن علی	۷۳۲ھ
البدایہ و النہایہ	اسمعیل بن عمر بن کثیر	۷۷۴ھ
تاریخ ابن خلدون	عبد الرحمن بن محمد بن خلدون	۸۰۸ھ
روضۃ الصفا	محمد بن خاندن	۹۰۳ھ
تاریخ الخلفاء	جلال الدین سیوطی	۹۱۱ھ
تاریخ الخمیس	حسین بن محمد الدیار بکری	۹۶۶ھ
السیرۃ النبویہ	احمد بن زینی بن احمد حلال	۱۳۰۴ھ

اس تفصیل سے معائنہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ قدیم مہبوط تاریخوں میں سب سے پہلا درجہ تاریخ طبری کا ہے جس کے مولف نے تیسری صدی کے خاتمہ کے ساتھ اپنی زندگی ختم کی ہے اور اسی صدی کے کسی حصہ میں یہ تاریخ مرتب کی ہے۔

اس سے پہلے کسی تفصیلی تاریخ کا وجود نہیں ملتا۔ "سیرت ابن ہشام" سیرت کی کتاب تھی اس میں تاریخ کے تمام موضوعات کا ذکر نہ تھا اور الامستہ ایسا ستہ ایک مخصوص موضوع کے تحت مرتب کی گئی تھی۔

اور الاخبار الطوال تاریخ ضرور تھی لیکن اس میں نہایت درجہ اجمال سے کام

لیا گیا کرتا۔

طبری نے ان تمام کتابوں سے الگ تفصیلی رخ اختیار کیا اور اسی امتیاز کی بنا پر ایک عظیم شہرت و عظمت کا مالک ہو گیا۔

اس شہرت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعد میں آنے والے مولفین نے اپنے کو اس کا شرمندہ احسان محسوس کیا۔ اور اس کے مندرجات کو "حقائق" کا درجہ دینا شروع کر دیا۔

ابن اثیر کی کامل تین صدی بعد مرتب ہوئی لیکن اس کے سامنے بھی مفصل تاریخ کا کوئی مدرک طبری کے سوا نہ تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے بھی طبری کے چپائے ہوئے لقمے نگھٹنا شروع کر دیا اور اس طرح اپنی انفرادیت خاک میں ملا دی۔

تاریخی دنیا میں طبری کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے کہ اس نے سب سے پہلے اس بسط و تفصیل کے ساتھ واقعات جمع کئے اور اپنی ریاضت و محنت سے ایک عظیم ذخیرہ جمیا کر دیا۔

ظاہر ہے کہ طبری کا مدرک سابق کی کتب تاریخ نہیں ہو سکتی تھیں ان کتابوں

میں اس تفصیل کے ساتھ واقعات کا اندراج ہی نہیں ہوا تھا۔ طبری نے اپنے ذاتی وسائل سے کام لیا اور اتنی طویل کتاب تیار کر لی۔

طبری کے بیانات پر مفصل تبصرہ کا امکان نہیں ہے۔ اجمالی طور پر اتنا کافی ہے کہ طبری نے حضور سرور کائنات کی وفات سے لے کر "خلافت راشدہ" کے خاتمہ تک ایک ہزار بارہ روایتیں درج کی ہیں۔ جن میں ۵۵۴ روایات سری کے ہیں۔ ۶۶ روایات سیف بن عمر کے اور ۵۲ روایات عمر بن ثبیبہ کے۔

اور حسن اتفاق یہ ہے کہ یہ تینوں ہی غیر ثقہ افراد ہیں۔ سیف بن عمر تو باجماع اہل رجا ضعیف و ناقابل اعتماد ہے۔

عبداللہ ابن سبا کا افسانہ اسی کا ایجاد کردہ ہے اور اس "چندی"۔ "مجبہول" کا سراغ اسی نے لگایا ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جس کتاب کے اعتبار کا یہ عالم ہے اس پر اعتماد کرنے والی کتابوں کا کیا عالم ہو گا۔

اس پر متنازعہ یہ ہے کہ سری نے بھی اپنی روایتیں طبری سے بیان نہیں کیں بلکہ انھیں لکھ کر بھیجا ہے۔ جس میں ہزار قسم کے شبہات کا اور بھی امکان ہے اور کتاب کی رہی ہوئی وقعت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

طبری کی عظمت کا دھندہ دراپٹنے والے ایک نظر اس حقیقت پر بھی ڈالیں اور پھر دیکھیں کہ طبری یا اس کے نقش قدم پر چلنے والے مورخین کی کتابوں کی قدر و قیمت کیا ہے؟

اس کے بعد یہ بھی ملاحظہ کریں کہ طبری بھی ایک عقیدہ اور ایک نظریہ کا انسان تھا۔ اس کا بھی "اخلاقی" فرائض تھا کہ اپنے نظریہ کی تردید و تبلیغ کا ہر امکان کو شش کرے چاہے اس طرح حقائق کی پامالی ہی کیوں نہ ہو جائے۔

طبری نے اپنے اس فریضہ کو ادا بھی کیا۔ اور ایک طرف عبداللہ بن سبا کا افسانہ ایجاد کر کے حکام جور کے مظالم پر وہ پوشی کا مکمل انتظام کیا اور حکومت سے اخلاف رکھنے والے افراد کو ایک ہنگام پر کارشابت کر کے ان کے اقدامات کی متانت و تجدیدگی کو خاک میں ملا کر ایک مستقل فتنہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔

اور دوسری طرف واقعات میں "حسین" ترمیم کر کے لفظوں کے الٹ پیسرے حقیقتوں کے چہرے کو مسخ کر دیا۔

مثال کے طور پر واقعہ یہ ہے کہ مرگ معاویہ کے بعد امام حسینؑ کو مدینہ کے حاکم نے یزید کے حکم کے مطابق مطالبہ بیعت کے لئے دربار میں طلب کیا اور آپ نے خیر مرگ معاویہ میں کرا اسلامی رسوم کے تحت اناللہ وانا الیہ راجعون کہہ دیا۔ طبری نے موقع غنیمت جانا اور اسی مقام پر امام کی زبان اقدس سے کلمہ "ترجم" بھی نقل کر دیا۔

گویا آپ نے معاویہ کے لئے دعائے رحمت بھی کی ہے۔ اور امام "مستجاب الدعوات" کی دعا کے بعد بخشش کے نہ ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

دوسرے مقام پر خود امام حسینؑ کے بارے میں ابن سعد کے کلمات میں ترمیم کر دی۔ ابن سعد نے آخری گفتگو کے بعد ابن زیاد کو اطلاع دی کہ حسینؑ بیعت نہیں کریں گے۔ ان کے پہلو میں ان کے باپ کا دل ہے۔ "نفس ابیہ"۔

طبری نے نہایت ہی ہوشیاری سے "ابیہ" پر دو لفظوں کا اضافہ کر دیا اور "نفساً ابیہ" غیرت دار نفس بنادیا جب کہ ابن سعد کے الفاظ بڑے دودررکس نتائج کے حامل تھے۔ اور ان سے صرف دو نچے جبراً نکلا کہ امام حسینؑ کے بیعت

نہ کرنے کا سبب ان کے پہلو میں ان کے باپ کا دل ہے جو کبھی شیطانت باطل کے سامنے نہیں جھکا۔ اور یہ دلیل ہے کہ حسینؑ اور ان کے بزرگوں میں کمی ایک نے بھی باطل کی بیعت نہیں کی۔

طبری کا تعصب، اس کی تنگ نظری۔ اس کے راز یوں کا ضعف اور ان کی بے اعتباری کے علاوہ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ طبری نے پورا واقعہ کر بلا تمام مقتدر متعلقات کے ساتھ صرف ۶ صفحات میں بیان کیا ہے اور سارے اہم تفصیلات کو نظر انداز کیا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک ایسا واقعہ جس کی جڑیں کوسوں دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور جس میں راہ حق میں کم سے کم ۷۰ افراد نے جانیں قربان کی ہیں اور مختلف مصائب آلام کا سامنا کیا ہے۔ اسے صرف اتنے صفحات میں بیان کیا جائے تو کیا نا انصافی کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟

ایسے حالات میں تو ناممکن ہے کہ کر بلا کی تاریخ کو طبری جیسے مورخین کے بیانات سے مرتب کیا جاسکے جس میں مورخ خیانت شعار ہے اور تاریخ مجموعہ توہمات بھی۔ ضرورت تھی کہ ایک ایسی صنف تالیف بھی ہو جس میں سینہ بہ سینہ آنے والے معلوما و لفظوں کو کبھی ایک درجہ حاصل ہو اور انھیں کی روشنی میں واقعات کو صحیح انداز سے مرتب کیا جائے اصطلاحی اعتبار سے مقتل ایسی ہی کتاب کا نام ہے جو ان موضوعات پر عظیم ذخیرہ جمیا کرتی ہے۔

مقاتل

ان دیانت دار مؤلفین کے مجموعات ہیں جنہیں واقعہ کر بلا سے کم از کم اس قدر دلچسپی رہی ہے کہ انھوں نے واقعہ کے تفصیلات پر توجہ دی ہے اور اسے بڑی صحت

مرتب کر دیا ہے۔

مقاتل کے مولفین بھی معصوم نہیں تھے۔ ان سے بھی غلطی کا امکان تھا اور غلطیاں ہوئی ہیں۔ جس کا ایک سبب یہی تھا کہ ان کے سامنے تاریخ کے علاوہ کوئی اہم مدرک نہ تھا اور تاریخ اغلاط کا مجموعہ تھی۔ اس پر دشمنی اہل بیت کی جو چاپ لگی ہوئی تھی۔

حیرت کی بات ہے کہ طبری جیسا مورخ واقعہ کربلا کے ساتھ اس قدر نا انصافی کیوں کرتا ہے کہ اکثر مقامات پر ایسے اقوال نقل کر دیتا ہے جس کے بعد واقعہ کی عظمت کے ماننے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی ہے۔

اسی مورخ نے واقعہ کربلا کا سفر کے جینے میں ہونا درج کیا ہے۔ (طبری ۲

ص ۲۸۶)

اسی مورخ نے "نفس ابیہ کو نفساً ابیہ بنا دیا ہے۔"

اسی مورخ نے زحر بن قیس کی روایت درج کی ہے کہ شہداء کربلا میں انتفاست استقلال کا وجود نہ تھا اور وہ ہمارے زعب و داب سے پناہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ (معاذ اللہ) طبری ۶ ص ۲۶۳۔

الاجبار الطوال

بھی طبری سے کچھ کم نہیں ہے۔ اس نے بھی "طوال" نام رکھ کر اس قدر اختصار سے کام لیا ہے کہ جسے واقعہ کربلا کوئی اہم واقعہ ہی نہیں ہے اور بہتر ہے جالوز کی قربانی کوئی عظمت ہی نہیں رکھتی۔

زحر بن قیس کا بیان طبری سے پہلے اسی نے نقل کیا ہے ص ۲۵۷۔
کربلا میں حمید بن مسلم کے وجود کو اسی نے شکوک بنایا ہے۔

اور اس قسم کے نہ جانے کتنے مزعومات و مفروضات ہیں۔ جو ان مورخین کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور آج کے ارباب نظر انہیں "ٹھوس تاریخی حقائق" کا درجہ دیکر ان پر تحقیق کی عمارتیں کھڑی کر رہے ہیں۔

مورخین

سے زیادہ قابل افسوس مولفین ہیں۔ جو کہ آنکھ بند کر کے انکی تقلید کر رہے ہیں اور ان کے اغلاط پر پوری توجہ نہیں دیتے۔

طبری وغیرہ اہلبیت کے اغیار تھے، حمید بن مسلم لشکرِ زید کار پور ٹر تھا۔ لیکن آپ تو ایسے نہیں ہیں آپ کی مکمل ذمہ داری یہی ہے کہ ان کی غلط بیانیوں کی کڑی نگرانی کریں اور ان کے فریب میں نہ آنے پائیں۔

اس سلسلے میں بعض معاصر مولفین کی روش بھی تعجب خیز ہے کہ وہ طبری کے تحریف کو جاننے کے باوجود نفس ابیہ کے بجائے نفساً ابیہ ہی نقل کرتے ہیں۔ اور دشمن تاریخ کے بیانات کو "مخلص ارباب مقاتل" کے بیان پر ترجیح دیتے ہیں۔

بعض مولفین نے تو یہاں تک قیامت کی ہے کہ پہلے حمید بن مسلم کے بیانات سے استنباط کر کے یہ ظاہر کرنا چاہا کہ واقعات کربلا کا واقعی اور واحد مورخ و ناقل یہی شخص ہے۔ اور اس کے بعد زعم تحقیق میں آکر "بیک جنبش قلم" یہ اظہار کر دیا کہ حمید بن مسلم واقعہ کربلا میں موجود ہی نہ تھا۔

گویا اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ کربلا کا کوئی واقعہ معتبر نہیں ہے۔ اپنے رداء کو بولنے کی مجال نہیں تھی۔ دشمن رپورٹر دشمن تھا۔ اور وہ بھی موجود نہ تھا اب واقعہ کے اعتبار کی کیا جہت باقی رہ جاتی ہے۔

یہ عذر ایسا نکل آیا کہ اس کے بعد ہر جزئی واقعہ پر "اجتہاد" کے امکانات وسیع ہو گئے اور یہ کہنے کی گنجائش نکل آئی کہ روایت حمید بن مسلم کی ہے۔ اور حمید بن مسلم کو بلا میں موجود نہ تھا۔

جہاں تک حمید بن مسلم کی شخصیت کا تعلق ہے۔ اس کا شکوک ہونا یقینی ہے۔
_____ صاحب لسان المیزان نے اسے ثقہ ضرور قرار دیا ہے لیکن ان کا خود بھی کیا اعتبار ہے

ان کے یہاں وثاقت کا معیار نہیں ہے جسے وہ معیار وثاقت سمجھتے ہیں۔ ایک لسان المیزان ہی کا ذکر نہیں ہے۔ علمائے اہل سنت میں اکثر ارباب رجال ایسے ملیں گے جن کے یہاں اعتبار عدم اعتبار کا تعلق راوی کے کردار سے نہیں بلکہ اس کے مذہب سے ہے ذہبی اس سلسلے کی نمایاں شخصیت ہے جسے ہر راوی کی زندگی پر تشیع کی پرچھائیں نظر آتی ہے اور تشیع عدم اعتبار کے لئے واحد سند ہے۔

وہ گیا اس کا کہ بلا میں وجود _____ تو اس کا تذکرہ قدیم ترین مورخین کے علاوہ بعض ارباب مقاتل نے بھی کیا ہے اور ایک انسان کے واقعہ میں موجود ہونے کیلئے اس سے زیادہ ثبوت ضروری نہیں ہے۔

بعض معاصرین کو الاخبار الطوال کے اس فقرہ سے دھوکہ ہوا ہے کہ کہ بلا سے دلیلی کے بعد کوفہ میں حمید بن مسلم نے ابن سعد سے ملاقات کی اور اس سے پوچھا کہ کہ بلا سے آپ کی دلیلی کیسی ہوئی؟

اور اس نے کہا کہ جس طرح کوئی انسان کسی بدترین مرحلہ سے داپس آتا ہے؟

خیال یہ کیا گیا کہ یہ سوال اس شخص کو زیب نہیں دیتا جو خود واقعہ میں موجود رہا ہو۔ یہ سوال اسی شخص کا ہو سکتا ہے جس نے واقعہ میں شرکت نہ کی ہر ارباب حالات دریافت کرنا چاہتا ہو۔

حالانکہ یہ بات سراسر اشتباہ ہے۔ ایسے سوالات دوہم سفر بھی ایک دوسرے سے کر سکتے ہیں۔ اہل زبان برابر ایسے محاورات استعمال کرتے رہتے ہیں۔

بحیثیت راوی و مورخ کے یہ سوال عجیب ضرور ہے لیکن اس کا حل بھی انھیں کتابوں میں مذکور ہے کہ شہادت امام حسین کے بعد جب غوثی سر امام کو لے کر کوفہ جانے لگا تو حمید بن مسلم اسی کے ہمراہ کوفہ چلا گیا۔ طبری، کامل، ارشاد مفید۔

شائد اس کے سفر کی بنیاد یہ رہی ہو کہ کہ بلا کے واقعہ ختم ہو چکے ہیں۔ اور کوفہ کی تاریخ کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ بحیثیت رپورٹر میسر فرمیں ہے کہ میں وہاں کے واقعات بھی محفوظ کر دوں۔ اور یہ دیکھتا ہوں کہ واقعات کے نقل میں خولی کوئی غلط بیانی یا خیانت تو نہیں کر رہا ہے۔

ابن سعد سے سوال اسی ذمہ داری کی بنا پر تھا جو ایک رپورٹر پر وارد ہوتی ہے یا ایک مورخ از خود اپنے ذمہ لیتا ہے۔

حمید یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میرے کہ بلا سے داپس آنے کے بعد کیا واقعات پیش آئے اور غارت گری خیام سے لے کر اسیری تک اہل حرم حسین کے ساتھ فوجوں کا بڑاؤ کیا رہا۔ _____ اور وہ خود کن کیفیات سے دوچار رہا ہے۔

مورخ کتنا ہی دشمن اور بد نفس ہو _____ اس کے بیانات سے اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ واقعات کے تفصیلات سامنے آجاتے ہیں

اب یہ صاحب فکر و نظر مولف کی ذمہ داری ہے کہ ان واقعات میں سے مورخ کے مزاج و مقصد کا اندازہ کر کے مشکوک مواد کو الگ کر دے اور مفید و قابل اعتماد مواد کو اخذ

کرے۔

مقاتل کے بعد کتب مجالس کی باری آتی ہے۔

کتب مجالس

ان کتابوں کے مولفین و مصنفین زیادہ حصہ بلکہ تقریباً تمام مترجمان آل محمد اور پرستان حنیفیت تھے۔

اور ان پر یہ الزام بہت آسان ہے کہ انھوں نے جانبداری سے کام لیا ہے اور فضائل و مصائب میں ضرورت سے زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ جیسا کہ علمائے ایران کے بارے میں یہ فقرات عرصہ دراز سے سننے میں آ رہے ہیں کہ واقعہ کر بلا ذاتی طور پر نہایت ہی مختصر واقعہ تھا۔ اس کی کل مدت ایک دن سے زیادہ نہ تھی لیکن اہل ایران کی رنگ آمیزی نے اسے ایک مبسوط شکل دید کا ہے اور وہ ایک مکمل داستان بن گیا ہے۔

یہ بات کسی حد تک سنجیدہ اور معقول کہی جاتی ہے۔ اگر اس کا قائل کوئی غیر مسلم یا دشمن آل محمد ہوتا۔

لیکن انھوں نے یہ فقرات بھی انھیں مسلمانوں کے ہیں جنہیں محبت اہل بیت کا دعویٰ ہے۔ اور وہ ”اپنی جانب میں“ اس انداز سے رسالت کی اجرت ادا کر رہے ہیں۔

اضافہ و تحریف کا سوال دہاں اٹھایا جاتا ہے۔ جہاں ایک فریق موافق اور ایک مخالف ہو۔ فریقین کے ہم خیال ہونے کے بعد اس قسم کے سوالات عجیب و غریب راز ہائے درد و پردہ کی غمازی کرتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں کے دلوں میں قاتلان حسین کی طرف سے

ہمدردی کے جذبات پوشیدہ ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ مصائب اپنی تفصیلی شکل میں سامنے آئیں یا ان کی طرف نظر میں اٹھنے پائیں۔ درنہ ایسے سوالات کا کوئی محل نہیں ہوتا۔ اور ہر شخص کا یہ جذبہ ہوتا ہے کہ واقعہ صرف واقعہ کی شکل میں نہیں بلکہ اپنے پورے جذبات و احساسات کے ساتھ منظر عام پر آئے۔

ان کتابوں کی تفصیل کا سبب یہ ہے کہ ان میں واقعہ صرف واقعہ کی حیثیت سے پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے متعلقات پر بھی نظر رکھی گئی ہے اور ان احساسات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے جن کے زیر اثر یہ واقعہ پیش آیا ہے۔

مورخ واقعہ کو بلا کہ ”حسین دیزید“ سے آگے بڑھ کر دیکھنا یا سوچنا نہیں چاہتا۔ اصحاب کتب واقعہ کی مزید کڑیاں تلاش کرتے ہیں اور نتیجہ میں دہاں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں تک اسام غزالی اپنے فتویٰ سے پہنچنا چاہتے تھے۔

کسی واقعہ پر تبصرہ و تنقید کے ذیل میں وہ جذبات بھی آجاتے ہیں جن کی ترجمانی مورخ کی ذمہ داری نہیں۔ بلکہ غلصہ ارباب قلم کی ذمہ داری ہے۔ مورخ کا فرض ہے کہ وہ ان مفتولین کے حالات اور ان کی ہمتوں کا جائزہ لے کر مجاہد کے سن و سال سے موازنہ کرے اور پھر یہ دیکھے کہ اس کار نمایاں کے لئے کتنا بڑا حوصلہ درکار ہے۔ اور اس حوصلہ کی بنیادیں کیا ہیں۔ اس میں کس کی تعلیم شامل ہے اور کس کی تربیت نے اثر کیا ہے۔ اس کے لئے کیا اہتمام ضروری تھا اور کیا انتظام کیا گیا۔ ہے۔

مثال کے طور پر مورخ کو بلا کے ذیل میں حضرت عباس کی وفاداری اور فداکاری کا ذکر کرتا ہے۔ اور غلصہ صاحب قلم اس کی بنیادوں کو تلاش کرتے ہوئے مدینہ تک پہنچ جاتا ہے اور اس منظر کو دیکھتا ہے جہاں مولائے کائنات اپنے بھائی عقیل سے

گفتگو کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں۔ بھیا۔ کسی ایسی خاتون کا پتہ بتائیے جس سے عقد کرنے کے بعد مجاہد اور بہادر فرزند پیدا ہو۔

تصنیف و تالیف کا یہ عنوان سلسلہ بہ سلسلہ ہے۔ پہلے مورخ چند واقعات خشک انداز سے نقل کرتا ہے۔

اس کے بعد ارباب مقابل ان کے قدرے تفصیلات بیان کرتے ہوئے ان کی بعض بنیادوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد اصحاب مجالس، اسرار شہادت کی جستجو میں پائے بہت کو آگے بڑھاتے ہیں اور کہہ بلا کو اس کے تمام جذبات و احساسات کے ساتھ قسطاً پر پیش کر دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ان کتابوں میں تخیلات و تصورات کی آمیزش بھی ان میں واقعات خشک انداز سے پیش کئے گئے ہیں۔ بلکہ ان کے مضمرات پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ یہ بیانات غیر معتبر

اور یہ کتابیں بالکل بیکار ہیں۔

دنیا کا کوئی واقعہ جذبات و احساسات سے الگ ہو کر پیش نہیں آیا۔ کہ بلا کے مرد اور کہ بلا کی خواتین اس کائنات سے الگ کوئی مخلوق نہیں تھیں۔ ان کے دلوں میں وہی احساسات تھے جو ایک انسان کے دل میں ہوتے ہیں۔ وہ وہی سوچتے تھے جو ایک انسان سوچ سکتا ہے۔

یہ ادربات ہے کہ جذبہ قربانی نے انھیں اپنے جذبات پر پابندی لگانے کا حکم دیدیا تھا اور وہ سلسل اپنا خونِ حسرت پی رہے تھے۔

ارباب مجالس کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک انسان کی حیثیت سے ان جذبات کا سراغ لگایا۔ اور صفحہ کاغذ پر احساسات کی تصویر کھینچ دی۔ خیام حسینی کے حالات۔ خواتین کے جذبات۔ ماؤں کی آرزو۔ اذواجِ محترمیں۔

بہنوں کی تمنائیں۔ بچوں کے حوصلے۔ جوانوں کے دلوں۔ مجاہدین کی ہمتیں۔ اور محذرات کی عظمتیں۔ مورخ کے بیان کرنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ اور نہ اس سے ان امور کی توقع ہی کی جاسکتی ہے۔

یہ ارباب مجالس کا فیض ہے کہ انھوں نے صفاء نفس اور پاکیزگی فکر کا سہارا لے کر واقعات کو ذہنوں سے قریب کر دیا ہے اور اب ہمارا فرض ہے کہ حالات و ماحول کے پیش نظر ان جذبات و احساسات کا تجزیہ کریں اور جو چیزیں قابل قبول ہوں انھیں قبول کریں اور جو باتیں قرین عقل نہ ہوں انھیں رد کر دیں۔

تصویر کشی ان کا فرض تھا۔ رد و قبول ہمارا کام ہے۔ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اب ہماری منزل امتحان ہے۔ دیکھیں ہم کس حد تک عہدہ برآمد ہوتے ہیں۔

خلاصہ کلام

ان سارے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ اپنے مولفین کی غفلت شکاری اور عصبیت طرازی کی بنا پر عظیم شخصیتوں کے بارے میں کافی دوانی موار فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے اکثر بیانات ناقابل اعتماد۔ اور بے شمار مندرجات غیر مکمل اور غیر مستند ہیں۔

قمر بنی ہاشم کے سوانح حیات مرتب کرنے میں بھی مصنف "تاریخی" بیانات پر اعتماد کیا جاتا تو دو چار صفحات سے آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ جو تاریخ پورے کہلا کے حادثہ عظمیٰ کو ۶۰ صفحات میں جگہ دے وہ ایک ایک شہید کے بارے میں کیا نقل کرے گی پھر کجا کوشش ہی کی گئی ہے کہ ارباب مقابل سے وہی بیانات اخذ کئے جائیں جن کی کسی نہ کسی جہت سے تاریخ سے بھی تائید فراہم ہو سکے۔

اربابِ مقال نے خود بھی بڑی حد تک اختصار سے کام لیا ہے۔ جس کا بنیادی سبب قدیم زمانہ کا کوتاہی اور ان کی اختصار پسندی ہی ہے۔

اربابِ کتب مجالس نے کسی حد تک تفصیل سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کے بیانات بھی درجہ کم ہیں۔ اچھا لڑی زیادہ۔ میں نے بعد میں نقل دیا ہے کہ اس روایت یا فقرہ لاسند بنا اس سے مناقب و فضائل کا استنباط کیا جاسکے۔

تمام کوشش یہی کی گئی ہے کہ حتی الامکان مستند بیانات اور معصوم ارشادات پر اعتماد کیا جائے۔ اور واقعات کے نقل میں اس حد تک احتیاط کی جائے کہ کوئی واقعہ "مسلم" تاریخی بیان "یا" عقیدہ "سے متصادم و متعارض نہ ہونے پائے۔

اس کے بعد عصمتِ اربابِ عصمت کا حصہ ہے۔

اہل فکر سے یہ التماس ضروری ہے کہ مجھے میری غلطیوں پر متنبہ فرماتے رہیں تاکہ آئندہ اشاعتوں میں اس کا لحاظ رکھا جائے اور غلطی کی تکرار نہ ہونے پائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شہیدِ دین مرفضی

اسلام

خالق کائنات نے انسانی زندگی کے لئے جو وسیع اور ہمہ گیر قانون بنایا ہے اس کا نام ہے اسلام۔

اسلام اپنے اندر فرد و جماعت، سماج و معاشرہ، ظاہر و باطن، عقل و نفس جیسے تمام عناصر و جود کے بارے میں مکمل مضابطہ حیات رکھتا ہے۔ اس کے دامن میں آغاز حیات سے لے کر آخری لمحات تک کے لئے اصول و تعلیمات کا ذخیرہ موجود ہے اور اس نے زندگی کے کسی شعبے یا حیات کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔

دینِ اسلام کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس نے دین و مذہب کی تاریخ میں ایک نیا موڑ دیا ہے اور دین و دیانت پر رسی قہ کرنے والوں کو ایک نیا راستہ دکھایا ہے

مذہب کی تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اسلام کے علاوہ دنیا کے تمام مذاہب دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ بعض مذاہب تجرّد پر زور دیتے ہیں اور بعض مادیت

پر۔

بعض کا خیال ہے انسانی ارتقاء مادیت سے علیحدگی اور تجرّد پسندی میں پوشیدہ ہے۔ انسان کو مادی زندگی سے ہر امکانی دوری اختیار کرنا چاہیے۔ وہ جیسے جیسے مادی علّاق سے دور تر ہوتا جائے گا اس کا مذہبی وقار بڑھتا جائے گا۔ بعض مذاہب کا کہنا ہے کہ تجرّد اور علیحدگی پسندی زندگی سے "فرار" کا دوسرا نام ہے۔ زندہ فرد یا زندہ جماعت وہی ہے جو مسائل حیات سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی ہو اور زندگی کے طوفانوں کو پیچھے ڈھکیں آگے بڑھنے کی ہمت رکھتی ہو۔ وہ مرد کوئی مرد نہیں ہے جو حالات سے گھبرا جائے اور وہ بہادر کوئی بہادر نہیں ہے جو پہاڑوں کی گھاٹیوں میں پناہ تلاش کرے۔ انسان اسی دنیا کے لئے پیدا ہوا ہے اور اسے یہیں زندگی گزارنا ہے۔

اس کا فرض ہے کہ ہر مرد و گرم سے ٹکرانے کی ہمت پیدا کرے اور طوفانوں اور سیلابوں کی زد پر آگے بڑھتا چلا جائے۔ پہاڑوں کے غار یا غار لقاہوں کے گوشوں میں پناہ لینا مرد میدان کا کام نہیں ہے۔

اسلام نے دونوں طریقہ ہائے فکر سے ہٹ کر نیا راستہ نکالا ہے اور اس کی نظر میں زندہ تجرّد اور علیحدگی پسندی محبوب ہے اور یہ خالص مادیت۔ وہ پہاڑوں کے غار میں زندگی گزارنے کو بھی برا سمجھتا ہے اور پیدا کرنے والے سے بے نیاز ہو کر زندہ رہنے کو بھی۔

اس کا مدعا یہ ہے کہ انسان جہد حیات کی ہمت بھی رکھے اور زندگی سے لڑنے کا حوصلہ

بھی رکھے۔

میدان عمل میں قوت ادا دی کو تیز تر بنانے کے لئے عبادت اور بندگی کا سہارا بھی لے اور بندگی کی راہ میں قدم آگے بڑھانے کے لئے وسائل حیات پر بھی عبور پیدا کرے۔ زندگی اور بندگی کے اسی حسین امتزاج کا نام ہے اسلام۔

اسلام سے پہلے یا اسلام کے آنے کے بعد مذاہب دنیا کی تاریخ میں ایسا کوئی رجحان نہیں پیدا ہوا۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام اپنے اعمال و قوانین میں ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ اور اس کے درجہ کمال تک کسی قانون یا نظام کی رسائی نہیں ہے۔

اسلام کی انفرادیت کا اہم سبب یہ سمجھا ہے کہ اس کا تعلق انسانی دنیا یا اس کے کسی دور سے نہیں ہے۔ وہ اپنی ساخت پر داخست میں کسی انسانی فکر کا منون کرم نہیں ہے اس کے قوانین مالک کائنات کے بنائے ہوئے اور اس کے اصول و قواعد رب العالمین کے ترتیب دیئے ہوئے ہیں۔

وہ آسمانی مذاہب میں بھی یہ امتیاز رکھتا ہے کہ اس کا تعلق کسی ایک دور یا ایک دور کے افراد سے نہیں ہے۔ وہ دائمی اور ابدی مذہب ہے اور اس کا تعلق تاریخ بشریت کے ہر دور سے ہے۔ اس نے عظیم ترین روحانیت کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور بڑھتی ہوئی ملویت کا بھی حل پیش کیا ہے۔

اسلام کی جامعیت اور ہمہ گیری ہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کا ہر مذہب اہل مذہب کی امداد کا محتاج ہو گیا۔ اور اہل مذہب نے اپنی عقل کے مطابق مذہب کے قوانین کو اضافہ و ترمیم کا کام انجام دیا۔ لیکن اسلام نے اس کام کو بالکل جامد بنا دیا۔

اس نے تشریح و تعبیر کی منزل میں پوری فروغ دی کا منظر ہو گیا ہے اور باب اجتہاد کو ہمیشہ پیش کے لئے کھلا رکھا ہے۔

لیکن اصول و قوانین کی منزل میں کوئی رعایت نہیں کی اور ہر شخص سے اس اختیار کو سلب کر لیا ہے۔

اس کا دعویٰ ہے کہ ہمارے قوانین میں کوئی نقص نہیں ہے جسے عقل بشیر مکمل کر سکے اور اس کو پورا کرنے کے لئے دوسروں کا سہارا لینا پڑے۔

اسلام کے "محدس" مذہب ہونے کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ دنیا کا ہر مذہب اپنے لانے والے، بنانے والے یا ماننے والے افراد کا تابع ہو گیا ہے اور اس کا نام انھیں کے ناموں پر پڑ گیا ہے۔

لیکن اسلام کے ساتھ ایسا کوئی حادثہ نہیں پیش آیا۔ وہ اپنی عظمت و برتری کو آج بھی بچائے ہوئے ہے اور اپنی انفرادیت کا ڈھکا بجا رہا ہے۔

یہ غلط فہمی یا تجاہل ہے کہ اسلامی قانون کو "محدس" سے تعبیر کیا جائے یا مسلمان کو "محدس" کہہ کر یاد کیا جائے۔ اس کے پیچھے یہ تصور کارفرما ہے کہ اسلام بھی دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں کوئی انفرادیت نہیں رکھتا۔ یہ دیا ہی ایک مذہب ہے جیسے کہ دوسرے مذاہب پائے جا رہے ہیں۔

جبکہ ایسا قطعاً نہیں ہے۔ دوسرے مذاہب افراد کی طرف انتساب برداشت کر سکتے ہیں لیکن اسلام اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا۔

اسلام کی نازک منزلگی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے نمائندہ خاص و مرسل اعظم کو بھی اسی صف میں گھرا کر ناچا رہا ہے۔

جہاں اللہ کے دوسرے بندے اقرارِ عہدیت کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ پیغمبر اکرم کو بھی اسی طرح مسلم کہتا ہے جس طرح دوسرے اللہ والے مسلم کہے جاتے ہیں۔

یہ قانون "محدس" قانون ہوتا تو اس پر عمل درآمد کرنا سارے سماج کی ذمہ داری

ہوتی۔ اور خود پیغمبر اس ذمہ داری سے مستثنیٰ ہوتے۔

مرسل اعظم کا عام انسانوں سے زیادہ پابندی کرنا اور قدرت کا پیغمبر پر مزید فرائض کا عائد کر دینا اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ اس قانون میں کسی بندے کا دخل نہیں ہے۔ یہ مباحث الہی قانون ہے جسے قدرت نے اپنے رحم و کرم سے مرتب کیا ہے اور اسے "محدس" لا کہہنا یا اس کے پرستاروں کو "محدس" کے نام سے تعبیر کرنا ایک کھلی ہوئی جہالت ہے۔

یہ اور بات ہے کہ نسبت کے لئے مکمل ارتباط ضروری نہیں ہے اور اس اعتبار سے مسلمان کو "محدس" یا اسلامی قانون کو "محدس" لا بھی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ کہنے والوں کا یہ مقصد قطعاً نہیں ہے ان کے سامنے ان کی اپنی تاریخ ہے اور انھوں نے اسلام کو اسی پر قیاس کیا ہے۔

مجازی استعمال کا دوسرا نمونہ "مذہب جعفری" ہے۔ ظاہر ہے مذہب جعفری کوئی الگ مذہب یا جدا گانہ دین نہیں ہے۔ یہ وہی دین و مذہب ہے جو حضور سرور کائنات ﷺ کے آئے تھے اور جس کی برہمابرس تبلیغ فرماتے رہے۔

"مذہب جعفری" صرف اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ امام جعفر صادق کے دور میں مسلمان اپنے اپنے امام کی طرف منسوب ہونے لگے تھے۔ کوئی حنفی تھا، کوئی مالکی، کوئی شافعی تھا اور کوئی حنبلی وغیرہ۔

امام صادق کے پرستاروں نے بھی اپنا امتیاز ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کو "مذہب جعفری" کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ "مذہب جعفری" کی نوعیت بھی "مذہب حنفی" یا "مذہب شافعی" جیسی ہے۔

مذہب حنفی یا مذہب شافعی سے مراد وہ اجتہادی قوانین ہیں جنہیں ان "مجتہدین" است نے بطور استنباط پیش کیا ہے اور ان میں ان کے افکار و آراء کا عکس مکمل طور پر نظر

آتا ہے۔
لیکن مذہب جعفری سے مراد تو ان میں جو امامت کے رشتے سے مرسل اعظم کے ذریعہ
امام جعفر صادق تک پہنچے تھے۔ اور آپ کے سینہ اقدس میں محفوظ تھے۔ امام جعفر صادق مجتہد
نہیں تھے۔
لوح محفوظ کے ترجمان تھے اور امام ابو حنیفہ وغیرہ جیسے حضرات واقعہ سے کوئی تعلق
نہ رکھتے تھے ان کا عمل اجتہادی ہوا کرتا تھا۔ اور ان کے فتاویٰ پر ان کا فکر کی چھاپ لگی
ہوتی تھی۔

امت اسلامیہ "مذہب جعفری" سے وہی مفہوم مراد لیتی ہے جو مذہب حنفی
وغیرہ کا ہے تو سخت اشتباہ میں ہے۔ لوح محفوظ کے ترجمان اور ہیں۔ اور
مجتہدین امت اور۔

اجتہاد کا سلسلہ آج بھی پوری امت کے لئے قائم ہے اور ہر مجتہد کو قانونی طور پر
امام ابو حنیفہ کی رائے سے اختلاف کرنے کا مکمل حق ہے۔ جیسا کہ علامہ توشیحی
نے شرح تجرید میں حضرت عمر کے اجتہادات کی توجہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:-
"اگر حضرت عمر نے رسول اکرم سے اختلاف کیا ہے تو یہ کوئی حیرت
انگیز بات نہیں ہے۔ مجتہدین آپس میں ایک دوسرے کی رائے سے اختلاف
کرتے ہی رہتے ہیں۔"

علامہ توشیحی کی اس رائے کا مدد یہ ہے کہ ان کی نظر میں رسول اکرم کی حیثیت بھی
ایک مجتہد کی تھی اور امت کو اجتہادی مسائل میں ان سے بھی اختلاف کرنے کا حق تھا۔
مجھے اس موضوع پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ اگر "بحیثیت
مجتہد" رسول اکرم کی رائے سے اختلاف کرنا ممکن ہے تو حضرت ابو حنیفہ تو بہر حال مجتہد
تھے۔

انہیں وہی الہام انبوت و رسالت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کی رائے سے اختلاف کرنا ہر مجتہد
کے لئے بطریق ادلی ممکن ہو گا۔

امام جعفر صادق کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ آپ رسول اکرم کے وارث و نائب اور خدا
کے مقرر کئے ہوئے امام ہونے کے رشتے سے لوح محفوظ کے ترجمان تھے۔ آپ کی ذات گرامی
اجتہاد سے بہت بالا تھی اور آپ اپنے علوم و کمالات کو ابتدائے فطرت سے اپنے ہمراہ
لیکر آئے تھے۔

مجتہدین امت لاکھوں مراتب اجتہاد طے کرنے کے بعد بھی آپ کی رائے سے اختلاف
کا حق نہیں رکھتے۔

اس سے زیادہ تفصیل اس موضوع سے باہر ہے۔ مقصود کلام صرف یہ ہے کہ دین اسلام
ایک جامع اور ہمہ گیر دین ہے۔ اس کے اصول حیات فکر بشر سے بالاتر اور خالق کائنات
کے وضع کردہ ہیں۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنا انسانوں کی بس کی بات
نہیں ہے۔

اسلام کا تیسرا امتیازیہ ہے کہ اس نے اپنے تعلیمات کو نہایت واضح اور مفصل انداز
سے بیان کیا ہے۔ اس کے تعلیمات میں کوئی الجھاؤ اور اس کے اصول میں کوئی بے نظمی
نہیں ہے۔

اس نے انسانی جسم و روح کا لحاظ رکھتے ہوئے دونوں کے ارتقاء کے پیش
نظر اپنے قوانین کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ ایک اصولی قوانین اور ایک فسروری
قوانین۔

اصولی قوانین وہ عقائد و معارف ہیں جن کا دریافت کرنا اور ان پر اعتماد رکھنا
ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے اور فردی قوانین وہ عملی مسائل ہیں جن پر عمل درآمد کرنا ہر
مسلمان کا اولین فرض ہے۔

اصول کے ذریعہ عقیدہ کا استحکام اور نفس کی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور فرد کے ذریعہ عمل کی اصلاح اور سماج کا سدھار ہوتا ہے۔

اتنے واضح انداز سے تعلیمات کا پیش کرنا بھی ایک دلیل ہے کہ اس کے پیچھے مانوق بشرط اقامت کام کر رہی ہے اور اس کے پس منظر میں دست غیب کا فرما ہے۔

اسلام کا چوتھا امتیازیہ بھی ہے کہ اس نے اپنے قانون کے لئے ایک ایسے نام کا انتخاب کیا ہے جو بیک وقت وسیلہ بھی ہے اور مقصد بھی۔

دنیا کے کسی دوسرے مذہب یا قانون میں یہ خصوصیت نہیں ہے کہ اس نے اس نکتہ کا لحاظ رکھا ہو۔ مذہب کی تاریخ میں ایسے ہی نام ملتے ہیں جو مقصد کی نشاندہی کرتے ہیں تو وسیلہ سے غافل ہیں اور وسیلہ پر نظر رکھتے ہیں تو مقصد کی طرف سے بے توجہ ہیں۔

یہ تنہا اسلام کی انفرادیت ہے کہ اس نے دونوں باتوں کا لحاظ رکھا ہے اور اس جہت سے بھی اپنے قانون کو ہمگیر اور جامع بنادیا ہے

اسلام اصطلاحی اعتبار سے ”کلمہ شہادتین“ پڑھنے کا نام ہے۔ اور مسلمان ہر وہ شخص ہے جو توحید الہی، رسالت پیغمبر اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔ چاہے وہ عقائد دلوں کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوں یا صرف زبان پر پائے جا رہے ہوں۔

سوال صرف یہ ہے کہ اسلام جب ایک نظام زندگی کی شکل میں آیا ہے اور اس نے اپنا تعارف دین یعنی طریقہ حیات سے کرایا ہے تو اس کی کل حقیقت ”کلمہ شہادتین“ کیونکر بن سکتی ہے۔

کلمہ نہ طریقہ حیات ہے اور نہ نظام زندگی۔ اسے نہ دین کہا جاسکتا ہے نہ مذہب۔

دین کے معنی میں طریقہ اور مذہب کے معنی میں راستہ۔ طریقہ اور راستہ دونوں عملی دستور چاہتے ہیں۔ لفظوں کا دہرا دینانہ طریقہ ہے اور نہ راستہ۔

لیکن اس سوال کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی جبکہ اسلام کے حقیقی معنوں میں غور کرتے ہیں۔ اور یہ دیکھتے ہیں کہ مالک کائنات نے اپنے قانون کا نام اسلام کیوں رکھا ہے۔

اسلام کے معنی ہیں تسلیم، سپردگی اور اطاعت و انقیاد وغیرہ۔ اسلامی قوانین کا وضع کرنے والا یہ چاہتا ہے کہ لوگ تسلیم اور سپردگی کی منزل تک پہنچ جائیں۔

یہی ان کا مقصد حیات ہے اور یہی روح کائنات۔ تسلیم کا فقدان انسانیت پیدا کرتا ہے اور انسانیت کا وجود تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہو کر رہتا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ دنیا تباہی کے گھاٹ نہ اترنے پائے اور انسانیت کو مطلق العنان ہو کر کام کرنے کا موقع نہ ملے۔

یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کس کے مقابلہ میں سپردگی چاہتا ہے۔ اور کس کے مقابلہ میں سر تسلیم خم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ تسلیم کا مطالبہ تو اس وقت بھی پورا ہو جاتا ہے جب انسان اپنے وجود کو اپنے نفس اور اپنے خواہشات کے سپرد کر دیتا ہے جذبات کی حکومت ہوتی ہے اور وجود کا سجدہ نیاز۔

لیکن اس کا واضح حل یہ ہے کہ تسلیم اور سپردگی خود اپنے اندر ایک بنیادی شرط رکھتی ہے۔ تسلیم کا صحیح تصور یہی ہے کہ جو شے جس سے لی جائے اسی کے حوالے کر دی جائے۔ امانت کو صاحب امانت کے سپرد کر دینا تسلیم ہے۔ خیانت کا نام تسلیم نہیں ہے۔

انسان نے اپنا وجود اپنی مہستی اپنے نفس سے لی ہے۔ تو تقاضائے تسلیم بھی ہے کہ اسے نفس کے حوالے کر دیا جائے۔ اور اگر نفس کو کبھی کسی دوسری ہستی سے لیا ہے تو تسلیم کا تقاضا قطعاً یہ نہیں ہے کہ سراسر وجود پر نفس کو ماکم بنا دیا جائے۔
تسلیم کا صحیح مفقضا یہی ہے کہ جان اس جہاں آفرین کے حوالہ کر دی جائے جس سے لی گئی ہے۔ اور وجود کو اس کی راہ میں قربان کر دیا جائے جس نے اسے مطالبہ کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے علی میدان میں قربانی و سپردگی ہی کو اسلام و تسلیم سے تعبیر کیا ہے۔ کلمہ شہادت میں مرنے ایک اعتراف اور التفات ہے کہ ہمارا وجود ہمارا نہیں ہے وہ کسی بلند و بالا ہستی کا عطیہ ہے۔
ہمارا افرین ہے کہ ہر وقت اسے اپنے ذہن میں رکھیں اور کسی وقت بھی اس کی طرف سے غافل نہ ہوں۔ جیسے جیسے یہ احساس شدید تر ہوتا جائے گا تسلیم اور قربانی کا جذبہ محکم تر ہوتا رہے گا۔

تاریخ اسلام

اہل اسلام نے اسلام کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے سلسلہ کلام کا آغاز ہجرت رسولؐ یا زیادہ سے زیادہ ولادتِ مرسلِ اعظمؐ سے کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انداز فکر بالکل غلط ہے۔ اسلام کی تاریخ کا آغاز نہ ہجرت سے ہو سکتا ہے اور نہ ولادت سے۔

اسلام سے مراد کلمہ شہادتین ہے تو اس کا سلسلہ بعثت پیغمبرؐ سے شروع ہوتا ہے جب آپؐ نے پہلے پہل امت کو کلمہ پڑھنے کی دعوت دی تھی اور ذوالعشیر میں مکہ کی گھوڑوں میں اعلان کیا تھا کہ میں خیر دنیا و آخرت لے کر آیا ہوں، تم لوگ کلمہ توحید

کا اعتراف کرو اسی میں تمہاری فلاح اور تمہاری زندگی کی نجات ہے اس کا کوئی تعلق نہ ولادت مرسلِ اعظم سے ہے اور نہ ہجرت سے۔

اور اگر اسلام سے مراد "حقیقت اسلام" یعنی تسلیم و سپردگی ہے تو اس کا سلسلہ دو ذوال اول سے قائم ہے۔

تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا ہے جب خالق عالم کی طرف سے ایسا قانون نہ رہا جو انسان کو تسلیم و سپردگی کی دعوت دیتا ہو۔ انسان کی فطرت ایسا فطرت ہے جو بارگاہِ احدیت میں سر تسلیم خم نہ کئے ہو۔

"أَفَغَيْرَ رِزْقِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" — آل عمران ۸۳

کیا یہ لوگ غیر دینِ خدا کو تلاش کر رہے ہیں جب کہ زمین و آسمان کے تمام باشندے اسی پر اسلام لائے ہوئے ہیں۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ اسلام کلمہ شہادتین والا اسلام نہیں ہے۔ اس کا مفہوم وہی تسلیم و سپردگی ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔

دو نہ کائنات اور نہ دوسم کے درے درے کے مسلمان ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ان میں نہ کوئی کلمہ پڑھنے والا ہے اور نہ بیعت کرنے والا۔

ان کا کلمہ "زبانِ وجود" سے ہے اور ان کی بیعت "دستِ فطرت" سے ہے

یہ ادوات ہے کہ کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر ذراتِ خاک بھی کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اور عالمِ انسانیت کو ایک ٹھوکہ دیتے ہیں کہ ہم بے جان دے شعور ہو کر مالک کے وجود کا شعور رکھتے ہیں اور تم عقل و شعور رکھنے کے باوجود اس کی بارگاہ میں سر جھکانا نہیں جانتے۔

ادامی طور پر "اسلام" کا سلسلہ جناب آدمؑ کے دور سے شروع ہوا ہے لیکن اس دور میں اسلام کا کوئی مرتب نظام اور باقاعدہ ضابطہ حیات نہیں تھا۔ اس لئے قرآن حکیم نے سب سے پہلے اس لفظ کو جناب نوحؑ کے تذکرہ میں بیان کیا ہے۔

اس کے بعد ہر دور و شریعت میں اس لفظ کی تکرار ہوتی رہی تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ شریعت کے قوانین و قواعد کے بدلنے کے باوجود روح شریعت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اور دین اسلام دہی دین ہے جو روز اول انسانی زندگی کے ضابطہ کے طور پر وضع ہوا تھا۔ اور جس کے اصول و تعلیمات میں فلاح و نجات کے جملہ اسرار و موزوں پوشیدہ ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔

"فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ نَسَا سَأَسْتَلُكُم مِّنْ أَجْدَانٍ أَجْرِئٍ
إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَاصِرَتِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ" (نوح یونس ۱)

جناب نوحؑ کا "من المسلمین" بتا رہا ہے کہ اسلام کا سلسلہ جناب نوحؑ سے شروع نہیں ہوا بلکہ یہ سلسلہ اس سے پہلے بھی رائج تھا اور اسی کی ایک کڑی جناب نوحؑ بھی تھے۔

حضرت نوحؑ کے بعد جناب ابراہیمؑ کا دور شریعت آتا ہے۔ آپ بھی اپنی شریعت کا عنوان "شریعت اسلام" ہی رکھتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

"وَوَصَّي بِهَا إِبْرَاهِيمَ بَنِيَّاهُ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ" - بقرہ ۱۳۲

اس بات کی وصیت ابراہیمؑ و یعقوبؑ نے اپنے فرزندوں کو کی کہ اللہ نے تمہارے لئے دین منتخب کر دیا ہے لہذا اب مسلمان ہوئے بغیر دنیا سے نہ اٹھنا۔

جناب ابراہیمؑ اور جناب یعقوبؑ کی اسی وصیت کا سلسلہ نسل یعقوبؑ میں جناب یوسفؑ کی طرف منتقل ہوا اور آپ نے اعلان فرمایا۔

"وَبَقَدْ آتَيْنَاكَ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْنَاكَ مَا تَوَلَّىٰ مِنَ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَبِئْسَ الْآخِرَةُ تَوَفَّىٰ مُسْلِمًا
وَالْحَقُّنِي بِالْحَقِّ بِالْعَصَا لِحَيِّينَ" - یوسف ۱۰۱

پروردگار تو نے ایک ملک بھی دیا ہے اور احادیث کی تائید کا علم بھی عطا کیا ہے تو زمین و آسمان کا خالق اور دنیا و آخرت میں میرا ولی و نگران ہے مجھے مسلمان دنیا سے اٹھانا اور صالحین سے ملحق کر دینا۔

جناب یوسفؑ کے اس بیان میں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ آپ نے وقت و ذات اسلام کی دعا کی ہے۔

گویا آپ بتا رہے ہیں کہ یہ دعا آپ کی وصیت کی تکمیل کے لئے کی جا رہی ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ اصل مذہب وہی ہے۔ جو حیات کے آخری لمحات میں کام آئے زندگی کے ساتھ ساتھ چھوڑ دینے والا مذہب کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ "صالحین سے ملحق ہونے کی آرزو" بھی اشارہ کر رہی ہے کہ جناب نوحؑ کی طرح حضرت یوسفؑ کی نگاہ میں بھی اللہ کے کچھ صالح بندے ہیں۔ جن سے ملحق ہونے کی تمنا آپ کے قلب و ازنین میں کر دٹ لے رہی ہے۔

مرسل اعظم کے تذکرہ میں بار بار اس لفظ اسلام کو دہرایا گیا ہے اور اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ جیسے یہ دین مرسل اعظم ہی کا دین ہے اور پہلے پہل آپ ہی کو عطا ہوا ہے۔

اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے جیسا کہ انبیاء و سابقین کے تذکرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب نے اپنے اسلام سے پہلے کسی صاحب اسلام کے اسنام کا اعتراف کیا ہے

”قُلْ اَعْبُدُوا اللَّهَ اخذُوا لِيَا نَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ
وَلَهُمْ لِيُطْعِمَهُمْ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّي اُصِرْتُ اَنْ اَكُونَ اَوَّلَ
مَنْ اُسْلِمَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمَشْرِكِيْنَ“ (الغمام ۱۲)
”وَجَاهِدْ رَا فِي اللَّهِ حَتَّى جِهَاجِهِ هُوَ اجْتَبَا كَسْرُو
مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِثْلَهُ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيْمُ
لَهُوَ سَمَّاكُمْ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ نَبَلٍ وَفِي هَذَا اَلِيَكُونُ الرَّسُوْلُ
شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ“ - حج -
”وَوَضَعْنَا اَلْاِنْسَانَ بُوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا حَمَلَتْهُ اُمُّهُ

عہ اسے پیغمبر کہہ دیجئے کہ کیا خالقِ ارض و سما کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا ولی بنا لوں جب
کہ وہی کھلاتا ہے اور خود کھاتا بھی نہیں ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب
سے پہلا مسلمان بنوں اور خبردار تم لوگ بھی مشرک نہ بننا۔
عہ راہِ خدا میں باقاعدہ جہاد کرو۔ اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور دین میں کوئی
سنجھی نہیں رکھی۔ یہ تمہارا ہے باپ ابراہیم کا مذہب ہے۔ اس نے تمہارا نام پہلے
بھی مسلمان رکھا تھا اور اب بھی — تاکہ رسول تمہارا گواہ رہے اور تم لوگوں
کے نگران رہو۔

عہ ہم نے انسان کو عیسیٰ کی کہ والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے کہ اس کی ماں نے
حل اور وضعِ حمل میں ناگواری کا سامنا کیا ہے۔ اس کے حل اور مضامعت کا زمانہ
کل ۳۰ مہینے کا ہے۔ جب وہ انسان تو انا ہو کر ۴۰ سال کو پہنچا تو اس نے دعا
کی۔ خدایا مجھے تو نیت دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر یہ ادا کروں جو تو نے
مجھے دی ہے اور میرے والدین کو بھی۔ مجھے عملِ صالح کی توفیق دے کہ تو راہی ہر جائے
میری فدیت میں صلاح قرار دے میں تیری طرف متوجہ ہوں اور تیرے مسلم بندوں میں ہوں۔

کُرْهًا وَضَعْتَهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا
حَتَّى اِذَا بَلَغَ اُسْدًا ؕ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّي اِذْ رِغْنِي
اَنْ اُشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَتِي اَنْ اَنْ
اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَاصْلِحْ لِي فِى ذُرِّيَّتِي اِنِّى تَقَتُّ اِلَيْكَ وَ
اِنِّى مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔“ (احسان ۱۵)
”قُلْ اِنْ صَلَوَتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ
لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ اُصِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ
(الغمام ۱۶۲)

مذکورہ بالا ارشادات میں مرسلِ اعظم کو جادہ اسلام پر گامزن رہنے کا حکم دیا گیا

ہے۔

آپ نے قوم کو اسی بات کی تعلیم دی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قوم کے اسلام کا
انداز سرکار دو عالم کے اسلام سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ قوم نئی کے ہاتھ پر کلمہ
پڑھ کے مسلمان بنی ہے۔ اور نئی نے کسی سے درسِ اسلام نہیں لیا۔ قوم کا
اسلام دنیا میں آنے کے بعد شروع ہوا ہے اور مرسلِ اعظم کا اسلام پیدائش کے ساتھ
دنیا میں آیا ہے۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنے بارے میں اولیٰ منِ اسلام
اور ”اول المسلمین“ کی لفظیں استعمال کی ہیں اور ان لفظوں کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب
سے سلسلہ اسلام شروع ہوا ہے میرا اسلام تمام مسلمانوں سے مقدم رہا ہے۔

عہ اسے پیغمبر کہو کہ میری نماز، عبادت، زندگی، موت۔ سب اللہ کے لئے ہے۔
جو عالمین کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور
میں تو پہلا مسلمان ہوں۔

قرآن حکیم نے مسلمانوں کی فہرست میں کائنات ارض و سما جناب لوح، جناب ابراہیم، جناب یعقوب، جناب اسمعیل، جناب یوسف ذریت ابراہیم جیسے تمام افراد آجاتے ہیں اور ان سب کے مسلمان ہوتے ہوئے سرکارِ دو عالم اول المسلمین ہیں۔ اب یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ ساری کائنات مسلم ہے اور حضور سرور کائنات اول المسلمین ہیں۔ آپ اس وقت بھی تھے جب کائنات کا وجود نہ تھا۔ اور صرف موجود ہی نہ تھے بلکہ اپنی صفت اسلام سے متصف بھی تھے۔

روح اسلام

گزشتہ بیانات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام اپنے دامن میں وسیلہ و مقصد دونوں کے مکمل اشارے رکھتا ہے۔ اس کے پاس وہ کلمہ بھی ہے جس کے ذریعہ انسان اس کے دائرہ عمل میں قدم رکھتا ہے اور وہ منزل تسلیم بھی ہے جہاں تک پہنچنا ہر مسلمان کا مقصد اولین ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ مقصد کا مرتبہ وسیلہ و ذریعہ سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے۔

وسیلہ کی ساری عظمت و بلندی مقصد ہی کے اعتبار سے نطے کی جاتی ہے مقصد بلند ہوتا ہے تو وسیلہ بھی بلند ہو جایا کرتا ہے اور مقصد پست ہوتا ہے تو وسیلہ بھی پست ہوتا ہے۔ اسلام میں کلمہ شہادتین کی سب سے بزرگ اہمیت ہے۔ یہ کہ وہ مقصد تسلیم و سیرگ تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

یہ کلمہ ایک طرف مرد مسلم میں یہ بلند خی فکر پیدا کرتا ہے کہ کائنات ارض و سما اور موجودات عالم امکان میں کوئی ایسا نہیں ہے جسے آکر کہا جاسکتا ہو اور جو ذاتی اقبال

سے ہم سے بند ہو۔ کائنات ایک ”رشتہ عہدیت“ میں جکڑی ہوئی ہے اور پورا عالم امکان ایک مخلوقِ برادری کی فرد ہے۔

دوسری طرف یہ کلمہ یہ احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ انسان کو متکبر و مغرور نہیں ہونا چاہیے یہ سمجھتا ہے کہ اس کائنات خالق میں کوئی اس سے بلند تر نہیں ہے لیکن ایک ہستی ضرور ہے جو اس سے بلند تر اور اس کی خالق و مالک ہے۔

اسی کے فیضِ کرم کا نتیجہ یہ سارا عالم امکان اور اسی کی نظر رحمت کا صدقہ یہ وجود انسانی ہے۔

وہ اس کائنات میں تنہا اور لاوارث بھی نہیں۔ اس کے ہمراہ ہمیشہ اس کا خالق اور اس کی سرپرستی کے لئے ہمیشہ اس کا مالک موجود ہے۔

وہ ایک ”بین بین“ حیثیت کا مالک ہے کہ مخلوقات کے اعتبار سے سب کا ہمسر اور خالق کے اعتبار سے ایک بندہ کمتر۔

اسلام اسی توازنِ فکر کا نام ہے۔ اور کلمہ توحید اسی تعلیم و تلقین کا وسیلہ ہے۔

کلمہ توحید کے ساتھ کلمہ رسالت ”لا آلہ“ کی مزید تشریح کے لئے رکھا گیا ہے۔ یہ کلمہ صاف بتا رہا ہے کہ ”خلوئیت“ کے اعتبار سے ساری کائنات ایک درجہ رکھتی ہے اور سب مالک کی بارگاہ کے فقیر ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسانوں میں باہمی تفوق اور برتری نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس برتری کا سرچشمہ ”لا آلہ“ نہیں ہے ”لا الہ الا“ ہے۔

والہ کی منزل میں ساری کائنات ایک درجہ اور ایک منزل رکھتی ہے۔ لیکن اس

کے بعد اللہ کی منزل میں ایک خدائے برتر ہے جسے یہ مکمل حق ہے کہ وہ اپنی الوہیت کو استعمال کرتے ہوئے ایک بندے کو دوسرے بندے پر برتری عطا کر دے اور باقی بندوں پر اس کی اعلیٰ فرض کر دے۔

یہ کسی ذاتی تفوق کا نتیجہ نہیں ہے کہ لا آلہ کے منافی ہو جائے اس کا تمام تر تعلق الا اللہ سے ہے اور اسے اس امر کا مکمل اختیار حاصل ہے

خود قرآن حکیم کا اعلان ہے

”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ فِيكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ إِنَّهُ يُخَوِّفُ مَنْ هُوَ مَعْنِي“

ہم نے رسولوں میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

مقصود یہ ہے کہ جب ہمارے ناسندوں میں مساوات اور برابری نہیں ہے۔ اور ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہے تو اس کائنات میں برابری کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

یہ ہمارے اختیار کی بات ہے کہ ہم کسے انفضیلت دیں اور کن حالات میں دیں اس میں کسی بندہ کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ بندہ کی دخل اندازی تو خود ”لا آلہ“ کے منافی ہے۔ غیر خدا کو خدا کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

مالک کی بارگاہِ نیاز میں خاصانِ خدا کے سجدوں کا ایک اہم فلسفہ یہ بھی ہے کہ وہ اس نکتہ سے باقاعدہ باخبر ہیں کہ امکان کے اعتبار سے ہماری حیثیت بارگاہِ احدیت میں ایک فقیر سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے اپنے فیوضِ دکریم سے فقیر کو ”جناب امیر“ بنا دیا ہے کرم کرنا اس کا کام تھا اور شکر یہ ادا کرنا ہمارا کام ہے۔

”أَمْرٌ يُحَدِّثُ فِي النَّاسِ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ“

فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا

یہ لوگ ہمارے بندوں سے حسد کرتے ہیں کہ ہم نے اپنا فضل ان کے شامل حال کر دیا ہے تو یاد رکھیں کہ ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب و حکمت اور ملک عظیم سب کچھ عطا کر دیا ہے۔

یہ کلمہ تو حید ”لا آلہ“ کی منزل میں افکار کو بھٹکاوینے کے ساتھ ساری کائنات کو نظر سے گرا دیتا ہے اور اللہ کی منزل میں وہ جذبہ تسلیم و سپردگی پیدا کرتا ہے جو اسلام کی ذاتی روح اور مذہب کا ذاتی مقصد و مقصود ہے۔

کلمہ تو حید سے بہتر اس کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ شہادتِ رسالت حق الوہیت کے استعمال پر ایمان لانے والے کی نشانی ہے۔ جس کے بعد انسانی غرور خاک میں مل جاتا ہے۔ اور خالق کے فیصلوں کو مکمل عظمت حاصل ہو جاتی ہے۔

اسی مقام پر اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا بھی غیر مناسب نہیں ہے کہ کلمہ تو حید اور روح اسلام میں ایک انتہائی دقیق و عمیق تعلق ہے۔ کلمہ سیکر روح ہے اور روح جان کلمہ۔

جس کے اندر کلمہ کا احساس شدید تر ہو گا وہ روح اسلام سے قریب تر ہو گا اور جس کے اندر روح اسلام یعنی تسلیم و سپردگی کا جذبہ شدید تر ہو گا اس کی نگاہ میں کلمہ کی عظمت بھی بھرپور ہو گی۔

اسلام میں تقیہ کا حکم ضرور ہے۔ اور ناگزیر حالات میں کلمہ کا ترک کر دینا اور ابھی ہے۔ لیکن حکم تقیہ پر عمل کرنے والے مخلصین مذہب کا کردار بتاتا ہے کہ جب تک جان کا خطرہ سامنے نہیں آگیا اس وقت تک کلمہ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

سرکارِ دُعا لَم خاتمِ الانبیاء و بنِ کُرّائے اور ختمِ نبوت کا شرفِ دریتِ اسمعیل کو حاصل ہوا۔

نسلِ اسفیل ہریانہ اِسحاقی ————— دونوں سلسلوں میں اسلامِ دِسلیم
کے مناظرِ کثرت پائے جاتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے عام امت اور صاحبان منصب کے اسلام میں یہ فرق رکھا ہے کہ عام امت کلمہ پڑھ کر کبھی مسلمان ہو جایا کرتی ہے لیکن ائدر کے منصب دار بندے اس وقت تک مسلم نہیں کہے جاتے جب تک منزل تسلیم و سپردگی پر فائز نہ ہوں۔ یعنی ان کا اسلام سپردگی اور قربانی کا اسلام ہوتا ہے اور وہ اپنے ہمراہ یہ جہز ہرے کر بھی اس دنیا میں آتے ہیں۔

اب جس کا جذبہ قربانی جن قدر مستحکم ہوتا ہے اس کے بارے میں اسلام کا اعلان بھی اتنے ہی واضح انداز سے ہوتا ہے۔

اصطفاء وارتقاء

اس مقام پر اس نکتہ کا بیان کر دینا بھی انتہائی مناسب ہے کہ مالک کائنات نے نسل اسحاق میں چلنے والے اسلام کا تعارف لفظ اصطفا کے ساتھ کرایا ہے۔

”اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لِكُلِّ دِيْنٍ“

اللہ نے تمہارے لئے دین کو مصطفیٰ قرار دیا ہے۔

لیکن جب نسل اسحاق میں جناب عیسیٰ پر نبوت کا خاتمہ ہو گیا اور منصب نبوت
نسل اسمعیل کی طرف منتقل ہوا۔ تو تعارف کا عنوان تبدیل ہو گیا۔

میں نے اپنی کتاب ”امامت اور قیامت“ میں اس نکتہ کی طرف مفصل اشارہ کیا ہے

رفتارِ اسلام

قرآن حکیم کا مطالعہ گواہ ہے کہ تاریخ مذہب میں سب سے پہلے عبودیت کا تہراٹا
گاہ پر تسلیم و سپردگی کا مظاہرہ جناب ابراہیمؑ اور ان کے عزیز و فرزند جناب اسمعیلؑ نے کیا
پھر خلیل و ذریع کے بعد یہ سلسلہ نسل ابراہیمؑ میں چل پڑا۔ اور جو بھی آتا
لہا رہ انت مسلمہ کا مصداق بن کر تسلیم و سپردگی کے جذبات کا مظاہرہ کرتا رہا۔
جناب ابراہیمؑ کے دو فرزند تھے ایک اسمعیلؑ اور ایک اسحاقؑ۔
جناب اسمعیلؑ کی قربانی کا تذکرہ واضح لفظوں میں قرآن حکیم میں موجود ہے۔
نہ اسحاقؑ بھی تسلیم و سپردگی سے خالی نہیں رہی اور کسی نہ کسی انداز سے

قربانی پیش کرتی رہی۔

جناب اسماعیل کے فرزند جناب یعقوب کی وصیت کا تذکرہ سابق میں کیا

جا چکا ہے۔

”وَلَعَقُوبُ بْنُ أَبِي إِسْحَاقَ إِذَا سَأَلَ اللَّهَ أَنْ يُصْطَفَىٰ لَكُمْ الدِّينَ فَلَا تَسْأَلُوهُ

إِلَّا أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ

جَنَابِ یُوسُفَ، جَنَابِ الْیُوبَ، جَنَابِ مُوسَى، جَنَابِ عِیْسَى کی قربانیوں کا تذکرہ۔

تفصیلی طور سے تاریخوں میں موجود ہے۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ جناب میں
پیر اکبر نسل اسحاق میں منصب نبوت کا خاتمہ ہو گیا اور منصب الہی نسل اسمعیل کی طرف

کہ قدرت نے ہر شریعت کے محافظ کو نبی یا رسول کا عنوان دیا ہے اور شریعت پیغمبر اسلام کے محافظین کو نبی یا رسول کے بجائے لفظ "امام" سے یاد کیا ہے۔

اس مقام پر یہ بتانا ہے کہ جس طرح محافظین کے عنوان میں تبدیلی آگئی ہے۔ اسی طرح خود دین کے عنوان میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے اور جو دین نسل اسحاق میں اصطفیٰ کے عنوان سے چلتے چلتے مفرد سرور کائنات تک پہنچا ہے۔

وہی دین جب غدیر خم کے میدان میں امامت کے حوالہ کیا گیا تو قرآن حکیم کا لہجہ بھی بدل گیا اور اب یہ نہیں کہا جاتا کہ

"اصطفیت لکم اکا سلام دینا۔"

ہم نے تمہارے لئے دین کو مصطفیٰ قرار دیا ہے۔

بلکہ یہ اعلان ہوتا ہے۔

"کفریت لکم اکا سلام دینا۔"

ہم نے تمہارے لئے دین کو پسند کیا ہے اور اس سے راضی ہوئے ہیں۔

اب یہ اباب نظر کے غور کرنے کی بات ہے کہ جس کا اصطفاء ہوتا ہے اسے

کیا کہا جاتا ہے۔ اور جس سے رضا متعلق ہوتی ہے اس کا کیا

عنوان ہوتا ہے؟

میں اس مقام پر بندوں کی نظر پر اعتماد کرنے کے بجائے خود خالق کریم کے

نظریہ کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے امامت کے ہاتھوں دیئے جانے والے قانون

کا عنوان کیا رکھا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :-

"وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ

مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا۔"

اللہ نے بعض صاحبان ایمان کو دار سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں

روئے زمین پر اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح سابق میں بنا مارا ہے

اور ان کے لئے اس دین کو غالب بنائے گا جس کا ارتقاء کیا گیا ہے اور

ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا ہے کہ اس دین کا عنوان ارتقاء ہے۔

اصطفاء نہیں ہے۔

یعنی جو دین روز اول سے اصطفاء کے عنوان سے چل رہا تھا آج ارتقاء کے

عنوان سے زندہ ہے۔ اور اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ دین "مصطفیٰ" کا غلبہ وعدہ

الہی کے پورا ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے اس دین کا غلبہ ضروری ہے جس

کا ارتقاء کیا گیا ہے۔ اور جسے صحیح معنوں میں "دین مرتضیٰ" کہا جاسکتا ہے۔

دین کے لئے لفظ مرتضیٰ کا استعمال "عالم معنی" میں اس عظیم اتحاد کی طرف

اشارہ کر رہا ہے جو اللہ کے ایک بندہ مرتضیٰ اور دین مرتضیٰ میں ہے۔ یہ مرحلہ تفسیر

نہیں ہے کہ اس کے لئے حوالوں کی گفتگو کی جائے۔

یہ ایک لفظی مناسبت ہے جو ظاہری ہونے کے باوجود معنویت کا ایک سلسلہ

اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور دنیا کو بتا رہی ہے کہ غدیر خم کے اعلان کے بعد

"اصطفاء" والے دین پر ایمان کافی نہیں ہے بلکہ اس دین کا تسلیم کرنا ضروری ہے جسے

ارتقاء کا عنوان حاصل ہے اور جس میں ولایت علی مرتضیٰ ایک رکن کی حیثیت

رکھتی ہے۔

ان مباحث سے قطع نظر اصل مدعا یہ ہے کہ مذہب اسلام تسلیم اور قربانی کا

مذہب ہے۔۔۔۔۔ اس میں جس کی قربانیاں جتنی زیادہ ہوں گی اس کا مرتبہ اتنا ہی بلند۔
برتر ہو گا۔

تاریخ انبیاء و مرسلین میں قربانیوں کا مسلسل تذکرہ ملتا ہے۔ مال کی قربانی، عزت کی قربانی، وطن و مرکز کی قربانی وغیرہ۔

لیکن ”قربانی“ کے عنوان سے جان کی قربانی کا تذکرہ صرف جناب اسمعیل کے یہاں ملتا ہے۔۔۔۔۔ اور قدرت نے اس قربانی کے اعلان میں ایک خاص اہتمام کیا ہے۔

واقعہ بیان کرنے سے پہلے تہذیب میں یہ کہہ دیا گیا۔

”فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ الْاِسْعٰی“

جب اسمعیل باپ کے ساتھ دوڑنے کے فائق ہو گئے۔ تب جناب ابراہیم نے ان کے سامنے اپنے خواب کو بیان کیا اور انھوں نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیا۔

اب قربان کرنے والا معیض باپ ہے اور قربان ہونے والا نوجوان فرزند
مالک نے حسن عمل کی خبر دی اور ان کی قربانی قبول ہو گئی۔ لیکن تاریخ قرآن نے ایک ”راہِ تربیت“
آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ دیا۔ کہ یہ سارے نفعاً، سارے مراتب، سارے کمالات
اس قربانی کا نتیجہ ہیں جو نوجوانی کی منزل تک پہنچنے کے بعد سامنے آئی ہے۔
اب اگر کوئی ایسا قربانی پیش کرنے والا اہل جائے جو اپنے نفس کو اسی حوصلہ
کے ساتھ اس سے کم عمر میں قربان کر دے تو یقیناً قربانی کے لحاظ سے اس کا مرتبہ
قربانی اسمعیل سے بلند تر ہو گا۔

نبوت و غیر نبوت کا فرق اپنے مقام پر ہے لیکن جہت تسلیم و قربانی کی عظمت
سے بہر حال انکار نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جناب اسمعیل نے کسی خاص مقصد کے
تحت قربانی نہیں دی تھی۔ اور ذرا ان کی قربانی کا کوئی خاص مدعا تھا۔

وہ صرف ایک خدائی آزمائش تھی جس میں جناب اسمعیل کامیاب ہو گئے اور ذبیحہ اللہ کا
لقب پانگئے۔

کہ اگر (لغوذا للہ) انا کامیاب بھی ہو گئے ہوتے تو کسی مقصد کا نقصان نہ ہوتا۔
صرف اسمعیل کے ثواب میں کمی واقع ہو جاتی۔

لیکن تاریخ میں ایسی قربانیوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جن کی پشت پر اہم مقاصد
کام کر رہے تھے۔ کہ اگر وہ قربانیاں نہ ہوتیں تو سارے مقاصد برباد ہو کر رہ جاتے۔
ظاہر ہے کہ ان قربانیوں کا مرتبہ قربانی اسمعیل سے کہیں زیادہ بلند تر ہو گا۔

ہجرت کی رات مولائے کائنات کی قربانی کا یہی عالم تھا کہ یہ علی کا کوئی امتحان
نہیں تھا بلکہ پیغمبر کی زندگی کا سوال تھا جو علی کی قربانی پر موقوف تھا۔ علی نے جان کی بازی
لگادی تو نبی کی جان بچ گئی۔ درنہ۔۔۔۔۔

اس مقام پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ علی بھی (معاذ اللہ) کامیاب ہو جاتے تو
کوئی نقصان نہ ہوتا؟

اس لئے کہ یہاں نقصان لگا ہوں کے سامنے موجود ہے۔ علی قربانی نہ پیش کرتے
تو نبی کی زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔۔۔۔۔ اور نبی کی زندگی کا خاتمہ دین و مذہب
اصول و فروغ، شریعت و قوانین سب کی قربانی اور سب کا خاتمہ تھا جس کا تصور بھی
تاریخ مذہب میں نہیں کیا جاسکتا۔

تفصیلات کو ترک کرتے ہوئے نتیجہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام حقیقی
تسلیم و سپردگی کا مذہب ہے جو جناب آدم سے چل کر انبیاء و مرسلین کے ذریعہ حضور سرور
کائنات تک اور اس کے بعد اماموں کے ذریعہ صبح قیامت تک پہنچے گا۔

اور اس کی روح ہے قربانی۔

قربانی کی عظمت کا ازان بلند مقاصد میں پوشیدہ ہے جن کے پیش نظر قربانی دی جاتی ہے۔

حضرت عباس بن علیؓ کی قربانی پوری تاریخ قربانی میں ایک منفرد عظمت کی حامل ہے اس کی مثال کسی منزل پر کبھی تلاش نہیں کی جاسکتی۔

عباسؓ فریہ راہ خدا بھی ہیں۔ اور بلند مقصد پر قربان ہونے والے بھی۔ ان کی زندگی میں قربانی بھی ہے اور مقصد کی بندگی بھی۔

اور اس کے علاوہ ایک خصوصیت اور بھی ہے جو کربلاء کے شہداء ابراہیم کو بھی حاصل نہیں ہے۔

وہ خصوصیت یہ ہے کہ ہر قربانی دینے والا عام اصولوں کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ اور اپنے فکر و نظر کے فیصلے کے مطابق قربان ہوتا ہے۔ عباسؓ کی قربانی اس نوعیت کی نہیں ہے۔ آپ کی ولادت قربانی ہی کے مقصد سے ہوئی ہے۔ اور قربانی بھی اس عظیم مقصد کے لئے جس سے بالاتر مقصد کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

عباسؓ کو کربلا کی تاریخ کے اعتبار سے "افضل الشہداء" بھی کہا جاتا ہے۔

تاریخ شہادت کے اعتبار سے اس بندی کا حامل بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے جس کے بارے میں امام زین العابدینؓ نے فرمایا ہے:-

"میرے چچا عباسؓ کا وہ مرتبہ ہے جس پر روز قیامت سارے

شہداء راہ خدا غبطہ کریں گے۔"

عباسؓ شہید ہیں اور "دین مرتضیٰ" کے شہید ہیں۔

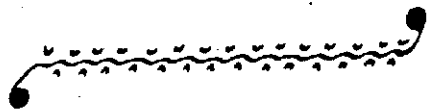
صادق آل محمدؐ نے انھیں نکات کے پیش نظر شہادت جناب عباسؓ کو دین و دنیا

کی شہادت قرار دیا ہے۔

مقام زیارت میں ارشاد فرمایا ہے:-

"لَعَنَ اللَّهُ أُمَّةً اسْتَحَلَّتْ مِنْكَ الْمَحَارِمَ وَ
انْتَهَكَتْ حُرْمَةَ الْإِسْلَامِ"

خدا اس امت پر لعنت کرے جس نے تیرے سلسلے میں محرمات کو حلال کیا اور "اسلام" کی ہتھک حرمت کی۔



”إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْقَةٍ أَمْسَاجٍ“

ہم نے انسان کو ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا ہے۔

اور یہ عنصر براہ راست عالم وجود میں نہیں آتا۔۔۔ بلکہ اس کی تشکیل بھی اس خون سے ہوا کرتی ہے جو ہمہ دم انسان کی رگوں میں دوڑا کرتا ہے اور جس کی مسلسل گردش سے یہ سلسلہ حیات قائم و دائم ہے۔

خون کا وجود سبھی کوئی غیبی وجود نہیں ہے۔۔۔۔۔ بلکہ یہ کبھی ان غذاؤں کا نتیجہ ہے جو انسان کے شکم میں جانے کے بعد تحلیل ہو کر قی میں اور مختلف منزلوں سے گزرنے کے بعد خون کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

خداؤں کا وجود بھی دفعۃً نہیں ہوتا۔ ان کے وجود میں بھی دانہ
کے خصوصیات زمین کے کیفیات، آفتاب کی حرارت، مانتاب کی خشکی، براؤں کی سردی و گرمی،
فناؤں کی رطوبت و خشکی وغیرہ کا دخل ہوتا ہے۔

اتنے مراحل سے گزرنے کے بعد دانہ وجود میں آتا ہے۔ اور دانہ کے چند منازل طے کرنے کے بعد غذا کی شکل پیدا ہوتی ہے۔ غذا انسانی شکم کی مشین میں تحلیل ہوتی ہے تو خون بنتا ہے۔ اور خون مخصوص قوانین کے تحت رنگ بدلتا ہے تو لطفہ کی تشکیل ہوتی ہے۔

انسانی وجود کے لئے اسنے مراحل بھی کافی نہیں ہیں۔۔۔۔۔ یہ مرحلے تو طر فین میں "مادہ حیات" کی تشکیل کے سلسلے میں پیش آتے ہیں۔ "جدید مخلوق" کی پیدائش میں کچھ مراحل اور باقی رہ جاتے ہیں۔

یہی مادے مخصوص جنسی اعمال کے تحت باہم مخلوط ہوتے ہیں اور مختلف تغیرات کے بعد صنفِ نازک کے رحم میں مستقر ہو جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ باہمی اختلاف کے بعد ان خصوصیات کا باقی رہ جانا ناممکن ہے جو ابتدائی

مطلع وفا

علم نفسیات میں یہ بات بطور مسلمات ذکر کی جاتی ہے کہ انسانی کردار کا تعمیر میں دو قسم کے عناصر کا فرما رہا کرتے ہیں۔ دراشت اور ماحول۔ دراشت کردار کے داخلی عناصر کی تشکیل کرتی ہے۔ اور ماحول خارجی اثرات کی تعیین کرتا ہے۔

یہ بات اس حد تک عام ہو چکی ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں ہے۔ آئے دن کے تجربات اور صبح و شام کے مشاہدات اس بات کے زندہ گواہ ہیں کہ دراشت و ماحول انسانی زندگی پر کس قدر اثر انداز ہو کرتے ہیں۔

اس وقت ان مسلمات سے قطع نظر کہ کے مسئلہ کی فلسفی حیثیت پر نظر ڈالنا ہے اور یہ طے کرنا ہے کہ درستی اثبات کے کردار پر اثر انداز ہونے

کی بنیاد کیا ہے؟
مختصر انداز میں یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ انسانی وجود ایک باپ اور ایک ماں کے مشترک
عنصر کا نتیجہ ہوتا ہے۔

طور پر پائے جا رہے تھے۔

خالص مادہ کے اثرات اور ہوتے ہیں، اور مخلوط مادہ کے اثرات اور۔ کسی انسان کے بنیادی "اثرات" کو طے کرنے کے لئے کسی ایک طرف کے خصوصیات پر نظر کرنا اور دوسرے کے کیفیات کو نظر انداز کرنا شاید قسم کی غفلت ہے۔ اختلاط کا ایک واضح اثر یہ ہوتا ہے کہ جس مادہ کے جراثیم غالب آجاتے ہیں وہ باقی رہ جاتا ہے اور پھر دوسرے کے اثرات تقریباً ختم ہو جاتے ہیں یا کم از کم دب کر رہ جاتے ہیں۔

نسلوں میں چلنے والی بیماریوں کا بنیادی راز یہی ہے کہ کسی فریق کے خون میں فاسد جراثیم پیدا ہو گئے تو اس کے امکانات قوی ہوتے ہیں کہ دوسرے جراثیم اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں اور بالآخر انھیں بھی اثر پذیر ہونا پڑے اور نتیجہ میں کوئی کمزور مخلوق عالم وجود میں آجائے۔

"مخلوط مواد" کے اثرات کے بعد "رحم مادر" کی باری آتی ہے۔ یہاں آنے والی مخلوق کو ایک دودن نہیں بلکہ تقریباً ۹ مہینے زندگی گزارنا ہوتی ہے۔ اور یہ طویل مدت "خاموشی" کے ساتھ اپنے ماحول سے الگ ہو کر نہیں گزارنا ہوتی۔ بلکہ اس میں بھی پورے ماحول سے اثر لینا پڑتا ہے۔

خون جبکہ کی غذا ملتی ہے تو اس خون کے سارے اثرات داخل انداز ہوتے ہیں شکم اور ماحول لیتا ہے تو ماں کے ذہنی اور مادی کیفیات کا اثر بھی ہوتا ہے۔ اور اسی لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ نئی مخلوق کی تشکیل میں باپ سے زیادہ ماں کا دخل ہوتا ہے۔ اور باپ کی احتیاط سے زیادہ ماں کا پرہیز لازم و ضروری ہوتا ہے۔

دورانِ خون اور ذہنی کیفیات

مادی خصوصیات کے بعد اس نکتہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ دورانِ خون بھی صرف طبعی قوانین کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا عمیق تر تعلق انسان کی ذہنی کیفیت اور اس کے نفسیاتی اثرات سے بھی ہوتا ہے۔

پر سکون حالات میں دورانِ خون کی رفتار اور ہوتی ہے۔ اور ہیجان کے موقع پر رفتار اور۔

آپ نے اکثر محسوس کیا ہوگا کہ مسرت یا غم کے موقع پر جب بھی غیر معمولی حالات پیدا ہو جاتے ہیں تو خون کی رفتار میں ایک نمایاں فرق محسوس ہونے لگتا ہے اور یہی سلسلہ کبھی کبھی اس منزل تک پہنچ جاتا ہے کہ کارٹ ہیٹل ہو جاتا ہے۔

دور حاضر میں دورانِ خون کی بیماری کا دوا دہ راز یہی ہے کہ انسانی ذہن الجھنوں کا شکار ہو گیا ہے اور زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جب ذہن پورے سکون کے ساتھ کام کر سکے اور خون کا دوران اپنے معمولی انداز پر باقی رہ سکے۔

یہ باتیں اس امر کا ثبوت ہیں کہ دنیا کی ہر آنے والی مخلوق اپنے والدین کے مادی اور معنوی اثرات و تحلیلات کا نتیجہ ہوتی ہے۔

شریعت اسلام نے اسی نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے مباشرت کے مختلف قوانین میں ایک قانون یہ بھی رکھا ہے کہ ذہن تمام ترجمانی عمل کی طرف متوجہ رہے۔ اور دنیا کے دوسرے "اضطراب انگیز" خیالات جگہ نہ پائے پائیں۔ زبان پر ذکر الہی رہے اور دل میں یاد پروردگار۔

ذہن پر کوئی غلط بوجھ نہ پڑے اور آنے والی مخلوق کی تشکیل میں غلط عناصر

نہ شامل ہونے پائیں۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ ان خصوصیات میں اکثر باتوں کا معصومین کی تخلیق سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے انھیں محل کلام سے الگ کرنے کے بعد مسئلہ تخلیق پر نظر کرتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ نیک صورت و نیک سیرت اولاد کی تخلیق میں صرف مقدر کا دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی ایک قسم کی تدبیر کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ عام ذہن اس تدبیر کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اپنی تدبیر کی غلطی کو تقدیر کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

عالم تدبیر میں ایسے انسان کم ہی ملیں گے جو عقد کی ابتدائی منزلوں سے لیکر محل کی آخری منزلوں تک ان تمام شرائط و قواعد کا لحاظ رکھتے ہوں جو ایک صالح اولاد کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

جنسی ہیجان۔ سماجی اضطراب۔ حالات کا دباؤ۔ مسائل حیات کا انجھاؤ۔ انسان کو جملہ قوانین سے غافل بنا دیتا ہے اور نتیجہ میں تدبیر کا مسئلہ تقدیر کے حوالہ ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اکثر محتاط اور متقی افراد کے یہاں بھی بد سیرت اور بد صورت اولاد کا پیدا ہو جانا اس قانون کے غلط اور باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

تخلیق کا تعلق کسی ایک فریق سے نہیں ہوتا اس کا تعلق دونوں فریق سے ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ فریق دوم اس قدر محتاط و پرہیزگار نہ ہو جس قدر احتیاط اور پرہیزگاری ایسی "پاکیزہ امانت" کے تحفظ کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں پسر نوح کی "بدفہمی" کا تذکرہ کیا ہے وہیں زوجہ نوح کی خیانت کا بھی تذکرہ کر دیا ہے تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ باپ کی عدم احتیاط کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ماں کی "نفسیاتی خیانت" کا اثر ہے۔

اس سے بالاتر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ خود معصوم کے لئے بھی بہ وقت یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جب بھی کوئی رشتہ ازدواج قائم کرے تو اپنے شایان شان کائنات کی سب سے زیادہ مستحق اور پرہیزگار عورت ہی سے رشتہ قائم کرے۔

معصوم عالم ظاہر میں انھیں تو ان کا پابند ہوتا ہے جو قوانین عام امت کیلئے نافذ کئے جاتے ہیں۔ اس کے رشتہ ازدواج میں بھی "اُسے دالی نسل" کے علاوہ بے شمار سیاسی، سماجی، معاشی مسائل کا دخل ہوتا ہے۔

وہ کبھی اسلام کے سیاسی مسائل کے پیش نظر عقد کرتا ہے اور کبھی سماجی اور معاشی مسائل کو حل کرنے کے لئے۔

سرکارِ عالم کی متعدد شاخیوں کے پس منظر میں بھی یہی مصالح کام کر رہے تھے۔ کہیں دستمن کی تالیف قلب کے لئے عقد کیا گیا تو کہیں بوڑوں کی پرورش کے لئے۔ کہیں قوم و ملت کی تعلیم و تربیت کے لئے ازدواج تھا۔ تو کہیں مصالح عامہ کے تحفظ کے لئے۔

اس منزل پر یہ تصور ہی غلط ہے کہ ام حبیبہ کو گھرانے کے اعتبار سے خدیجہ الکبریٰ جیسا ہونا چاہیئے۔

اس لئے کہ دونوں کے عقد کی بنیادیں ایک نہیں ہیں تو دونوں کے حالات ایک جیسے کیسے ہوں گے۔

خدیجہ سے عقد سلسلہ نسل کو قائم کرنے کے لئے کیا گیا تھا اور ام حبیبہ سے عقد دوسرے مصالح اسلام کی بناء پر۔

قیام نسل کے ازدواج میں ان تمام باتوں کا لحاظ ضروری ہوتا ہے جو عام رشتوں میں درخور اعتناء نہیں ہوتیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ معصوم بھی بلند بالا خاتون کا انتخاب اسی وقت کرتا ہے جب اس کے ذریعہ کسی "خاص فرزند" کو عالم وجود میں لانا

ہوتا ہے ورنہ عام حالات میں اس قدر شدت انتظام کی ضرورت نہیں ہوتی۔

امتیازی وجود

جناب عباسی کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ ان کا وجود ایک مقصدی وجود تھا۔

امیر المومنین نے ان کی والدہ گرامی سے عقد عام ازدواجی مصالح کے تحت نہیں کیا تھا بلکہ اس کا ایک خاص مقصد تھا جس کے لئے آپ نے اس اہتمام سے رشتہ قائم کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ جب معصوم کے پیش نظر کوئی اہم مقصد ہو گا تو وہ اس کی تکمیل کے لئے وہ تمام انتظامات بھی کرے گا جو عام انسان نہیں کر سکتا۔ جناب عقیل سے شہرہ کرنا بھی اسی اہتمام کے اظہار کے لئے تھا کہ یہ عقد عام رشتوں سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

امیر المومنین کی حیات طیبہ میں جناب ام البنین کے عقد کے قبل اور جناب ام البنین کے عقد کے بعد بھی متعدد رشتوں کا تذکرہ ملتا ہے لیکن کسی رشتہ میں جناب عقیل کے مشورہ کا ذکر نہیں ہے۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب عقیل کل تک "نساب قریش" نہ تھے اور آج ہو گئے ہیں۔ یا امیر المومنین کو پہلے ان کی رائے پر اعتماد نہ تھا اور آج پیدا ہو گیا ہے۔ یا اس رشتے کے اعلان میں کوئی خاص مصلحت ہے جو کل تک حاصل نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسا کچھ نہ تھا۔

بات صرف یہ تھی کہ مولائے کائنات اپنے عقد کے اہتمام کو تاریخ کے صفحات میں محفوظ کر دینا چاہتے تھے اور آپ کا مقصد یہ تھا کہ آنے والی نسلیں یہ محسوس کریں

کہ یہ عقد عام رشتوں سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اور اس کا سلسلہ مخصوص مصالح کے تحت قائم ہوا ہے۔

اس کے بعد جب انسان ان مصالح پر غور کرے گا اور مولائے کائنات کی ایک فرزند شجاع کی خواہش سامنے آجائے گی۔ تو آنے والے فرزند کی عظمت و اہمیت خود بخود منظر عام پر آجائے گی۔

اس کے علاوہ ایک امکان یہ بھی ہے کہ مولائے کائنات خود جناب عقیل کو بھی اپنے بلند ترین مقصد میں شریک بنانا چاہتے ہوں اور آداب اسلامی کے پیش منظر واضح لفظوں میں اس مدعی کا اظہار نہ کرنا چاہتے ہوں۔

اپنے عقد کے ذیل میں آپ نے جناب عقیل کو بھی متوجہ کر دیا کہ میرے پیش نظر ایک اہم مقصد ہے جس کے لئے میں آپ کو زحمت دے رہا ہوں اور عقد کا یہ خصوصی اہتمام کر رہا ہوں۔ کہ ایک فرزند شجاع پیدا ہو اور اسلام کے خاص موقع پر کام آئے۔ جناب عقیل پر اس اشاریہ کا خاص اثر ہوا اور جس طرح مقصد شہادت کے لئے مولائے کائنات نے حضرت عباسی کو بھیجا کیا تھا۔ جناب عقیل نے حضرت مسلم کو بھیجا کر دیا اور یہ سلسلہ اس طرح قائم ہو گیا کہ واقعہ کر بلا میں جس طرح اولاد علی نے قربانیاں پیش کیں اسی طرح اولاد عقیل کا نام بھی سرفہرست نظر آتا ہے۔

میرے اس دعویٰ کی ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ واقعہ کر بلا میں جناب ام البنین کی اولاد میں چار جوانوں نے قربانیاں پیش کی ہیں۔ عبد اللہ، عثمان، جعفر اور عباس علمدار اور چار ہی کی تعداد اولاد عقیل میں بھی نظر آتی ہے جعفر بن عقیل، عبد الرحمن ابن عقیل، عبد اللہ بن عقیل، موسیٰ بن عقیل۔

امیر المومنین نے جس عظیم مقصد کی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا، جناب عقیل نے اسے باقاعدہ محسوس کر لیا۔ اور پورے طور سے اس جذبہ ایشاد قربانی کے لئے آمادہ ہو گئے

جس قدر ندیے مولائے کائنات نے راہ خدا میں پیش کرنے کے لئے فراہم کئے اسی قدر زندگی حضرت عقیل نے بھی پیش کر دیئے۔

مذکورہ بالا روایت میں مشورہ کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ اس کے بارے میں یہ بحث اٹھائی جائے کہ امام غیر امام سے مشورہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور مشورہ کرنا عدم علم کی دلیل ہے یا تقاضائے مصالح کی؟

مشاورت

دین اسلام کے اجتماعی قوانین میں ایک اہم قانون یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنے دنیاوی معاملات میں استبداد و استقلال سے کام نہیں لینا چاہیئے اور جہاں تک ممکن ہو دوسرے افراد سے مشورہ بھی کرنا چاہیئے۔

مشورہ کے بارے میں کثرت روایات کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ شاید اس طرح پروردگار عالم کسی زبان پر حقیقت کو جاری کر دے اور مشورہ کرنے والا اس "سر بستہ راہ" تک پہنچ جائے۔ جہاں تک اپنی مستقل رائے کا پہنچنا ممکن نہ تھا۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ شریعت اسلام نے استشارہ کو استخارہ پر مقدم کیا ہے اور بندوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ اپنے مالک سے طلبِ خیر کرنے سے پہلے اللہ کے مخلص بندوں سے مشورہ کریں۔

شاید یہ مشورہ انھیں اس صحت مندی تک پہنچا دے جہاں سے صلاح و فلاح کے دروازے کھل جائیں اور استخارہ کی ضرورت نہ رہ جائے۔

نفل و سب کے مزید مسائل کی تحقیق کے لئے میری کتاب "مناہل و فوط :- اور انسان" کا مطالعہ کیا جائے۔

یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ مالک سے طلب خیر کے ممکن ہوتے ہوئے بندوں سے رائے لینے کی ضرورت کیا ہے۔

بہتر یہی تھا کہ بندہ براہ راست مالک سے صلاح و فلاح کا فیصلہ کرا لیتا اور بندہ کو اپنے اسرار پر مطلع نہ ہونے دیتا۔

لیکن اس تو ہم کا واضح حل یہ ہے کہ استخارہ قبیح ہر یا تفادل قرآن حکیم کسی بھی مرحلہ پر مالک کا اُفتاح براہ راست سامنے آکر اپنی رائے نہیں بیان کرتا۔ اس نے ایک طریقہ بتا دیا ہے کہ اس طرح میری رائے دریافت کی جاسکتی ہے۔ اب اگر اس نے شاد کا راستہ بھی بتا دیا ہے تو مشاورت کے نتیجہ میں سامنے آنے والی رائے بھی ایک قسم کے استخارہ ہی کی رائے ہوگی۔ اور زبانِ مومن کو تسبیح کے دانوں ہی کا درجہ دیا جائے گا۔

مشاورت کی یہی اہمیت تھی کہ مالک کا اُفتاح نے خود حضور سرور کائنات کو حکم دیا تھا۔

”شَاوْزْهْمُفِي الْاَمْرِ“

پیغمبر آپ ان لوگوں سے مشورہ کیا کریں۔

ظاہر ہے کہ رسول اکرم اپنے علم کی بناء پر ان کے علم کے محتاج نہ تھے۔ اور نہ اپنے مالک سے اتعال کی بناء پر کسی دوسرے کی رائے کے پابند تھے۔ لیکن اس کے باوجود مالک نے ہی مشورہ کا حکم دے دیا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مشاورت ضروری ہے اور استقلال کسی طرح بھی مالک کو پسند نہیں ہے۔

یہ ادب بات ہے کہ مشاورت کا تعلق دنیاوی امور سے ہے جہاں بندوں کو رائے دینے کا حق ہے اور صاحبِ ضرورت کو رائے لینے کا حق ہے ورنہ ہر مذہب کے

تعلیمات اور دین کے اصول میں کسی مشورہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔

”خلافت و امامت“ دین کا مسئلہ ہے اس میں کسی مشاورت کا گزیر نہیں ہے۔ دوسرے مسائل میں مشاورت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ ایک اجتماعی ضرورت ہے جس کی تکمیل ہر فرد بشر کا فرض ہے۔

یہ سوال ضرور رہ جاتا ہے کہ ایک ”مرکز دینی“ شخصیت کو کسی کے مشورہ کی کیا ضرورت ہے اور اسے اس مشورہ سے کیا حاصل ہوگا۔

لیکن اس کا جواب بھی دو طریقوں سے دیا جاسکتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اشکال مالک کے امتحان اور ابتلاء پر بھی وارد ہو سکتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کا امتحان کیوں لیتا ہے؟

کیا اسے اپنے بندوں کی واقعی حیثیت معلوم نہیں ہے کہ امتحان کے درلیم دریافت کرنا چاہتا ہے۔ یا ان کے حالات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی امتحان مینا چاہتا ہے۔

اگر اس مقام پر یہ فرض کیا جائے کہ مالک حالات سے باخبر ہے لیکن بندوں پر تمام حجت کرنا چاہتا ہے تو نبی اور امام کے مشورہ کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے اور اس مشورہ کا مفہوم بھی یہی ہوگا کہ نبی یا امام امت کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ ایسے اہم مسائل میں تمہارا اندازِ فکر کیا ہے اور نتیجہ میں تمہاری فکر کس قدر صائب و صحیح ثابت ہوتی ہے۔

اس طرح انھیں اپنی صحیح حیثیت کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور اُمنہ بلا سبب دخل در معقولات سے گریز بھی کریں گے۔

اور اگر مالک کے امتحان کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح بندے عمل کی زقارت تیز کر دیں اور وہ تقرب میں قدم آگے بڑھائیں تو نبی اور امام کے مشورہ کی بھی یہی توجیہ کی جاسکتی ہے

کہ یہ اصحاب مشاورت کو اس اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانے کا بہترین ذریعہ ہے جس کے لئے جتنا
معاوضہ مشورہ کروا رہے ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ اگر صاحبِ معارف اور اخلاقی کی یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ جناب امیر
نے اپنے عقد کے بارے میں جناب عقیل کو "نسب قریش" سمجھ کر مشورہ کیا تھا تو کبھی یہ
نیچر کا ناقص غلط ہے کہ جناب عقیل ان حالات کو جناب امیر سے بہتر جانتے تھے اور ان کا
کا علم ایک "عام" امتی کے مقابل میں ناقص یا محدود تھا۔

مشورہ میں تعلیم امت کے علاوہ بھی بہت سے مختلف معارف ہو سکتے ہیں

ان میں سے بعض کی طرف سابقین میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اور ایک اہم معلومت یہ ہے کہ اس
طرح جناب عقیل کے نفس کی بلندگی بھی اندازہ ہو جائے گا کہ انہوں نے فوراً ایک بہادر
خاندان کی خاتون کی طرف اشارہ کر دیا اور یہ نہیں فرمایا کہ بھیا ایسے فرزند کی کیا ضرورت ہے
جس کا انجام شہادت و قربانی ہو؟

جناب عقیل راہِ خدا میں قربانی کی اہمیت کا عملی اعلان کر رہے تھے اور جناب امیر
اس اعلان کی تصدیق و توثیق کر رہے تھے۔

قرآن حکیم نے بھی رسول اکرم کو مشورہ کرنے کا حکم اسی مصلحت کی بنا پر دیا تھا۔
اسی لئے ارشاد ہوتا ہے۔

”فَاِذَا اَخْرَجْتُ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ“

اور جب آپ غم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں۔

مقصود یہ ہے کہ امور دنیا میں مشورہ کرنا ضروری ہے لیکن مشورہ کرنے کا مطلب

یہ نہیں ہے کہ مشیرانِ کار ہی پر اعتماد کیا جائے اور انھیں کی رائے کو حرفِ آخر کا درجہ دیا
جائے۔ آخری غم اپنے انکار و نظریات کی بنا پر ہونا چاہیے اور مقامِ عمل میں رب العالمین
پر اعتماد کرنا چاہیے۔

مشورہ تالیفِ قلب کا بھی کام کرتا ہے اور مافی الضمیر کے اعلان کا بھی۔

مشورہ سے یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ مشیرانِ کار کا ذہنی رجحان کیا ہے
اور وہ مسائل پر کس زاویہ نگاہ سے غور کرتے ہیں۔ زیرِ نظر واقعہ کے بعد جناب مسلم کا وجود
اس بات کا گواہ ہے کہ جناب عقیل کے ذہنی رجحانات وہی تھے جن کی طرف جناب امیر توجہ کرنا
چاہتے تھے۔ یہ ادبات ہے کہ عقیل امامِ وقت نہ تھے۔ ان کے پاس علم غیب نہ تھا۔ وہ مستقبل
میں پیش آنے والے واقعات سے بخوبی آگاہ نہ تھے اس لئے انہوں نے اس عظیم مستقبل کیلئے
از خود کوئی انتظام نہیں کیا اور جیسے ہو کر لائے کائنات نے اس حادثہ عظمیٰ کی طرف توجہ کر
دیا عقیل اس فکر میں پڑ گئے کہ میری طرف سے بھی ایک ہدیہ بارگاہِ احدیت کے لئے ہمایا ہونا
چاہیے اور مجھے بھی راہِ حق میں قربانی کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ یہ مقصود مشورہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے جناب امیر کا
مشورہ کرنا ضروری تھا اور اس سے علمِ امامت پر کوئی حرف نہیں آتا اور نہ اس کا کوئی تعلق جناب
عقیل کی مسئلہٴ انساب میں اعلیت سے ہے۔

”نسلی اثرات“ اس حد تک واضح ہیں کہ ایک زمانہ میں انسان جانور دلی تک کا شجرہ مرتب کیا کرتا تھا۔ اور اس کا خیال تھا کہ اس نسل کا جانور اسیل ہوتا ہے۔ اور اس نسل کا غیر اسیل۔

ظاہر ہے کہ جب حیوانی زندگی میں نسلی اثرات ظاہر ہو سکتے ہیں۔ تو انسانی حیات تو بہر حال ان نتائج کی پابند ہے۔ اور اس میں ان حالات کا پیدا ہو جانا بہر صورت ناگزیر ہے۔

مولائے کائنات نے جناب عقیل سے گفتگو کے دوران انھیں ”نسلی اثرات“ کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ایک بہادر خاندان کی عورت سے عقد کرنا چاہتا ہوں اور جناب عقیل نے اسی نکتہ کی تائید کی تھی کہ عرب میں ام البنین کے بزرگوں سے زیادہ بہادر اور مرد میدان کوئی قبیلہ نہیں ہے۔

ضرورت ہے کہ حضرت عباسؓ کی سیرت مبارکہ پر نظر ڈالنے سے پہلے ان نسلی

یقینہ سے آگے آئیں میں ایک دوسرے کے کفو ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے بعض وجوہ و اسباب کی بناء پر بعض انساب کو بعض پر فضیلت دی ہے اور سادات کو غیر سادات پر مقدم کیا ہے لیکن اس کا تعلق رشتہ ازدواج سے نہیں ہے۔ ازدواج کا سلسلہ اور ہے اور احترام و اعزاز کا سلسلہ اور۔

ازدواج کے لئے اسلام کا ایک قانون ہے۔

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا کفو ہے اس سے زیادہ کسی شے کا مطالبہ صحیح نہیں نسلی امتیاز احترام کی حدود میں درست ہے لیکن اس کے آگے اسلامی آئین کی توہین و تحقیر بن جاتا ہے۔

اثرات“ اور نسبتی شرافتوں کا جائزہ لیا جائے۔ جو عام طور سے انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جن کے لئے خاص طور پر مولائے کائنات نے اہتمام کیا تھا۔

حضرت عباسؓ کا آبائی سلسلہ نہایت درجہ درخشاں ہے۔ آپ حضرت علیؓ کے لال اور حضرت ابوطالبؓ کے پوتے تھے۔ عبدالمطلب کی جان اور ہاشمی خاندان کے چشمہ چراغ تھے۔

یہ سلسلہ نسب آگے بڑھ کر حضرت اسمعیل سے مل جاتا ہے جو اسلامی تاریخ میں ایشاد و فنا اور جذبہ قربانی کی پہلی یادگار ہیں جن کے حصہ میں تعمیر حرم بھی آئی تھی۔ اور قربانی راہ خدا بھی۔

مادر گرامی کی طرف سے بھی آپ کا سلسلہ نسب عرب کے عظیم ترین شجاع و بہادر خاندان سے ملتا ہے۔ ایسا باہمت و جرأت خاندان جس کے ہر شعبہ حیات میں ہمت ہی ہمت ہے اور شجاعت ہی شجاعت۔

دنیا میں کم ایسے اتفاقات ہوئے ہوں گے کہ کسی شخص کے خاندان کے ہر شعبہ میں فضائل ہی فضائل رہے ہوں اور کمالات ہی کمالات کی جلوہ فرمائی رہی ہو۔ جناب عباسؓ کو مالک کائنات نے یہ شرف بطور خاص عنایت فرمایا تھا۔ آپ کے شجرہ نسب میں ہر طرف شجاعت ہی شجاعت تھی۔

باب ————— فاتح اعظم اسلام اور شیر خدا۔ جس کی شان میں فضاے کائنات۔ کافتنی (آل علیؓ) سے گونج رہی تھی۔

۱۶۱۵ ————— ناصر دین حق، محسن رسالت، ابوطالب جس کے وجود اقدس کی ہیبت سے عرب ہزاروں مخالفتوں کے باوجود مرسل اعظم کو نظر بھر کر دیکھنے کی ہمت نہ دیکھتا تھا اور جس کے مرنے کے بعد قدرت نے اپنے حبیب کو وطن چھوڑنے کا حکم دے دیا تھا۔

دادی — اسد کی لاڈلی — فاطمہ — جن کی قوت قلب کا یہ عالم کہ شکم اندرس

میں فرزند۔

وقت ولادت قریب اور خانہ کعبہ کی دیوار شوق ہو رہی ہے۔ مگر قدم پیچھے ہٹانے کے بجائے آگے بڑھتی جا رہی ہیں اور نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ تین دن تک خانہ خدا میں قیام پذیر رہیں۔

مادہ گرامی — فاطمہ بنت حزام بن خالد بن ربیعہ بن الوحید بن کعب

۱۰۔ عمدۃ الطالب میں آپ کا اسم گرامی فاطمہ درج کیا گیا ہے۔ تاریخ الخلفاء نے "والیسی" لکھا ہے۔ ۳۱۷۔ لیکن آپ نے ام البنین کے لقب سے اس قدر شہرت حاصل کر لی ہے کہ اکثر

مورخین کو آپ کا اسم گرامی معلوم نہیں ہو سکا یا ان لوگوں نے اس کا ذکر ضروری نہیں سمجھا۔ چنانچہ حسب ذیل کتب میں آپ کا تذکرہ ام البنین ہی کے نام سے کیا گیا ہے۔ کامل ۳۲۵، مروج الذهب ۳۲۵، الامامۃ والسیاستہ ۲۷۱، مقتل خوارزمی

۲۷۱، سبک الملک الذہب ۶، طبری ۶۶۹، الاخبار الطوال ۳۶۹

کامل السیفہ میں آپ کا اسم گرامی سیلی درج کیا گیا ہے جو عمدۃ الطالب کے نقل کی بناء پر آپ کی والدہ کا اسم گرامی تھا۔

آپ کے پدر بزرگوار کے نام کے بارے میں بھی مورخین میں ایک طرح کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ کامل ابن اثیر، الامامۃ والسیاستہ اور مروج الذهب نے حرام "ر" سے نقل کیا ہے لیکن علامہ مقرر نے کامل کو حرام کے حوالہ میں نقل کیا ہے۔ میں نے طبع بیروت میں بھی یہی دیکھا ہے باقی مورخین نے حرام "ز" سے نقل کیا ہے۔ عمدۃ الطالب قلمی نسخہ میں "حرام رخ" سے درج کیا ہے۔ یہ نسخہ خدائش لائبریری میں موجود ہے۔ علاوہ متقابل الطالبین ابوالفرح اصفہانی۔ تاریخ التواریخ ۳۷۵۔

بن عامر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن معصم بن معاویہ بن بکر بن ہوازن۔

جن کا آبائی سلسلہ حزام سے شروع ہو کر ہوازن تک پہنچتا ہے اور نادری سلسلہ میں حسب ذیل نام آتے ہیں۔

آپ کی والدہ — ثامہ بنت سہیل بن عامر بن مالک بن جعفر بن کلاب۔

ان کی والدہ — عمرہ بنت الطفیل بن مالک الاحزم بن جعفر بن کلاب۔

ان کی والدہ — کیشہ بنت عروہ الرحال بن جعفر بن کلاب۔

ان کی والدہ — ام الحشف بنت ابی معاویہ فارس الہرار بن عبادہ بن عقیل بن کلاب۔

ان کی والدہ — فاطمہ بنت جعفر بن کلاب۔

ان کی والدہ — عاتکہ بنت عبد الشمس بن عبد منان بن قیس۔

ان کی والدہ — آمنہ بنت دہب بن عیمر بن نصر بن قیس بن الحرث بن ثعلبہ بن ذردان بن اسد بن خزیمہ۔

ان کی والدہ — بنت جہدر بن ضبیعہ الاغر بن قیس بن ثعلبہ بن عکابہ ابن

صعب بن علی بن بکر بن دائل بن ربیعہ بن نزار۔

ان کی والدہ — بنت ملک بن قیس بن ثعلبہ۔

ان کی والدہ — بنت ذی الراسین خشیہ بن ابی عصم بن سمح بن فزارہ۔

ان کی والدہ — بنت عمر بن صرمہ بن عوف بن سعد بن ذبیان بن نفیعہ

بن الریش بن غطفان

آپ کے ناہالی بزرگوں میں عامر بن ملک بن جعفر بن کلاب۔ ملاعب الاسنہ کے لقب سے مشہور تھے۔ اور ان کی شجاعت کی وہ دہاک بیٹھی ہوئی تھی کہ ان کو نیزوں سے کھینچنے والا کہا جاتا تھا۔

آپ کی نانی کے بھائی عامر بن الطفیل بن مالک بھی "اشجع عرب" تھے۔ انکی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ قیس ردم کے پاس جب کوئی عرب آتا تھا تو وہ پہلا سوال یہ کرتا تھا کہ تمہارا عامر سے کیا رشتہ ہے؟ اگر کوئی رشتہ نکل آتا تھا تو بے حد احترام کرتا تھا ورنہ قابل توجہ بھی نہیں سمجھتا تھا۔

آپ کے بزرگوں میں ایک نام "عروہ رحال" کا بھی آتا ہے جنہیں رحال اسی وجہ سے کہا جاتا تھا کہ اکثر و بیشتر ان کی آمد و رفت سلاطین اور امراء کے پاس رہا کرتی تھی۔ اور بادشاہان وقت ان کا کافی احترام کیا کرتے تھے۔ انھیں بزرگوں میں طفیل کا نام بھی ہے جو "ملاعب الاسنہ" کے بھائی اور شجاعت و جوانمردی میں شہرہ آفاق تھے۔

لبید شاعر نے انھیں بزرگوں کی مدح میں وہ اشعار کہے ہیں جن کو سن کر نعمان کو خاموش ہو جانا پڑا اور دنیا ئے عرب میں کسی کو اعتراض کرنے کی مجال نہ ہو سکی۔

عقد جناب ام البنین

انفوس کی بات ہے کہ قدیم ترین مورخین نے بہت سے اہم تاریخی واقعات کے ساتھ اس عقد کے تذکرہ کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔

حالانکہ اس کی "انفرادی" نوعیت کا تقاضا تھا کہ اس کے حالات نقل کئے جاتے اور یہ بتایا جاتا کہ امیر المومنین نے ایک "مخصوص" فرزند کی تمنا میں جس عقد کا اہتمام کیا تھا اس کا انداز کیا تھا۔ اور اس عقد کے کیفیات کیا تھے؟ بعض فارسی مقالے نے کسی قدر تفصیل بیان کی ہے۔ لیکن اس کا "تاریخی" ثبوت ملنا مشکل ہے۔

یہ ادبیات ہے کہ بالعیرت انسان حالات و مقدمات کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ جناب امیر نے اس عقد کے لئے کیا اہتمام کیا ہو گا اور جناب ام البنین کا اس مقدس گھر میں کیا کردار رہا ہو گا۔

حالات و کیفیات پر نظر رکھنے والا انسان اس واقعہ کی تقدیر ہی کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جناب ام البنین نے مولائے کائنات کے بیت الشرف میں قدم رکھتے ہی آستان مبارک کو بوسہ دیا اور شہزادوں کی خدمت میں عرض کی میں تمہاری ماں بن کر نہیں آئی ہوں بلکہ ایک خادمہ کی حیثیت سے آئی ہوں۔

اس واقعہ کا عرفانی ثبوت یہ تھا کہ جناب ام البنین مولائے کائنات کے علاوہ مدیقہ طاہرہ کی عظمت سے بھی باخبر تھیں۔

انھیں یہ معلوم تھا کہ فاطمہ اس جلیل القدر خاتون کا نام ہے جس کے عقد کا اہتمام خالق کائنات نے بالائے عرش کیا تھا

اور جس سے ازدواج کی ہر خواہش کو سرکارِ دو عالم نے رد کرتے ہوئے وحی کا یہ فیصلہ سنایا تھا کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی فاطمہؑ کا کوئی کفو نہ ہوتا۔

ایسے مقدس گھرانے میں قدم رکھتے ہوئے یہ احساس ناممکن ہے کہ میں فاطمہؑ زہراؑ ہی کی طرح علیؑ کی ایک زوجہ ہوں۔ یا مجھے ذاتِ عابدہؑ و سبطینؑ کہے جانے کا حق حاصل ہے حاشا دکلا۔

جناب ام البنین کی لمبندی نفس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ ان کے ذہن میں صرف ہی احساس ہو گا کہ اسلام کو ایک مجاہد راہِ خدا کی ضرورت تھی۔ اور اس ضرورت نے مجھے اس آستانہ مقدس تک پہنچا دیا ہے ورنہ کہاں میں۔ اور کہاں بیت زہراؑ؟

حضرت ام البنین کو یہ بھی معلوم تھا کہ مالک کائنات نے شہزادی کوین کو یہ بھی شرف عطا کیا تھا کہ ان کی موجودگی میں مولائے کائنات نے دوسرا عقد نہیں فرمایا اور یہ شرف تاریخ میں صرف دو ہی خواتین کو عطا ہوا ہے ایک جناب فاطمہؑ اور ایک ان کی والدہ گرامی جناب خدیجہؑ

سرد کائنات نے جناب خدیجہؑ کی حیات تک کسی خاتون سے عقد نہیں فرمایا۔ اور مولائے کائنات نے صدیقہ طاہرہ کی زندگی بھر عقد ثانی نہیں فرمایا۔

تاریخ میں یہاں تک ملتا ہے کہ صدیقہ طاہرہ سے عقد کی خواہش حضرات شیخین نے بھی کی تھی اور مرسلِ اعظمؐ نے اسے بھی رد کر دیا تھا۔ موائی محرقہ، تاریخ قمیہ وغیرہ۔

اصول کافی۔ تہذیب شیخ طوسی۔

الہی مصالح کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسلام نے عقد ثانی کو عدالت سے مشروط کیا ہے۔ اور یہ قانون بنایا ہے کہ جب تک تمام ازدواج میں عدالت و الفان مکن نہ ہو ایک عقد کے بعد دوسرا عقد کرنا جائز نہیں ہے۔

عدالت کے حدود کے بارے میں روایات میں جو اشارے ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری سلوک کی برابری تو بہر حال ضروری ہے حتیٰ الامکان یہ سعی بھی ہونی چاہئے کہ قلبی رجحان میں بھی فرق نہ آنے پائے۔

یہ بات صرف ان حدود تک معاف کی جا سکتی ہے جہاں تک اسلام کے احترام و نفائل و کمالات کے قوانین اجازت دیتے ہوں۔ اس کے بعد زوجیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ گھر کا سہانا ماحول "وحشت کردہ" میں تبدیل ہو جائے گا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ سرکارِ دو عالم کسی بھی قیمت پر دیگر ازدواج کو جناب خدیجہؑ کے برابر نہیں قرار دے سکتے تھے۔

خدیجہؑ صرف زوجہ رسول نہیں تھیں کہ انھیں دیگر ازدواج کے برابر قرار دے دیا جائے۔ ان کو کچھ الگ امتیازات حاصل تھے۔

ان کے عقد کی ایک انفرادی شان تھی جس کے بعد نیا ممکن تھا کہ ان کے ساتھ عام خواتین جیسا برتاؤ کیا جائے۔

یہ عدم مساوات کلامِ شریف معاذ اللہ نفس رسول کی کمزوری کی بناء پر نہیں تھا کہ اس کے مقابلہ میں عظمت کو لایا جاسکے۔ اس کی بنیاد نفائل و کمالات کا امتیاز تھا جسے کسی منزل پر نہیں مٹایا جاسکتا تھا۔

خود سرکار کائنات نے بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا جب حضرت عائشہؓ نے لڑکا کو آپ ایک ضعیف عورت کو برابر یاد کئے جا رہے ہیں۔ مالک نے آپ کو اس سے بہتر ازدواج

عطا کر دی ہیں۔ تو آپ نے غضبناک ہو کر فرمایا تھا۔
خدیجہ کے برابر کون ہو سکتا ہے۔ وہ اس وقت ایمان لائیں جب کوئی ایمان لانے
والا نہ تھا۔ انھوں نے اس وقت میری تصدیق کی اور اپنے اموال سے میری مدد کی جب کوئی
سہارا دینے والا نہ تھا۔

ان کے ذریعہ مالک نے مجھے اس وقت صاحب اولاد بنایا جب لوگ اتر کے لٹنے
دے رہے تھے۔ کسی اور خاتون کی یہ شرف حاصل نہیں ہے۔
خدیجہ بنیاد کوثر ہیں، خدیجہ جواب طعنہ اتر ہیں۔ خدیجہ کے ازدواج میں کسی
مصلحت و سیاست کا امکان نہیں ہے۔ خدیجہ کی زندگی پر کسی حریف و طمع کا الزام نہیں
ہے۔ خدیجہ نے سماجی بندھنوں کو توڑ کر عقد کیا ہے۔ خدیجہ نے رسم و رواج پر ضرب
کاری لگا کر پیغمبری مشن کو تقویت پہنچائی ہے۔ خدیجہ نے دولت کو فضائل کا احترام
سکھایا ہے۔ خدیجہ نے مال و علم کی قدر و قیمت کو واضح کیا ہے۔
خدیجہ کے عہدہ کسی خاتون کے عقد کو یہ امتیازات حاصل نہیں ہیں۔ قدرت
نے بھی نہیں چاہا کہ خدیجہ کی انفرادی شخصیت پر حرف آنے پائے اس لئے اس وقت
میک اپنے حبیب کو دوسرے عقد کی اجازت نہیں دی جب تک خدیجہ کو اس دنیا سے
اٹھا نہیں لیا۔

جناب فاطمہ زہرا کے عقد کی مصلحت اور بھی زیادہ واضح ہے کہ جب قدرت
خدیجہ جیسی غیر معصومہ سہتی کی محبت میں دوسری خاتون کو شریک نہیں بنا سکتی اور اس
کے مراتب و مناصب کا اس انداز سے تحفظ کرنا چاہتی ہے تو فاطمہ تو بہر حال معصومہ
ہیں۔ ان کے مقابلہ میں کسی دوسری خاتون کے آنے کا کیا سوال پیدا
ہوتا ہے۔

یہ کائنات کا اول و آخر عقد ہے جو اس نوعیت سے واقع ہوا ہے۔

دو نہ ہر عقد میں ایک ہی فریق معصوم ہوا ہے اور دوسرے فریق کو درجہ عصمت حاصل
نہیں رہا ہے۔ یہ صرن عقد زہرا و علی کا امتیاز ہے کہ نہ ہر بھی معصوم ہے۔ اور
درجہ بھی معصومہ۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ کائنات کا ہر عقد روئے زمین پر ہوا ہے لیکن عقد
زہرا عرش اعظم پر کیا گیا ہے۔

غیر معصوم کا عقد زمین پر ہو گا تو جب طرفین معصوم ہوں گے تو عقد کا ہر اہتمام
بھی مالک کائنات کی طرف سے کیا جائے گا۔

ایسے حالات کو پیش نظر رکھنے کے بعد حبیب ام البنین کے بارے میں یہ تصور بھی
نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے کو ازدواجیت کے اعتبار سے جناب فاطمہ کے برابر سمجھتی ہیں
اور نہ ہر امر ضیہ کے بیت، شرف کو اپنا امتیاز ازدواجیت سے تصور کرتی ہوں۔ یا ان کے شہزادوں
کے لئے اپنے کو مال کا درجہ دیتی ہوں۔

ام البنین عرفان کامل کی منزل پر فائز تھیں۔ ان سے عقد ایک اہم مصلحت کے
تحت ہوا تھا۔ ان کے بارے میں اعزاز و احترام بیت رسالت کا جو تصور بھی قائم
کیا جائے وہ کم ہے۔

تاریخ کے واقعات ان واقعات کی شہادت دیں یا خاموش رہ جائیں حقیقت
خود اپنی ایک زبان رکھتی ہے۔

بیت رسول کے بعد

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مولائے کائنات نے جس قدر بھی عقد فرمائے ہیں
سب کا سلسلہ صدیقہ طائرہ کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ارباب تاریخ میں اس
مسئلہ میں ضرور اختلاف ہے کہ معصومہ عالم کے بعد آپ نے سب سے پہلے کسی خاتون سے

سے عقد فرمایا ہے۔

ابوالفداء ص ۱۹ کا بیان ہے۔

”ثم بعد موت فاطمة تزوج ام البنین بنت

حزام الکلابیہ و تزوج علیٰ ایضا اماءہ

بنت ابی العاص بن الربیع و امہا زینب بنت

رسول اللہ“

جناب فاطمہ کے انتقال کے بعد آپ نے ام البنین سے عقد فرمایا

اس کے علاوہ امام سے بھی عقد فرمایا جن کی ماں زینب (رضیہ) بنت

رسول تھیں۔

کمال ابن اثیر ص ۳۲ کی عبارت ہے :-

”ثم تزوج بعدھا ام البنین بنت حزام الکلابیہ

فولدت له العباس وجعفر وعبد اللہ وعثمان ...“

و تزوج علیٰ امامہ بنت ابی العاص“

جناب فاطمہ کے بعد آپ نے ام البنین سے عقد فرمایا جن سے عباس،

جعفر، عبد اللہ اور عثمان پیدا ہوئے۔ اور آپ نے امامہ

بنت ابی العاص سے بھی عقد فرمایا۔

اس کے خلاف مطالب السؤل فی مناقب آل الرسول کمال الدین محمد بن طلحہ اشافہ

ص ۲۱۶ کی عبارت یہ ہے۔

”وکان یوم قتله عندہ اربع حواثر فی نکاحه و

ثم امامہ بنت ابی العاص بنت بنت رسول اللہ تزوجھا

بعد موت خالتھا البتول فاطمہ“

آپ کی شہادت کے دن آپ کی زوجیت میں چار عورتیں تھیں۔ امامہ بنت

ابی العاص جن سے ان کی خالہ جناب فاطمہ کے انتقال کے بعد

عقد فرمایا تھا۔

بعینہ یہی عبارت کشف الغمہ ابوالحسن علی بن السعید فخر الدین عیسیٰ اللاری کی

ہے ص ۴۳

ابن صباغ مالکی نے فصول جہم میں بھی یہی عبارت درج کی ہے ص ۸۲ مخطوطہ

خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

مشکل یہ ہے کہ پہلی روایت ابن اثیر کے دور سے شروع ہوئی ہے جس کا سن

وفات ۶۳۰ھ ہے اور دوسری روایت محمد طلحہ شافعی کی ہے جن کا سن وفات ۱۱۵۲ھ

ہے۔

یعنی درلونی تقریباً ہم عصر ہیں۔ اور ایسے حالات میں تاریخ کی قدامت کی بنا پر

کوئی فیصلہ ممکن نہیں ہے۔

صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے دیگر قرآن کا سہارا لینا پڑے گا۔

اور قرآن کا تقاضا یہی ہے کہ جناب امامہ کے عقد کو سابق مانا جائے۔ اس کے دو اہم

شواہد ہیں۔

پہلا شاہد یہ ہے کہ جناب امامہ سے عقد کے بارے میں خود صدیقہ طاہرہ نے

وصیت کی تھی اور آپ نے فرمایا تھا کہ اگر میرے بعد عقد ثانی کیے گا تو امامہ سے کیے

گا۔ وہ میرے بچوں کا زیادہ خیال رکھتی ہے۔

اب یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ مولائے کائنات صدیقہ طاہرہ کی وصیت کے

باجور امام حسن و حسین کے تحفظ اور ان کی خدمت سے بے نیاز ہو کر ”قدیہ حسین“ کی فکر

میں مصروف ہو جائیں۔

الجعفری کی "امین الشیعہ" کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۴۲
شعبان ہے۔

مورخ یگانہ برادر مختصراً مولانا نجم الحسن طاب ثراہ کراردی نے مختلف حوالوں سے مختلف
تاریخیں درج کی ہیں۔

۱۔ ۱۹ جمادی الاولیٰ یا ۱۸ رجب بحوالہ جواہر زواید قلی (یہ حقیر کے جد اجداد کا تلمیذ رسالہ
ہے جو غریب خانہ پر محفوظ ہے۔ اس کے مندرجات کے استناد کا کوئی علم نہیں ہے یہ
احتمال ضرور ہے کہ جد مرحوم حضرت آیتہ اللہ مولانا السید عبد حسین طاب ثراہ کے محرم
فتادی تھے۔ لہذا ممکن ہے کہ آپ نے یہ معلومات انھیں مرحوم سے
حاصل کئے ہوں۔ (جواہر زواید)

۲۔ ۲۶ جمادی الثانیہ مولانا سلیم جردلی بحوالہ خرق القوار۔

۳۔ ۱۸ رجب بحوالہ آئینہ تصوف طبع رام پور۔ ۱۳۱۱ھ

برادر محترم طاب ثراہ نے ان اقوال پر دو امتیاز انداز کی بحث کی ہے۔ لیکن اس روایت
سے پہلے روایت کے اسلوب پر بھی نظر کرنا ضروری ہے۔

یہ اقوال جن کتابوں سے نقل کئے گئے ہیں ان میں سے کسی کا زمانہ تالیف چودھویں
صدی سے آگے کا نہیں ہے۔

۴۔ شعبان کی روایت امین الشیعہ کی ہے جسے اس کے مولف نے یکم شعبان ۱۲۲۲ھ
کو سلطان فتح علی شاہ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا تھا۔

یعنی اس کا زمانہ تالیف تیسری صدی ہجری کے نصف سے پہلے کا ہے۔ اس
لئے ان ماخذ میں اس کتاب کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اور وہ نسبتاً زیادہ معتبر
کہی جاسکتی ہے۔

اس کے علاوہ قدیم ماخذ میں ذکر نہ ہونے کی بنا پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ان میں

سے کسی بزرگ نے بھی کوئی قول کسی کتاب سے اخذ کیا ہوگا۔ زیادہ احتمال یہی ہے کہ یہ سب اور بطور
علم سینہ منتقل ہوئے تھے۔ اور علم سینہ میں ان روایات کی قدر و قیمت زیادہ ہے جن کا تعلق
اس مقدس سرزمین سے ہو جہاں یہ ماتاب وقار و روشن دامنہ ہوا تھا۔

نصف اشرف وغیرہ میں ولادت کی تاریخ ۴۲ شعبان ہی مانی جاتی ہے اس لئے احتمال
قریب یہی ہے کہ یہ قول مطابق واقع ہو۔ اس کی ایک معنوی مناسبت بھی ہے جو اہتمام
قدرت کے لحاظ سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کہ میری شعبان کو امام حسین کی
ولادت ہوئی ہے تو بہت ممکن ہے کہ چوتھی شعبان کو حضرت عباس کی تاریخ ولادت کیلئے
منتخب کیا گیا ہو تاکہ میر کا درواں آگے آگے رہے اور فنا شعار "تاریخی اعتبار سے" اس
کے نقش قدم پر چلتا رہے۔

ادوار حیات

ماریخی واقعات کے اعتبار سے جناب عباس کی زندگی کو تین حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ایک وہ حصہ جو آپ نے پدر بزرگوار کے زیر سایہ گزارا ہے۔ اور جو ۲۶ھ سے شروع ہو کر ۳۶ھ پر تمام ہوتا ہے یعنی تقریباً ۱۴ سال۔ دوسرا وہ حصہ جو جناب امیر کی شہادت سے شروع ہوتا ہے جس میں آپ امام حسنؑ کے زیر سایہ تھے۔ یہ زمانہ ۳۶ھ پر تمام ہوتا ہے۔ اور اس کی کل میعاد ۱۴ سال ہے۔ تیسرا وہ حصہ جس کا سلسلہ شہادۃت امام حسنؑ سے شروع ہو کر گریلا پر تمام ہوتا ہے جس کی میعاد ۱۴ سال ہے جس میں آپ نے امام حسینؑ کے زیر سایہ زندگی گزارا ہے۔

داخلہ لفظوں میں یوں کہا جائے کہ شہور کی ابتدائی منزلیں باپ کے زیر سایہ طے کی ہیں۔ اور دونوں بھائیوں کے دور امامت میں زندگی کے باقی مراحل طے ہوئے ہیں۔

کسی شخص کے حالات پر نظر کرنے کے لئے اس نکتہ کا پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس نے کس دور میں اپنے بزرگ سے کیا لیا؟ اور اس کے بزرگوں نے اس کی تربیت پر کس قدر توجہ فرمائی۔

حضرت عباسؑ کے حالات کو سمجھنے کے لئے بھی یہ یاد رکھنا پڑے گا کہ مولائے کائنات نے آپ کی تربیت عام بچوں کی طرح نہیں فرمائی۔ آپ کی حیثیت صرف ایک فرزند کی سی نہیں تھی جو ماں باپ کی آغوش تربیت میں پروردان چڑھا کرتا ہے۔

آپ کا وجود ایک مقصدی وجود تھا جسے مقصد سے قریب تر بنانے کے لئے جس قدر بھی اہتمام ضروری تھا اس کا برتنا مولائے کائنات کا "فرضِ تمنا" تھا۔ اور آپ کسی وقت بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہو سکتے تھے۔

فارسی اور اردو کے مقابل میں جو چھوٹے چھوٹے واقعات ملتے ہیں۔

ان کا قدیم "تاریخی" ماخذ طے یا نہ ملے۔ ان کی صحت کا تفصیل کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ اگر ان کا تعلق غیر معمولی شفقت و محبت اور بلند ترین انداز تربیت سے ہے تو ان کی صحت قطعی ہے۔ اور اگر اس کے سوا کوئی معمولی اور عادی بات ہے تو اس کے لئے مدد بھی تلاش کرنا ہوگا۔ اور اس کے توہمات پر بھی غور کرنا پڑیگا۔ صاحب "ریاض القدس" کے یہ تفصیلات قرین قیاس ہیں کہ حضرت عباسؑ نے ولادت کے بعد سب سے پہلے مسجد خالق میں رکھا۔ آپ نے پہلی نظر امام حسینؑ کے چہرہ اقدس پر ڈالی۔

امام حسینؑ نے اپنی زبان اقدس آپ کے دہن مبارک میں دی اور اسی کو آپ کی غذا بنایا۔

آپ نے مولائے غیر معمولی محبت کا اظہار کیا۔

آپ کے بچپنے کا ہر انداز امام حسینؑ کے سامنے غلامانہ انداز رکھتا تھا۔
 آپ کے تیرہ عام بچوں سے قطعی مختلف تھے۔ اس لئے کہ یہ تمام باتیں
 حضرت عباسؑ کے امتیازی اور مقصدی وجود کے شایان شان ہیں۔ اور ان کا ہر نام ہر اس
 وجود کے لئے ضروری ہے جس کی تخلیق کے لئے اس قدر غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہو

دورِ اول

درِ اشی صفت

حضرت عباسؑ کو ان کے بزرگوں سے کیا ملا؟ اس عنوان کے تفصیلات کے لئے
 بڑا وقت اور کافی طویل بحث درکار ہے۔
 مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عباسؑ کی درِ اشی جبرأت و شجاعت پر
 امیر المومنینؑ کا حسن انتخاب خود ہی ایک سند ہے۔
 عباسؑ بہادر نہ ہوتے تو جناب عقیل کی جستجو بیکار قرار پا جاتی۔ عباسؑ شجاع نہ ہوتے
 تو امیر المومنینؑ کا انتخاب بے معنی ہو جاتا۔
 بہادر بیٹے کی تمنا میں عقد کرنا اس بات کی سند ہے کہ اس عقد کے بعد جو فرزند
 پیدا ہو گا وہ یقیناً شجاع اور دلیر ہو گا۔ تاریخ کا تقریباً اتفاق ہے کہ جناب ام المومنینؑ
 کی اولاد میں سب سے پہلے فرزند جناب عباسؑ ہی تھے۔

صاحب عمدۃ المطالب احمد بن علی ہمنائے یہ بحث ضرور اٹھائی ہے کہ عباس اور عمر بن علی میں کون بزرگ تھا۔ اور کون خرد۔ لیکن یہ بحث برائے بحث ہے۔ اور بابت تاریخ کا اتفاق ہے کہ عباس اولاد جناب ام البنین میں سب سے بزرگ تھے اور حضرت عمر بن علی یقیناً ان سے چھوٹے تھے۔

غالباً اسی درشتی شجاعت کا اثر تھا کہ ولادت کے بعد ہی آپ کا نام "عباس" رکھا گیا۔ جو شیر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور مولائے کائنات سے ایک خاص مناسبت بھی رکھتا ہے۔ آپ کا پہلا نام "حیدر" تھا جو شیر کا ایک نام ہے اور پھر کہا گیا ہے کہ

کون نہ عباس ہوتے مثل علیؑ

شیر کا بچہ شیر ہوتا ہے

شجاعت و ہمت کے علاوہ جو اوصاف آپ کو بطور وراثت ملے تھے انکی طرف ایک اجمالی اشارہ امام جعفر صادق نے ابو حمزہ ثمالی کی روایت میں "زیارت حضرت ابو الفضل" کے ذیل میں فرمایا ہے۔

"السلام علیک یا بن اول القوم اسلا ما اقد مہم

ایمانا و اقوہم بدین اللہ و احوطہم علی الاسلام"

سلام ہو آپ پر اے علیؑ کے فرزند! جو اسلام میں ساری قوم

سے اول۔ ایمان میں سب سے مقدم۔ دین الہی میں سب سے زیادہ

مستقیم اور اسلام کے سب سے بڑے محافظ تھے۔

مقام تقارن میں مولائے کائنات کے ان اوصاف کا شمار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ صادق آل محمدؑ کی نگاہ میں عباس ان تمام صفات کے حامل تھے اور ان کو یہ تمام کمالات بطور وراثت حاصل ہوئے تھے۔

کمال ایمان

حضرت عباسؑ کا اسلام عام امت کے اسلام سے جداگانہ ان کی شان استقامت منفرد اور ان کا تحفظ اسلام کا جذبہ قطعاً غیر معمولی تھا۔

مسلمان تاریخ میں ان مسائل کے شواہد نہ بھی مل سکیں تو صادق آل محمدؑ کا ارشاد گرامی ایک مستقل شاہد ہے۔ جو تاریخ کی غفلت و خیانت سے پردہ اٹھا رہا ہے اور دنیا کو متوجہ کر رہا ہے کہ تاریخ نے اسلام کے عظیم ترین کرداروں کے سلسلے میں کس قدر لاپرواہی سے کام لیا ہے۔

آپ کے اسلام دایان کے بارے میں ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ کسی کے زمانے میں ایک مرتبہ آپ مولائے کائنات کے زانو پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے زانو پر زینب تھیں۔ ایک مرتبہ مولانا اپنے عزیز فرزند کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ بیٹا عباس! کہو ایک۔

داغ رہے کہ اس روایت میں زینب سے مراد جناب زینب نہیں ہیں۔ ان کی ولادت ۳۵ھ میں ہوئی ہے اور وہ جناب عباس سے تقریباً ۲۱ سال بڑی تھیں۔ ان کے بارے میں یہ تصور بھی ناممکن ہے کہ جس وقت عباسؑ ایک زانو پر رہے ہوں گے اس وقت زینب دوسرے زانو پر رہی ہوں گی۔

زینب سے مراد زینب مغربی ہیں جو جناب امیر کی دوسری صاحبزادی تھیں۔ علامہ بیہ الدین شہرستانی کا بیان ہے کہ جناب امیر کی تین بیٹیوں کا نام زینب تھا اور سب کی کنیت ام کلثوم تھی۔ نہفستہ الحسین۔

اس کے بعد آپ جو فیصلہ کر دیں اس کے خلاف اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور مکمل طور پر اپنے کو مالک کے سپرد کر دیں۔

آیت مبارکہ صفات ظاہر ہوتا ہے کہ منزل تسلیم پر فائز ہونے والے کو جذبات و رجحانات کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اور نفس کو اتنا طاہر و اظہر بنانا پڑتا ہے کہ فیصلہ نبوت کے بعد چون و چرا کیا تنگی دل کا بھی احساس نہ ہو۔

مگر بلا کی تاریخ میں حضرت عباسؓ کی شان تسلیم اسی انداز کی ہے۔ آپ نے اپنے جذبات، احساسات، خیالات اور رجحانات کو اس طرح امام معصوم کا تابع فرمان بنا دیا تھا کہ کسی منزل پر کبھی کوئی تنگی محسوس نہیں کی اور ہر منزل پر راضی برضا رہے۔ ایک شجاع و بہادر کے لئے محبت و غیرت کی عظیم قربانی ہے کہ اس کے یغصے دیا کے کنارے سے ہٹ جائیں۔

فوج دشمن کے لئے یہ نامکن تھا کہ شدید جنگ اور عظیم خونریزی کے بغیر امام حسینؑ کے خیام کو فرات کے کنارے سے ہٹا دے۔ علیؑ کے شیر کی شجاعت و ہمت آواز دے رہی تھی کہ کربلا کا واقعہ دسویں محرم کے بجائے تیسری محرم ہی کو پیش آئے گا۔

لیکن عباسؓ کے کردار نے واضح کر دیا کہ عقل کے فیصلے سے ہٹ کر قوت کا اظہار کرنا جرات ہے اور نفس کو قابو میں لانے کے بعد اقدام کرنا شجاعت ہے۔ عباسؓ جبری نہیں بے شجاع ہے اس کی طاقت پر خواہشات کی حکومت نہیں ہے مرضی مولیٰ کا پہرہ ہے۔

دنیا کی کوئی طاقت نہیں تھی جو ان خیام کو فرات کے کنارے سے ہٹا دیتی یا منزل تسلیم ہی کا کرشمہ تھا کہ عباسؓ نے خود اپنے ہاتھ سے نیچے ہٹا دیئے اور نہایت صبر و سکون کے ساتھ فرات کا کنارہ چھوڑ دیا۔

فرات کا کنارہ چھوٹ گیا لیکن تسلیم کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ شیر الجلال کا کردار آج بھی آواز دے رہا ہے کہ تسلیم کی منزل والے عصمت کے فیصلے کے مقابلہ میں جذبات کا لحاظ نہیں کرتے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ دوسرا وقت وہ آیا جب عاشورہ کی رات شمر ملعون نے اپنے بھانجوں کے آواز دی اور حضرت سے خفیہ گفتگو کرنا چاہی۔

ایک وفادار سپاہی اور "مقصود کر بلا" مجاہد کے لئے یہ بات سخت ناگوار تھی کہ وہ اپنے آقا کے پاس سے ہٹ کر دشمن سے مخفی گفتگو ہو جائے اور اس کی کسی قسم کی بات پر کان دھرے۔ شمر کے لئے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک لمحہ فرصت پا کر عباسؓ سے کوئی گفتگو کر سکتا۔ یہ ادائے تسلیم ہی کی عبوری تھی کہ جیسے ہی امام حسینؑ نے حکم دیا۔ "بھیا! تم کو اس کی بات سن لینا چاہیئے۔"

جناب عباسؓ فوراً ہی شمر کی طرف بڑھ گئے اور نہایت ہی سکون و اطمینان کے ساتھ اس کی گفتگو سن لی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد جواب دہی دیا جو ایک بہادر سپاہی اور وفادار جاں باز کے شایان شان تھا۔

اس سے زیادہ نازک موقع اس وقت آیا جب خود شیر حیدر کرار نے آکر مولا سے یہ عرض کی تھی کہ مولا اب نفس تنگی کر رہے ہیں اور دشمنوں کے طعنے سنے نہیں جا رہے ہیں۔ اجازت دے دیجئے تو میں انھیں تباہ کر دوں کہ آپ کے ایک ایک بہادر غلام کے دست و بازو میں کتنی طاقت ہے اور میرا مولا مجبور دے بس نہیں ہے۔

موقع تھا اور نہایت حسین موقع تھا کہ امام مظلوم اجازت دے دیتے اور عباسؓ فیر و خندق کی تاریخ کو دہرا دیتے۔

دشمن اپنے کیفر کرار کو پہنچ جاتا اور حیدر کرار کا لالہ کربلا کے پورے میدان پر بھنک کر لیتا۔

لیکن اللہ سے مجبوری :- کہ امام حسینؑ نے جنگ کی اجازت دینے کے بجائے شکست
 سکینہ کی ذمہ داری سپرد کر دی اور فرمایا۔ ”بھئی! بچوں کے لئے پانی کا انتظام کرو۔“
 دنیا کا دوسرا کوئی بہادر ہوتا تو مشکیزہ کو محفوظ کر کے رکھ لیتا اور دشمنوں کو ان کے
 طعنوں کا مزہ چکھا دیتا لیکن یہ منزل تسلیم کے راہرو عباؑ کا معاملہ ہے کہ شیر نے آقا کا حکم
 پاتے ہی ایک طرف مشکیزہ سکینہ سنبھالا تو دوسری طرف تلوار اٹھا کر رکھ دی۔
 دنیا دیکھ لے کہ تسلیم و سپردگی داہوں کا کردار کیا ہے۔ اور وہ مولا کا حکم پانے کے
 بعد کس خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے جذبات کو پامال کر دیا کرتے ہیں۔
 تصدیق کے بارے میں حضرت امیر المومنینؑ ”نجی البلاغہ“ میں ارشاد
 فرماتے ہیں۔

”اول الدین معرفتہ وکمال معرفتہ التصدیق
 بہ۔“

دین کی ابتداء معرفت سے ہے اور معرفت کا کمال تصدیق
 الوہیت ہے۔

حضرت عباسؑ کی منزل تصدیق شاید ہے کہ آپ صریح عارف الہی نہیں بلکہ کمال
 عرفان کے درجہ پر فائز تھے۔

علمائے اسلام کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ عرفان کی ذمہ داریوں کا آغاز
 کس عمر سے ہوتا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ وجہ ہر عرفان بھی دیگر احکام شریعت کی طرح بلوغ
 سے متعلق ہوتا ہے اور اس سے پہلے نہ واجبات و محرمات کی ذمہ داریاں عائد ہوتی
 اور نہ عرفان دایمان کی۔

لیکن بعض حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ عرفان کا مسئلہ احکام شرعیہ سے بالکل مختلف

ہے۔

احکام کا تعلق عمل سے ہوتا ہے۔ اس میں بلوغ وغیرہ کی قید لگائی جاسکتی ہے۔
 لیکن عرفان کا تعلق عمل سے نہیں ہے۔ اس کا ربط براہ راست انسانی عقل و شعور
 سے ہے۔

جس وقت بھی انسان میں عقل و شعور کا کمال پیدا ہو جائے گا اس کا عرفان قابل
 قبول سمجھا جائے گا۔ اور اسے وہی درجہ دیا جائے گا جو ایک کامل العقل عارف کے
 عرفان کا ہوتا ہے۔

یہ تحقیق قرین عقل بھی ہے اور مطابق آیات و احادیث بھی۔ تفصیل
 کا محل نہیں ہے لیکن جناب اسمعیل کے لئے منزل اسلام کا اعلان اور جناب ابراہیم کی
 طرف سے امت مسلمہ کو دعا گوہ ہے کہ عرفان دایمان کے لئے سن و سال کی قید
 نہیں ہے۔

یہ اور بات ہے کہ فہم و ادراک بہر حال ایک سن و سال اور عمر کے محتاج ہیں
 خواہ کتنی ہی مختصر عمر کیوں نہ ہو۔

ادراک اپنی منزل طے کرنے کے لئے ایک وقت چاہتا ہے اور شعور اپنے کمال
 کے لئے ایک زمانہ چاہتا ہے۔

لیکن تاریخ میں کچھ ایسے بھی بندے نظر آتے ہیں جن کا عرفان اول وجود ہی سے
 کامل تھا۔ اور انھوں نے ولادت کے ساتھ ہی بارگاہ احدیت میں سر تسلیم خم کر کے رہتا
 دیا تھا کہ ہم معصوم اور صاحب منصب بندے ہیں۔ ہمارے علاوہ دوسرے بندوں میں
 یہ شان نظر آنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

مشکل اس لئے کہا جاتا ہے کہ فیضان الہی کی کوئی حد نہیں ہے اور بندے کے
 ظرف صلاحیت کی کوئی تحدید نہیں کی جاسکتی۔ ایسے بندے بہر حال پیدا ہو سکتے ہیں

جنہیں مالک ابتداء سے شعور کامل اور ادراک تام عطا کر دے اور وہ بے پناہ صلاحیت کے مالک ہوں۔

ایسے بلند و بالا بندوں کو صاحبان منصب سے الگ کرنے کا ایک ہی معیار ہے کہ صاحبان منصب آغاز عمر سے فرداء دین اور احکام شرعیہ کے کبھی مکلف نہ ہو سکتے ہیں۔ ان پر اکثر شرعی ذمہ داریاں بھی عائد ہو سکتی ہیں جیسا کہ جناب موسیٰ کے بارے میں قرآن مجید کا اعلان ہے۔

”وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ“

(ہم نے موسیٰ پر درودہ پلانے والی عورتوں کا درودہ پہننے ہی سے

حرام کر دیا تھا۔

حرام و حلال کا تعلق احکام سے ہے عقائد و عرفان سے نہیں اور تدریس نے جناب موسیٰ کے لئے اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ غیر منصب دار کسی قدر کمال عرفان کا حامل کیوں نہ ہو جائے۔ قدرت اشیاء احکام کی ذمہ داریاں عائد نہیں کرتی۔ اور صاحب منصب کتنا ہی کمسن کیوں نہ ہو اس پر یہ ذمہ داریاں عائد کی جاسکتی ہیں۔

جناب عباس کا شمار تاریخ کی انہیں منفرد شخصیتوں میں ہے جنہیں مالک نے روز اول سے کمال عرفان کا حامل بنایا تھا۔ اور شعور کامل دے کر دنیا میں بھیجا تھا تصدیق کے ان مراتب کو سامنے رکھنے کے بعد معصوم کی گواہی کی روشنی میں اس واقعہ کی خود بخود تصدیق ہو جاتی ہے کہ عباس نے باپ کی آغوش میں بیٹھ کر ایک کے بعد دیکھنے کی جرات نہیں کی تھی۔

عاقبہ کا لال دنیا کو آواز دے رہا تھا کہ اگر تم نے میرے بابا سے کمال معرفت کی منزل سنی ہے اور ان کا کسی قدر عرفان حاصل کیا ہے تو اب بابا ہی کی زبان سے میرے

بچپنے کا حال سناؤ اور اس کے بعد تصدیق کر دو کہ اللہ کے وہ مخلوق بندے کیسے ہوتے ہیں جو آغاز خلقت سے ہی کمال عرفان کی منزل پر فائز ہوتے ہیں۔

اور پھر ان کا مولا کیسا ہو گا جس کی غلامی کا اعلان کرنا دوا اپنی تسلیم و تصدیق کا اہم فرق سمجھتے ہیں۔

دفا

ام البنین کے لال اور حیدر کرار کے تحت جگر نے اپنے جملہ کمالات و کرامات میں جس قدر شہرت و فناء کے سلسلے میں حاصل کی ہے شاید ہی دنیا میں کسی دفا دار کو یہ منزل نصیب ہوئی ہو۔

آج جب کبھی دفا کا نام زبان پر آتا ہے تو سب سے پہلے عباس کا تفسیر و تفسیر ہیں پورا بھرتا ہے۔ اور جب بھی عباس کا ذکر آتا ہے تو دفا کی تقویٰ رنگا ہوں میں پھرنے لگتی ہے۔

جب زباں پر کبھی آتا ہے نام عباس
دیر تک ہر ٹول سے خوشبوئے دفا آتی ہے

جواری

قریبی ہاشم کو یہ وصف بھی بزرگوں سے درانت میں ملا تھا اور اس کا سلسلہ بھی تالانخ میں بہت دور تک پیچھا ہوا ہے۔

قرآن مجید نے آپ کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم کا تذکرہ کیا ہے تو اسی کمال دفا کے ساتھ۔

”وَابْرَاهِيمَ الَّذِي دَقَّى“

ایک انصاف ان حقائق کی خیر نہیں ہے جو دفا دار ابراہیم کے

صحیفہ میں ہیں۔

جناب ابراہیمؑ کے بعد یہ سلسلہ حضرت اسماعیلؑ کے ذریعہ آگے بڑھا جن کے بارے میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

”واذکرت فی الکتاب اسماعیل انہ کان صادق الوعد
دکان رسولاً نبیاً۔“

(اسماعیل کا ذکر جو صادق الوعد اور اللہ کے پیغمبر تھے)

جناب اسماعیلؑ کے بعد تاریخ میں جن افراد کا تذکرہ ملتا ہے ان کی وفاداری کے آثار بھی جا بجا نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

آخر امر میں یہ سلسلہ جناب ابوطالب تک پہنچتا ہے۔ آپ کا اسم گرامی دنیا کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔ ایک دن اپنے بھتیجے سے کہہ دیا تھا کہ تم توحید و رسالت کا اعلان کرو۔ میں تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں تو میٹوں کو قتل گاہ میں لٹا دیا پڑا۔ درختوں سے پتے چھینا پڑے۔ مشرکین عرب سے شدید دشمنی مول لینا پڑی۔ ہمیشہ کے لئے اپنی اولاد و ذریت کو محل خطر میں ڈالنا پڑا۔ لیکن اپنے وعدے سے سرسرا کر ہٹ کر نہیں گیا۔ اور آخر وقت تک اپنے عہد کو اس شان سے نباتتے رہے کہ آپ کی زندگی تک مرسل اعظم نہایت ہی سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے وطن عزیز میں قیام پذیر رہے اور آپ کے سایہ عاطفت کے اٹھتے ہی مالک کائنات نے حکم دے دیا۔
”میرے حبیب! اب مگر رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ آپ مدینہ کی طرف ہجرت کو جائیں۔“

تاریخ اسلام میں ہجرت کا واقعہ ایک طرف علیؑ کی جان شاری کی علامت ہے تو دوسری طرف ابوطالب کی ان قربانیوں کی بھی یادگار ہے جن کے ہوتے ہوئے مرسل اعظمؐ کو وطن عزیز نہیں چھوڑنا پڑا تھا۔

اسلام کی تاریخ ہی پر منحصر نہیں ہے۔ اسلام کے اعلان سے پہلے جب جناب عبدالمطلب کے انتقال کے وقت جناب ابوطالب نے پیغمبر اکرمؐ کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ اور یہ کہہ دیا تھا کہ اس کی نگہداشت میرے حوالے ہے۔

عرب نے ہر اسکائی کوشش کی کہ ابوطالب بھتیجے کا ساتھ چھوڑ دیں اور آپ کو قوم کے حوالے کر دیں۔ لیکن آپ راضی نہیں ہوئے اور ہجوم معائب میں اپنے بھتیجے کا تحفظ کرتے رہے۔

اپنے بچوں کو فاقے کرائے لیکن بھتیجے کو فاقہ نہیں کرنے دیا۔ اپنے بچوں کو جدا کیا لیکن خدا کے رسول کو اپنے سے جدا نہیں ہونے دیا۔ اپنے گھرانے پر معائب برداشت کئے لیکن باپ کی امانت کا تحفظ کرتے رہے۔

جناب ابوطالب کی نسل میں یوں تو سب ہی کسی نہ کسی منزل و ناپاؤں پر فائز تھے لیکن خصوصیت کے ساتھ مولائے کائنات کا نام ”مہر نیروز“ کی طرح آسمان و ناپاؤں پر جگمگا رہا ہے۔ آپ کی وفاداری کے لئے قرآن حکیم کا یہ کھلا ہوا اعلان کافی ہے۔

”من المومنین رجال صدقوا ما عاہدوا اللہ علیہ
فمنہم من قضیٰ نعیمہ ومنہم من یتنظرون ما بیدلوا تبديلاً۔“

(مومنین میں کچھ ایسے مرد بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے اپنے عہد کو پرجہ کر رکھا ہے۔ ان میں کچھ گزر چکے ہیں اور کچھ اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کی ایک امتیازی صفت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بات کو بدلا نہیں ہے)

دعوتِ دوا عشرہ سے مرض الموت پیغمبر تک کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جہاں علیؑ نے اپنے وعدے کو نظر انداز کر دیا ہو۔ میدانوں کی سختیاں سامنے آئیں سفر کے معائب برداشت کرنا پڑے۔ تیغوں کی چھاؤں میں سونا پڑا۔

اس عہد وفا کا تعلق مولائے کائنات سے ہے جنہوں نے عباسیوں کو اسی مقصد کے لئے بھیجا
کیا تھا کہ اگر دفائے عباسی میں ادنیٰ سا فرق پیدا ہو جائے تو یہ عباسیوں کے کردار کی کسر دردی نہ ہوگی
بلکہ اعتماد علی کی کسر دردی ہوگی جس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

عرفانی نظریہ سے جس قدر وزن عہدِ قدس العیشہ میں پایا جاتا ہے اس قدر وزن عہدِ عباسی میں کچھ ہے۔ دونوں کا تعلق ایک امام معصوم سے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک عہدِ علیؑ نے اپنی ذات کے بارے میں کیا تھا اور ایک اپنے وفادار فرزند کے بارے میں۔

یوں ابتدا و فنا کی ملتی ہے انتہا سے
جس طرح فدا العیشہ مل جائے کر بلا سے

جوادى

علماء و اخلاق نے دغا داری کے چھ درجات بیان کئے ہیں۔

الوفاء بکلمتی الشہادۃ۔
کلمہ شہادتین کے ساتھ وفا کرنا۔

الْوَفَاءُ بِالْعِبَادَاتِ الْمَفْرُوضَةِ رَامِنْدُ رَبِّهِ
واجب و مستحب عبادات سے وفا کرنا

أَلَوْفَاءَ بِتَرْكِ الْكِبَائِرِ وَالْاجْتِنَابِ عَنِ الصَّغَائِرِ.

ننانا کبیر کو ترک کر کے گناہان صغیرہ سے یکسر پرہیز کر کے دقا

نفس میں فضائل پیدا کر کے اور اس کے رذائل کو دور کر کے ذفا کرنا۔

أَلَوْ قَالُوا لَمَنُومًا النَّاسُ وَصَوَّافِيهِمْ لَوَافِقَهُ لِقَوَانِي الشَّرْعِيَّةِ
لوگوں کے معامروں سے دفا کر ناجو شرعی قوانین کے موافق ہوں۔

أَلَتَقَرَّرْنِي عَنْ أَغْطِيَّةِ الْبَشَرِيَّةِ بِالتَّجَرُّدِ وَالْأَسْتِضَاءِ
بِالْأَلْوَانِ وَالْكَوْنِيَّةِ وَالْأَسْتِغْرَاقِ فِي مَجَرِّ التَّوْحِيدِ بِحَيْثُ يُعْقَلُ عَنْ
نَفْسِهِ فَضْلًا عَنْ غَيْرِهِ۔

نفس کو مادیت سے اتنا الگ کر لینا کہ بشریت کے پردے ہٹ جائیں اور انسان
ربوبیت کے انوار کی روشنی حاصل کرنے لگے توحید کے سمندر میں غرق ہو جائے۔
اور منزل وہ آجائے کہ غیر تو غیر خود انسان اپنے نفس سے بھی غافل ہو جائے اور نظر کے سامنے
صرف توحید الہی کا جلوہ رہ جائے۔

دفا کے یہ تمام درجات شریعت اسلامیہ کے تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر مرتب
کئے گئے ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان جس قدر زیادہ احکام شریعت کا پابند ہوگا اور اپنی
زندگی کو مرضی الہی کے سانچے میں ڈھال دے گا۔ اتنا ہی بڑا دفا دار کہا جائے گا۔
دفا کے اس تصور کی بنیاد یہ ہے کہ انسان فطری طور پر مالک کائنات کے فضل و
کرم کا نتیجہ ہے۔

اسی کا ایک اشارہ فیض وجود حیات کی طاقتیں عطا کرتا ہے اور اسی کا ایک ارادہ دفا
حیات کائنات کی سچی سبائی محفل کو دیران کر دیتا ہے۔

انسانی وجود مالک کائنات کے ساتھ ایک قسم کا معاہدہ ہے کہ جس کی امانت ہے
اسی کو واپس کی جائے گی اور جس کی عطا کی ہوئی طاقتوں سے اعمال انجام دیئے جاتے ہیں اسی
کی مرضی پیش نظر رکھی جائے گی۔

یہی حقیقت دفا ہے اور یہی منزل اخلاص۔

جو انسان اپنے مالک سے دفا نہیں کرتا وہ کسی دوسرے کے ساتھ دفا نہیں کر سکتا۔ اور
جو انسان اپنے مالک کی مرضی کو نظر انداز کر سکتا ہے اس کی نظر میں غیر کی مرضی کی کیا اہمیت

ہے؟

محسن حقیقی کی احسانات کو فراموش کر دینے والا انسان عالم حجاز کا کیا اعتبار
کرے گا۔

اور رب العالمین کی اطاعت سے باہر نکل جانے والا کسی پرورش کرنے والے کو
کیا اہمیت دے گا۔

معمومین کے کردار کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انھیں مالک کائنات نے دفا کے حبلہ
درجات پر قائم بنایا تھا۔ ادا ان کی زندگی کے ہر موڑ پر شریعت کی حکمرانی اور احکام کی
برتری نظر آتی تھی۔

فصوصیت کے ساتھ حبس سلسلہ نسل سے حضرت عباسؓ کا تعلق ہے اس میں جناب
ابراہیمؑ سے لے کر مولائے کائنات تک ہر ایک کی زندگی دفا کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی
اور ہر ایک اخلاص کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔

جناب ابراہیمؑ کی دفا کا یہ عالم تھا کہ قوم کے سامنے آنے کے بعد سب سے پہلے
”فریضہ پیغام توحید ادا کیا اور بے ثباتی دنیا سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال
قائم کیا۔“

جناب اسمعیلؑ زیر خنجر بھی اپنے عہد کو دفا کرتے رہے اور۔

سَتَجِدُنِي إِشْنَاءَ اللَّهِ وَحَنِ الْقَتْلِ بَرِيْنِ

کی عملی تفسیر پیش کرتے رہے۔

مولائے کائنات کی حیات طیبہ کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے یہاں
پوری زندگی عصمت کا پیکر۔ بلند کردار کا نمونہ۔ عصمت نفس کا نمونہ اور ایسی پاک و

پاکیزہ تھی کہ خانہ کعبہ کے سجدہ سے آغاز ہوا اور مسجد کو ذکے سجدہ پر انتہا ہو گئی۔

توحید کے سمندر میں غرق ہونے کا اس سے بہتر نمونہ کیا ہو سکتا ہے۔ اور انوارِ بوبیت کا اس سے بالاتر کون سا منظر ممکن ہے۔

مقامِ بحث میں ایک ایسے ہی صاحبِ کردار کا تذکرہ مقصود ہے جہاں عصمت نے بلند کردار کی ضمانت نہیں لی ہے۔

منصبِ الٰہی درمیان میں نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وفادارِ اخلاص کا وہ عالم ہے کہ اہم آتے ہی دنیا کی تصویر نگاہوں کے سامنے پہنچ جاتی ہے۔

عباشؓ ایک ایسے ہی دفا شعار انسان کا نام ہے جو منصبِ الٰہی کا حامل نہ ہونے کے باوجود دنیا کے جملہ مدارج پر ناز ہے اور ہجرِ توحید میں استغراق کا یہ عالم ہے کہ باپ کی گودی میں ایک کے بعد دو کہنا گوارہ نہیں کرتا ہے۔

نفس سے کنارہ کش ہو کر مرضیِ مولا کے استہام کی یہ کیفیت ہے کہ جہاں حکمِ الٰہی سامنے آجائے وہاں نہ جذبات کا خیال ہے نہ رجحانات کا۔

احساسات کی پردہ ہے نہ میلانات کی۔ دربارِ ولید سے شہادتِ نثار کر بلا تک کے جملہ دانت گواہ ہیں کہ عباشؓ نے مرضیِ مولا کے سامنے کبھی اپنے نفس کی پردہ نہیں کی اور شہیتِ ایزدی کے بعد اپنے جذبات و احساسات کو پامال کر دینا ہی اپنے کردار کا سرمایہ افتخار اور طرۂ امتیاز سمجھا۔

عباداتِ محبوب و واجب ————— ترک کیا اور منائر ————— فضائل

نفسانیہ ————— استہامِ عہد و بچان ————— یہ ساری منزلیں ہیں جنہیں عباشؓ نے بدرجہ اتم طے کیا اور اپنے کردار کو اس منزل پر پہنچا دیا جہاں علمائے حق کو یہ بحث کرنا پڑی کہ عباشؓ کو معصوم کہا جائے یا غیر معصوم ؟

ان کی زندگی کو عصمت سے الگ کیا جائے تو اس بلند کردار کا کیا نام رکھا

جائے ؟

اور عصمت سے ملا دیا جائے تو عصمتِ ائمہ اور عصمتِ عباسؓ میں کیا فرق کیا

جائے ؟

یہ بحثیں اس بات کی گواہ ہیں کہ تاریخ کو عباشؓ کے کردار میں کوئی عیب نہیں ملے۔

اور میدانِ کارزار میں خون کے پیاسے کبھی طرزِ عمل میں کوئی کمزوری نہیں تلاش کر سکے۔

..... در نہ ملوار چلائے اور خون بہانے سے پہلے اس کمزوری کا اعلان کرتے۔

دنیا کا دستور ہے کہ حزبِ مخالف اپنے دشمن کے کردار کو داغدار بنانے میں کوئی

دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ اور ہر صحیح و غلط بات کا سہارا لے کر حریف کی زندگی کو مشکوک

بنانا چاہتا ہے۔ لیکن شہیدِ اکبر بلا اور خاص طور سے حضرت عباشؓ کا کردار اتنا بے عیب تھا

کہ "سردارِ لشکر" ہونے کے باوجود محلِ اعتراض میں نہ آسکا اور دشمن انگلی اٹھانے کی ہمت نہ کر سکا۔

امام جعفر صادقؑ نے انھیں کلمات کو پیش نظر رکھنے کے بعد فرمایا تھا۔

أَشْهَدُ كَلًّا بِالشَّهِيدِ وَالْقَدِيدِ وَالْوَفَاءِ

ہم آپ کی تسلیم و تقدیر و وفاسب کی گواہی دیتے ہیں۔

کمالِ علم و فقہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اس دنیا میں جاہلِ مطلق ہی پیدا ہوتا ہے۔

أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا

وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے کبھی باخبر نہیں ہوتا۔ اسے اپنے پیدا کرنے والوں

کی معرفت بھی نہیں ہوتی۔ لیکن اسی فطری جہالت کے پردہ میں صلاحیتوں کا ایک ذخیرہ بھی

”عامۃ الناس“ کے لئے ناممکن ہے۔ جنسی ارتباط کے حالات نامحدود اختلاف رکھتے ہیں اور انسانی اختیارِ بڑھی حد تک محدود ہیں۔

اب اگر کوئی شخص ایسا پیدا ہو جائے جو جملہ حالات میں اپنے نفس پر مکمل اختیار رکھتا ہو۔
_____ اور تحقیق کے اسباب پر مکمل نظر رکھتا ہو تو اس کے یہاں یہ بات ممکن محض ہے۔ جیسا
کہ عام فہم پر انبیاء و اولیاء کے یہاں ہوتا ہے۔

یہ ادربات سب سے کہ ان کے یہاں کبھی ایسا کم وقوع پزیر ہوا ہے اس لئے کہ آنے والا فرزند صرف ایک طرف کے انکسار و خیالات کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے وہ طریقیں کے ذہن کا عکاس ہوتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک طرف انتہائی پاکیزہ نفس، پاکیزہ نظر اور مشاطہ ہر لیکن دوسری طرف یہ اوصاف و کمالات نہ چرچ اور آنے والا مولود اس اختلاف سے متاثر ہو جائے۔

یہ امتیاز پوری کائنات میں صرف حضرت علیؑ اور جناب خاتم النبیینؐ کی اولاد کو حاصل ہوا ہے
مکہ ماں اور باپ دونوں معصوم بلند کردار پاکیزہ نفس اور کمال احتیاط کے درجہ پر فائز تھے۔
اب آئے دانی نسل میں منصب کردار کی ضمانت نہ بھی رہے تو بھی کردار میں کوئی کمزوری نہ ہو
چر سکتی۔

اولاد علی وفا طہ میں صرف امام حسن اور امام حسین ہی نہیں ہیں کہ ان کی بلندی کردار کو
مستحب کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

ان میں عقیلہ بنی ہاشم جناب زینب اور جناب ام کلثوم بھی تھیں جن کے کردار کی منبری
سوی منصب کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا تعلق اس معصوم وراثت سے ہے جس میں ان کا شریک و
منہجیم کوئی نہیں ہے۔

جناب عباس کو ایسا شرف حاصل نہیں ہے اور آپ ماں کی طرف سے کسی معصوم مالکین کے فرزند نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے جو اولاد امیر المومنین میں دوسری شخصیتوں کو حاصل نہیں ہے۔

دو استیلازیہ جے کہ مولائے کائنات نے عباسی کو ایک خاص مقصد کے لئے مہیا کیا تھا۔ اور جب کسی شے سے امام معصوم کا کوئی مقصد وابستہ ہو جاتا ہے تو وہ عالم تخلیق میں وہ تمام تصرفات کر سکتا ہے جس کا اختیار ایک انام برحق کو دیا جاتا ہے اور جس کے استعمال کے لئے عالم غیب و شہرہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

حالات و واقعات کے تحت یہ دعویٰ بالکل حق بجانب ہے کہ مرلاٹے کاٹنات نے حضرت عباسؓ کی نظر میں سلامیت کے بارے میں امامت کے اختیارات صرف فرماے ہیں اور آپ کو ایسا فرزند عطا ہوا ہے جو دنیا کے عام بچوں سے ممتاز اور آلِ محمد میں بھی ایک نمایاں انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔

تعلیم و تربیت

دراشتی استعداد و صلاحیت کے علاوہ انسانی علم و عرفان پر اس کے ماحول کا بھی اثر پڑا کرتا ہے۔ ماحول کی تاثیر ہی کا نام تعلیم و تربیت ہے۔ چاہے اس کا تعلق گھر کے باہر کے ماحول سے ہو یا گھر کے اندر کے ماحول سے

انسان اس دنیا میں جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے سب اس کے ماحول کا عطیہ ہوتا ہے
وہی فنون دیتا ہے اور وہی علوم _____ وہی فضائل کا سرچشمہ بنتا ہے اور
وہی کمالات کا مصدر۔

اچھا ماحول اچھی استعداد کو ابھارتا ہے اور برابراحول اس صلاحیت کو کبھی پامال کر دیتا ہے۔

ماحول کا زیر بحث تصور عام تصور سے ذرا مختلف حیثیت رکھتا ہے۔
آج کل کی دنیا میں تعلیمی ماحول کا مطلب اسکول، کالج، درس گاہ اور دانش گاہ کا ماحول ہے جہاں
ایک معلم ہر تائب اور ایک متعلم، چند ہم جماعت ہوتے ہیں اور چند اہل مذاکرہ و مباحثہ

”مَا لِي أَدْرَاكَ فَتَعُدُّ بِنَفْسِكَ بِأَقْبِيَّةَ جَدِّي وَآبِي وَآخُو قِيَّوَاللَّهِ
إِنَّ هَذَا الْعَهْدُ مِنَ اللَّهِ إِلَى جَدِّكَ وَأَبِيكَ وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ
آدَمَ لَا تَعْبُرُ فِتْنُهُمْ فَرَاغَنَّهُ هَذِهِ الْأَرْضُ وَهُمْ مَعْرُوفُونَ فِي الْأَهْلِ
الْأَسْمَاءِ أَتَيْتَهُمْ يَجْعَلُونَ هَذِهِ الْأَعْضَاءَ الْمَقْطُوعَةَ وَالْجَهَنَّمَ الْمُضَرَّجَةَ
فَيُؤَارُونَهَا وَيَنْصِبُونَ لِهَذَا اللَّطْفِ عِلْمًا بِقِيَّوَاللَّهِ سَيَّرَ الشَّهَدَاءَ لَا
يُدْرُسُ أَثَرُهُ وَلَا يُحْجَى رُسْمُهُ عَلَى كُرُورِ اللَّيْلِ وَالْأَيَّامِ وَلِلَّجَنَّةِ نَتِ
الْأَمَةِ الْكُفْرُ وَأَشْيَاءُ الضَّلَالِ فِي فُجْوَ وَتَطْمِيسِهِ فَلَا يَزْنِ أَنْ أَثَرُهُ (الْأَعْلُو)
کامل النیرات ص ۲۶۱

۱ بیٹا یہ کیا دیکھ رہی ہوں۔ تم انا، بابا اور بھیا کی یاد گار ہر تم کو
اپنی جان دیئے دے رہے ہو۔ یہ پروردگار کا تمہارے دادا اور بابا سے
ایک عہد تھا۔

یہ عہد و پیمان ان بندوں کے لئے ہے جنہیں اس زمین کے ذرغون
نہیں پہچانتے اور آسمان والے خوب پہچانتے ہیں۔ وہ لوگ ان کھڑے کھڑے
اعضاء اور خون آلود اجسام کو جمع کر کے دفن کریں گے۔ اور اس پر ایک
پرچم تمہارے باپ کے نام سے نصب کریں گے۔ اس قبر کے آثار مسٹ
نہیں سکتے۔ اس کے نشانات محو نہیں ہو سکتے۔ زمانہ کسی قدر گزر جائے یہ
آہا زنده رہیں گے۔ کفر کے رہنما اور گمراہی کے پیر داس کے مٹانے کی
کوشش کریں گے لیکن ہر کوشش کے بعد بلندی اور بڑھتی جائے گی۔

ان کلمات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ثنائی زہرا کو ان الہی معابدوں کا بھی علم تھا
جی کا تعلق صرف صاحبان منصب سے ہوتا ہے۔ اور جن کے مخاطب اللہ کے مفیض بندے
ہی ہوا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ جناب زینب نے یہ فقرات جناب امام زین العابدین سے فرمائے جو خود
آپ ہی منصب دار تھے اور ان تمام حقائق سے باخبر تھے جن سے ایک صاحب منصب باخبر
ہوتا ہے

ایسی بلند بالا شخصیت سے اس انداز سے گفتگو کرنا اور شدت معائب میں اسے تسکین
دینا کسی معمولی عزم و ہمت اور عام علم و فضل کی خاتون کا کام نہیں ہے۔

باز اگر کوئی دشام میں جناب زینب کے خطبات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا
کہ آپ علم و فضل کی کن بندریوں پر فائز تھیں۔ اور آپ کے کمالات و کرامات کا کیسا
عالم تھا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب پروردگار نے ان نیشین خاتون بونے کے بعد جناب زینب کے علم و
عرفان کا یہ عالم تھا تو بزم امامت میں رہنے والے عباسی کے علم کا کیا عالم ہوگا۔ عباسی
صرف علوی ماحول کے پروردگار نہیں تھے، بلکہ آپ کے علوم و کمالات کو امام حسین اور امام حسن
کی تربیت بھی حاصل ہوئی تھی۔ اہل نظر تصور کر سکتے ہیں کہ ظرف صالح پر تین معنویں کی تربیت و
پرداخت کیا نقوش چھوڑے گی۔

ایک اہم مقصد کے لئے وجود — اور اس پر علمی کی تربیت اور پھر امام حسین
اور امام حسن کی پرداخت ایک انسان کو علوم و فنون کی کن بندریوں تک پہنچا سکتی ہے ان کا
صحیح تصور بھی ممکن ہو تو عباسی کی علمی جلالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین جناب عباسی کو اسی طرح
زبان جساتے تھے جس طرح رسول اکرم نے خود امام حسین کو زبان چھائی تھی۔ (شرح زیارت
ناحیہ) امام حسین ابتدائے خلقت سے امام معصوم تھے۔ ان کی شخصیت پر کسی تبصرہ کا امکان
نہیں ہے۔

لیکن اس سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی امامت کی زبان کا اثر کوئی معمولی نہیں ہوتا۔

ابو ہاشم جعفری راوی ہیں کہ ایک شخص امام علی نقی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے ہندی زبان میں گفتگو کرنا شروع کر دی۔ حضرت اسی زبان میں جواب دیتے رہے۔ میں نے قدرے حیرت کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا: ابو ہاشم! ذرا زمین سے ایک ٹکڑی تو اٹھاؤ میں نے ٹکڑی اٹھا کر حضرت کے دست اقدس پر رکھ دی۔ آپ نے اسے منہ میں رکھا اور پھر کمال کر دے دیا۔

ابو ہاشم! ذرا اس ٹکڑی کو اپنے منہ میں رکھ لو۔ میں نے اسے منہ میں رکھ لیا۔ زبان پر ٹکڑی کا رکھنا تھا کہ میں نے زبانوں کا ماہر ہو گیا جن میں سے ایک ہندی زبان بھی تھی۔

ظاہر ہے کہ امامت کا لعاب دہن ٹکڑی سے مس ہو کر اس میں یہ اثر پیدا کر سکتا ہے کہ انسان نے زبانوں کا ماہر ہو جائے تو جس نے براہ راست امامت کا لعاب دہن چوسا ہوا اس کے علوم و کمالات کا کیا عالم ہو گا؟

ان حقائق کا تو اندازہ کرنا بھی غیر معمولی علم و استعداد کا طالب ہے اور یہ ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ مسئلہ کی اس تحلیل کے بعد اس مشہور واقعہ کی تقدیق میں کوئی تامل نہیں رہ جاوے گا کہ ایک عالم دین نے اپنے درس کے دوران یہ فقرہ کہہ دیا کہ ”عباسی کی شجاعت بہت میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن کی فقہی کوئی شخصیت نہیں تھی“

تو دن گزرنے کے بعد جب آٹھ اور بستر پر لیٹے تو عالم دین میں دیکھا کہ جناب عباسی تشریف لائے ہیں اور ایک مسئلہ دریافت فرما رہے ہیں۔ یہ پریشان ہو گئے۔ مسئلہ کا حل بھی معلوم نہیں تھا۔ گہرا کہ عرض کی کہ فرزند امیر المومنین! یہ مسئلہ بہت مشکل ہے، آپ نے فرمایا کہ تمہیں تو بڑے علم کا دعویٰ ہے۔

افسوس صد افسوس کہ میرے باپ کا علم متعدد معتبر اور غیر معتبر راویوں کے ذریعہ تم تک پہنچ گیا۔ تو تم عالم دین ہو گئے اور اپنے علم پر ناز کرنے لگے۔ اور اس شخص کے ہم

بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں جس کو یہ سارے علوم علی سے براہ راست ملے ہوں اور درمیان میں کسی راوی کا فاصلہ نہ رہا ہو۔

ابو الفضل العباس معرفت آلہی کے ساتھ علم شریعت کے زبردست عالم تھے۔ آپ نے شریعت کے اسرار و رموز اپنے پدر بزرگوار اور اپنے برادرانِ عالی مقام سے حاصل کئے تھے

آپ کے ظن کی صلاحیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جس میں باپ کی گودی میں توحید کی عظمت کا اعلان کیا تھا۔ اور امامت کے فیضان کے بارے میں تو کوئی شبہ کیا ہی نہیں کیا جاسکتا۔

امام جعفر صادق کا ارشاد مبارک اس دعویٰ کی بہترین دلیل ہے۔
”كَانَ عَبْدُ الْعَبَّاسِ بْنُ عَلِيٍّ نَافِذَ الْبَصِيرَةِ صَلَافَ الْإِيمَانِ“
نفوذ بصیرت اور صلاحیت ایمان کے بعد علم و عرفان میں شک کرنا
دو لڑوں الفاظ کے معانی سے ناواقفیت کی بہترین علامت ہے۔
علامہ مامقانی نے تنقیح المقال ص ۱۲۸ میں بالکل صحیح استنتاج کیا ہے۔
”قَدْ كَانَ مِنْ فَهْمَاءِ أَوْلَادِ الْأَيْمَةِ وَكَانَ عَدْلًا
بِقَعْدَةِ تَقِيًّا نَفِيًّا“

”حضرت عباسی اولاد ائمہ کے فقہا کرام میں تھے۔ آپ کردار کے اعتبار سے عادل، موثق، متقی اور پرہیزگار تھے۔ آپ کا علمی پایہ ایک عظیم نقیبہ کا تھا اور دینی اعتبار سے ایک انتہائی معتبر اور موثق راوی تھے۔

اس سے بالاتر کسی درجہ کا تصور کرنا غیر معصوم کہ معصوم کی صف میں لاکھ کر دینے کے مراد ہے۔

صاحب اسرار الشہادۃ ص ۳۳۳ نے معصومین کا یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے۔

”إِنَّ الْعَبَّاسَ بْنَ عَلِيٍّ ذُرِّيُّ الْعِلْمِ ذَقَّ“

”عباس بن علیؑ کو علم اس طرح بھرا گیا تھا کہ جس طرح طائر کے بچے

کو دانہ بھرا جاتا ہے۔

قمر بنی ہاشم

جناب عباسؑ کے مشہور و معروف القاب میں ایک قمر بنی ہاشم بھی ہے۔

مقتل عوالم ص ۹۴، تاریخ التواتر ص ۶۷

محدود معلومات کی بناء پر نفی کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا لیکن جہاں تک میری جستجو کا تعلق ہے مجھے یہ لقب معصومین علیہم السلام کے کلمات میں نہیں ملا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس لقب کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے بلکہ مدعا صرف یہ ہے کہ کلمات معصومین میں اس لقب کا تذکرہ مل جاتا تو قرآن و متعلقات سے یہ اندازہ کیا جاتا کہ اس کا استعمال کس اعتبار سے کیا گیا ہے۔ ۹

مقتصد صرف ظاہری وجاہت اور صوری حسن و جمال کا اعلان ہے یا اس کی پشت پر کوئی شخص معنویت بھی کام کر رہی ہے؟

اہل تاریخ کے استعمال سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم صرف ظاہری حسن و جمال ہی ہے۔ مومنین میں اس سے زیادہ وقت نظر اور نکتہ دہی کا جذبہ اہلیت کے گھرانے کے

بارے میں نہیں دیکھا گیا۔

لیکن میں نے اس وصف کا شمار القاب کے بجائے درستی اور صاف میں کیا ہے۔ جس کا مقصود یہ ہے کہ حضرت عباسؓ صرف حسن و جمال ہی کی بناء پر ایسے نہیں تھے کہ آپ کو لفظ ”قمر“ سے تعبیر کیا جاتا۔ بلکہ آپ کی ہستی میں اس لفظ کی مکمل معنویت پائی جاتی تھی۔ اور آپ اپنے پورے گھرانے کی تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تاریخ نے ہر دور میں ہاشمی گھرانے کی معنوس و جاہت اور اس کے نمایاں افراد کے غیر معمولی حسن و جمال کا اعتراف کیا ہے۔ اور یہ ”قمریت“ اس خاندان کا طرہ امتیاز رہی ہے!

جناب ہاشم کے والد ماجد جناب عبدمنان ”قمر بطحا“ تھے۔

جناب عبد اللہ حضور اکرم کے والد گرامی قبر حرم کے نام سے مشہور تھے سرور کائنات کے بارے میں حدیث کساء میں فاطمہؑ نے ان الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

”كَانَتْهُ الْقَمَرُ فِي لَيْلَةٍ مَّحَامٍ وَكَمَالِهِ“

(بعض نسخوں میں لفظ بدر وارد ہوا ہے)

مولائے کائنات حضرت علیؑ کے بارے میں قرآن حکیم کا اعلان ہے۔

”وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَّهَا“

امام حسینؑ کے بارے میں مورخ کریم لایا ہے۔

”وَإِسْمُ قَمَرِي زَهْرِي“

(سیرام مظلوم کوئی نیرہ پر اس طرح چمک رہا تھا جیسے چاند)

جناب قاسم میدان جہاد میں آئے تو مورخ نے جمال مبارک کی عکاسی اس انداز سے

کی۔ كَفَلَقَةَ الْقَمَرِ۔

غرض جسے دیکھتے قمر نظر آتا ہے۔ جس کے کردار پر نظر ڈالنے مثل ماہتاب درخشاں و تابندہ ہے۔ جس کے جمال مبارک کو دیکھتے ”قمریت“ کے جملہ آثار و مظاہر نمایاں نظر آتے ہیں۔

ایسے عالم میں جناب عباسؓ کا قمر ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے اور نہ اس سے بظاہر کوئی خاص نفیلت ظاہر ہوتی ہے۔ اس خاندان کے بزرگوں میں سبھی قمر رہے ہیں اور بعد میں آئے دوائے سلسلے میں بھی ہر معصوم ایک ”قمر امت“ ہی تھا۔

لیکن ذرا وقت نظر سے کام لیا جائے تو حضرت عباسؓ کی ایک انفرادیت ضرور ہے ”قمریت“ اس گھرانے کا طرہ امتیاز ہی ہے۔ بزرگوں میں متعدد شخصیتیں ”قمر“ کے نام سے مشہور رہی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر ایک کی قمریت کا انداز جدا جدا ہے۔ جناب عبدمنان بطحا کے قمر تھے، جناب عبد اللہ حرم کے قمر تھے۔ نہ بطحا میں عبد اللہ کا شل تھا اور نہ حد و حرم میں جناب عبد اللہ کا جواب۔ جناب عباسؓ کا یہ امتیاز ہے کہ ان کی قمریت بنی ہاشم کی طرف منسوب ہے۔

اب اگر بنی ہاشم میں کوئی قمر نہ ہوتا تو یہ کہنا آسان تھا کہ عادی اور معمولی وجاہت کے افراد میں عباسؓ کا حسن و جمال ایک انفرادی شان رکھتا تھا۔

لیکن مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

عباسؓ اس گھرانے اور خاندان کے قمر ہیں جس گھرانے میں ہر ایک اپنے مقام پر ایک ماہتاب درخشاں تھا۔ عباسؓ کو ان شخصیتوں میں نمایاں امتیاز حاصل ہے جن میں ہر ایک زہرہ جبین، ماہِ قمر اور قمر پیکر تھا

حضور سرور کائنات کے بارے میں احیاء العلوم کی روایت ہے کہ آپ کے رونے نور کی روشنی میں ام المومنین عائشہؓ سوئی تلاش کر لیا کرتی تھیں۔

ایسے حالات میں یہ کہنے میں تکلف نہیں ہے کہ "تاریخی اعتبار" سے بطحا کے اہل حق و جمال جمع کر لئے جائیں تو حضرت عبدالمنان قمر ہیں۔ حرم کے حسینوں کا اجتماع ہر جائے تو جناب عبداللہ قمر ہیں۔ کساریائی کا پردہ کر لیا جائے تو مرسل اعظم قمر ہیں۔ اتباع رسالت میں قدم آگے بڑھ جائیں تو حضرت علی قمر ہیں۔ راہ خدا میں سرگشا کرنیزہ پر سر بلند ہوں تو حسین قمر ہیں اور سب ایک مرکز پر جمع ہر جائیں تو "عباش" قمر ہیں۔ ہر ایک کے حق و جمال کا پردہ تو اور ہر ایک کی طلعت و زجاء کا آمینہ!

سرکارِ دفا کے اس حق و جمال پر اس رخ سے نظر ڈالی جائے تو ایک عجیب انداز نظر آتا ہے اور نظر کو حیرت انگیز نظارہ نہیں ہوتی۔

خدا جانے یہ ام النین کالال کتنا حسین و جمیل تھا۔ یہ کائنات نظر کس قدر درجہ و کمال تھا کہ تاریخ نے آسمانِ حق بنی ہاشم پر ایک ہی مانتاب درخشاں دیکھا اور دروازہ دل "قمر بنی ہاشم" کہہ دیا تو عباس صورت و سیرت میں قمر بنی ہاشم ہی ثابت ہوئے۔

قمر کا ایک معنوی وصف یہ بھی ہے کہ وہ خود "ذاتی نور" کا حامل نہیں ہوتا۔ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب ہمتاباں کا عطیہ ہے اور اسی کا فیض وجود ہے۔

اور ہر جہاد و جہد ہے کہ وہ ہمیشہ اس کے سامنے خاضع و متناہی ہے اور اس کے نقش قدم پر قدم جاتا رہتا ہے۔

حضرت عباس اس اعتبار سے بھی قمر کہے جانے کے قابل تھے کہ انہوں نے اپنی کائنات کردار کو کبھی اپنا نہیں سمجھا۔ بلکہ سب مولا کا فیض ہی سمجھتے رہے اور اس طرح ان کے نقش قدم پر چلے کہ بھائی ہونے کے باوجود بھائی کہنے کی بہت نہیں کی اور ہمیشہ اپنے کو حسین کا غلام ہی کہتے رہے۔

اس مقام پر یہ کہنا بھی بیجا نہ ہو گا کہ جس طرح "قمر امامت" نے "آفتاب رسالت" کا اتباع کیا ہے اور کس منزل پر ایک قدم آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کی۔

قدرت نے بھی اس فطری اتباع کی لاج رکھی ہے اور طلوعِ قمر کی تاریخ کو طلوعِ "ہمراہ امت" سے ملادیا ہے۔ ————— ۳۰۰ ————— میں تیسری شعبان کو قمر امامت امام حسین کی شکل میں طلوع ہوا۔ ————— اور ۲۶؎ میں چوتھی شعبان کو "امانتاب دفا" مطلعِ ارمان پر پر جلوہ گر ہوا۔

شعبان میں حیدر نے دو لعلِ عجب پائے۔

عصمت

عربی زبان کے اعتبار سے عصمت تحفظ کے معنی میں ہے اور معصوم اس شخص کو کہہ جاسکتا ہے جو عارم الہیہ سے اجتناب کرنے والا ہو اور اپنے کردار کو پاک و پاکیزہ رکھتا۔ اصلاہی اعتبار سے عصمت کے مفہوم میں علماء اسلام کے درمیان بعد اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ عصمت کے کمال کو وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جو خود درجہ عصمت بر فائز ہوں۔

علماء اسلام میں کوئی بھی اس بلند درجہ پر فائز نہیں تھا کہ اسے معصوم کے نفس کی کیفیت اسکے جذبات کی طہارت اور اسکے کردار کی بلندی کا علم ہو سکے۔ حالات و کیفیات یا عقائد و نظریات کی روشنی میں اس کمال نفس کی مختلف تعبیریں اور تفسیریں کی گئی ہیں۔

کبھی معصوم کے کردار کی بلندی سامنے آئی ہے تو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اگر عصمت کو غیر اختیاری تسلیم کر لیا جائے تو معصوم کا کمال ہی کیا رہ جائے گا۔ اور اس کی خوبی ہی کیا ہوگی؟ اور کبھی اختیاری عصمت کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اسے جدوجہد و محنت و

مشقت کا نتیجہ ہونا چاہیے۔

ابتداءً فطرت سے حاصل ہونے والے کمال کو اختیاری کہنے کا کیا مطلب ہے۔ بالآخر نظر یہ یہ قائم کیا گیا ہے کہ عصمت ایک نفسانی عکس ہے جس کی بناء پر معصوم اختیارات حاصل ہونے کے باوجود خطاؤں کی طرف قدم آئے نہیں بڑھاتا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ عصمت کی تفسیر کا مسئلہ نہایت درجہ پیچیدہ اور دشوار گزار ہے۔ اس میں ایک طرف کمال اختیار کا ذکر آتا ہے تو دوسری طرف آغاز جبلت سے ہر قسم کے تحفظ کا۔ یہی دشواری تھی جس کے پیش نظر علمائے اسلام نے اس کی تفسیر میں صراحت کے بجائے اشارات سے کام لیا اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ عصمت ایک "لطف خفی" ہے جسے پروردگار عالم اپنے مخصوص بندوں کے شامل حال کر دیا کرتا ہے اور اس کے بعد وہ ہر قسم کی خطا و نصیحت سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لطف کیا ہے؟ اور پروردگار اسے اپنے مخصوص بندوں کو کیوں عطا کرتا ہے۔ عطا میں ان بندوں کا کیا کمال ہے کہ ان کے حسن کردار کی تعریف کی جائے؟

یہ سوالات اس وقت تک لا جواب رہیں گے جب تک عصمت کا صحیح مفہوم سامنے نہ آجائے اور معصوم کے کردار کی حقیقت نہ معلوم ہو جائے اور یہ بات ایک غیر معصوم کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔ مناسب یہی ہے کہ ان مباحث میں الجھنے کے بجائے عصمت کے آثار و مظاہر پر نظر کی جائے اور معصوم کے اعمال و کردار کی نوعیت کا اندازہ کیا جائے۔

عصمت کے بارے میں ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق صرف اختیاری اعمال سے ہوتا ہے یا اس کا دائرہ کسی قدر وسیع ہے

علماء اسلام کے نزدیک عصمت صرف اختیارات سے تعلق رکھتی ہے۔

خطا و نسیان عصمت کے محدود سے باہر ہیں۔ اسی لئے وہ حضرات مرسل اعظم کو معصوم مانتے ہوئے بھی آپ کی زندگی میں سہو و نسیان کے قائل ہیں۔ اور ان کی نظر میں سہو و نسیان کی خطائیں خطا شمار نہیں کی جاتیں اور نہ ایسے آدمی کو گنہگار کہا جاسکتا ہے۔
یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن مسلم سہو و نسیان کے اعمال کو خطا و گناہ کہہ جانے یا شمار کرنے کا نہیں ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ معصوم سے خطا و نسیان کا امکان بھی ہے یا نہیں اور ضرورت عصمت کے دلائل سہو و نسیان کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں یا نہیں؟
”صاحبِ عباد الاسلام“ علامہ سید ولد ار علی مرحوم ”غفر اللہ“ نے عصمت کے موضوع پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ اور یہ واضح کیا ہے کہ عصمت بر قسم کی غلطی منسوخ و مبرا ہونے کا نام ہے۔

اس مقام پر اس بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کے دلائل کا تقاضا کیا ہے اور اس عظیم عصمت کے اثبات کے دلائل و دلائل کیا ہوں گے؟
یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ عصمت کی تعبیر ایک ”لفظِ خاص“ کے علاوہ اور کچھ نہیں کی جاسکتی۔ اور لفظِ خاص میں سوائے رحمتِ الہی کسی اور بات کا دخل نہیں ہوتا وہ جسے چاہتا ہے یہ کمال عطا کر دیتا ہے اور جب عطا کر دیتا ہے تو اس میں یہ نشان پیدا ہو جاتا ہے کہ سارے اختیارات رکھتے ہوئے کبھی گناہ کی طرف قدم نہیں اٹھاتا۔

یہ کہنا غلط ہے کہ اس طرح معصوم کا عمل قابلِ تعریف نہ ہوگا اور یہ کہنے کی گنجائش باقی رہے گی کہ پروردگار نے یہ کمال بھی عطا کر دیا تو ہمارا کردار بھی اتنا ہی پاکیزہ ہوتا اس لئے کہ یہ بات اپنے مقام پر صحیح ضرور ہے۔ لیکن جہاں تک ”تعریف“ کا تعلق ہے اس کے لئے یہی کیا کم ہے کہ پروردگار نے انھیں اس لطف کے لائق سمجھا اور ہمیں نہیں سمجھا۔ وہ اس کمال کے سرشار تھے اور ہم نہیں ہیں۔

اب یہ تفریق کیوں قائم کی گئی اور پروردگار نے یہ امتیاز کیوں رکھا؟
یہ الگ ایک سوال ہے جس کا مختصر جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مالک کائنات نے تمام بندوں کو ایک ہی مقصد کے لئے نہیں پیدا کیا ہے۔ حکیم علی الاطلاق کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔
حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ جس شخص کو جس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اس کی شخصیت کو مقصد کے تمام لوازم و ضروریات سے آراستہ کر کے پیدا کیا جائے۔
اس کے بغیر مقصد پر وارد ہونے والے نقائص کی ذمہ داری ”خالقِ عالم“ کے علاوہ کسی اور ہستی پر نہ ہوگی۔

اور جب یہ بات مسلم ہے کہ تخلیق کو مقصد کے مطابق ہونا چاہیے تو معصوم اور غیر معصوم کی تفریق میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا۔

دنیا نے انسانیت کے افراد دو قسم کے ہیں۔ بعض افراد وہ ہیں جنہیں ہدایت حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اور بعض افراد وہ ہیں جنہیں ہدایت یافتہ بنا کر ہدایت خلق کے لئے ہی مبعوث کیا گیا ہے۔

”الرَّحْمَنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ“

”اس رحمن نے قرآن کی تعلیم دی اور انسان کو پیدا کیا۔“

اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض افراد انسان کو تعلیم قرآن کے بعد عالم مادیات میں خلق کیا گیا ہے۔

جنابِ آدمؑ کے بارے میں خلقتِ بشری سے پہلے ہی منصبِ خلافت کا اعلان ہو گیا تھا اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ آنے والا بشر خلافتِ دنیایت کے جملہ لوازم لے کر آئے گا اور اس کی تخلیق کا اہتمام دیگر افراد بشریت سے الگ کیا جائے گا۔

اب اگر روزِ اول تخلیقِ آدمؑ میں یہ تفریق ممکن ہے کہ آدمؑ کو منصبِ دار بنانے کے بعد

بشر بنایا جائے اور باقی افراد نوز کو بشر بنانے کے بعد کسی لائق اقرار دیا جائے تو معصومین کے بارے میں بھی یہ امکان ہے کہ ان کی تخلیق میں ایک مخصوص اہتمام برتا جائے اور غیر معصومین کی عقل میں انہیں ابتداء خلقت ہی سے معصوم کہا کر بھیجا جائے۔

دیگر افراد کا وجود ہدایت حاصل کرنے کے لئے ہے اور معصومین کا وجود ہدایت دینے کے لئے ہے۔

ہدایت دینے والے کو ہدایت لینے والے سے ہر طرح ممتاز و بلند تر ہونا چاہیئے۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ اس طرح معصومین کے کردار کا کوئی کمال نہ رہ جائے گا اور پروردگار عالم جسے ابتداء خلقت سے معصوم بنا دے گا۔ وہی بلند کردار اور پاکیزہ نفس ہو جائے گا اس لئے کہ یہ امتیاز و انتخاب خود ایک کمال و رفعت ہے جس کی نظیر عالم امکان میں نہیں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مالک کائنات کسی بندے کو معصوم پیدا کرتا۔ اور کسی کو غیر معصوم۔

اور پھر غیر معصومین سے یہ تقاضا کرتا کہ تمہارا کردار بھی معصومین جیسا ہونا چاہیئے۔ تمہارے اعمال میں بھی عصمت کی پاکیزگی ہونی چاہیئے۔ تمہارے انداز پر بھی عصمت کی چھاپ ہونی چاہیئے۔ اور تمہاری زندگی میں بھی بہر دنیاں کا گزرنہ ہونا چاہیئے۔

مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ مالک نے جسے جن ملاحتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اس کی ویسی ہی ذمہ داریاں رکھی ہیں۔ اور ویسا ہی محاسبہ رکھا ہے۔ غیر معصوم کی ذمہ داریاں اور ہیں اور معصوم کی ذمہ داریاں اور۔۔۔۔۔ غیر معصوم سے محاسبہ کا انداز اور ہے اور معصوم سے محاسبہ کا انداز اور۔

غیر معصوم سے اس کے اعمال و کردار کے بارے میں محاسبہ ہو گا۔ اور معصوم سے اصل دین و ایمان کے بارے میں حساب لیا جائے گا۔

غیر معصوم میدان جہاد میں جان دینے کا ذمہ دار ہے۔ عزت دین کا ذمہ دار نہیں ہے اور معصوم تحفظ دین و ایمان کا بھی ذمہ دار ہے اور مجاہدین کے جان و مال کا بھی۔

اقسام عصمت

عصمت کے مباحث علم میں نہایت تفصیل سے نقل کئے گئے ہیں یہاں ان مباحث کے بھڑنے کا محل نہیں ہے۔ صرف اس قدر تذکرہ کرنا مقصود ہے کہ عصمت کے مفہوم میں لغوی اعتبار سے صرف واجبات و محرمات کا پاس دلچاظ شامل ہے۔ اصطلاحی عصمت بھی ایک خدائی ضمانت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

عصمت میں سہودنیاں سے مبرا ہونے کی قید یا ترک ادنیٰ نہ ہونے کی شرط لفظ عصمت کے مفہوم سے نہیں پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کے لئے جداگانہ دلائل ہیں جنکی روشنی میں ان شرائط کا اضافہ کیا گیا ہے۔

ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل عصمت کو دار کی پاکیزگی چاہتی ہے۔ اس میں سہود کوئی لغزش بھی ہو جائے تو لفظ "عصمت" کے خلاف نہ ہوگا۔ عصمت کے ساتھ منصب کا امتزاج ذمہ داریوں کو بڑھاتا ہے۔ اور مالک کائنات کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ اپنے مقصد کے تحفظ کے لئے صاحبان منصب کو ایسی عصمت عطا کرے جس میں

سہودنیاں کا بھی گزرنہ ہو۔

سہودنیاں کے ہوتے ہوئے شریعت کی بربادی کا امکان باقی رہے گا، اور یہ بہت ممکن ہوگا کہ صاحب منصب بہت سے احکام سہودنیاں کی بنا پر چھوڑ دے اور انکی ذاتی تبلیغ نہ ہو سکے۔

ان بیانات پر نظر کرنے کے بعد یہ بات بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ اصل عصمت کا مفہوم اور ہے اور منصب کے ساتھ شامل ہونے والی عصمت کا انداز اور۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب اب الولائین نے ایک غیر منصب دار خاتون کی عصمت کو ظاہر کرنا چاہا تو ایسا تبلیغ لہجہ اختیار کیا جس کے بعد منصب اور غیر منصب کی عصمت میں فرق نہ رہ جائے۔

"یطمہرکھ تطہیراً"

حق لطہارت، مدقہ طاسرہ کی اس عصمت کا اعلان ہے جو صاحبان منصب کو دی جاتی ہے۔ اور جس میں کسی نقص یا عیب کا گزر نہیں ہوتا۔

عصمت و عدالت

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر عصمت و عدالت کے فرق کو بھی واضح کر دیا جائے کہ بعض سادہ لوح اہل علم کا خیال ہے کہ عصمت اپنے عمومی مفہوم کے اعتبار سے عدالت کے ہم معنی ہیں۔ عادل کو اس وقت تک عادل نہیں کہہ سکتے جب تک کہ وہ واجبات شرع کا پابند اور محرمات شرع سے پرہیز کرنے والا نہ ہو۔ اور معصوم کو اس وقت تک معصوم نہیں کہہ سکتے جب تک وہ احکام الہیہ کی مکمل پابندی نہ کرے۔ اس کے بعد عصمت و عدالت میں فرق کرنا ایک لا طائل بحث ہے

لیکن وقت نظر کے بعد یہ خیال انتہائی بھل معلوم ہوتا ہے۔ عصمت و عدالت کے

ساتھ اس بات میں مشترک ضرور ہے کہ دونوں میں احکام شرع کی پابندی کی شرط ہے لیکن دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔

عدالت اپنی ریاضت اور کوشش سے پیدا کی جاتی ہے اور عصمت مالک کائنات کا عطیہ ہوتی ہے۔ عدالت کے بارے میں رب العالمین کی طرف سے کوئی ضمانت نہیں ہوتی اور عصمت کے بارے میں مالک کائنات کی ضمانت ہوتی ہے کہ اس کے کردار میں کوئی نقص و عیب نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ضمانت کے طریقے مختلف ہیں کبھی یہ ضمانت صریح آیات و بیانات کے ذریعہ لی جاتی ہے اور کبھی منصب اور عہدہ کے ذریعہ۔

منصب کے ذریعہ انبیاء و کرام اور ائمہ معصومین کی عصمت کی ضمانت لی گئی ہے اور دیگر بیانات کے ذریعہ بقیہ معصومین کی عصمت کی ضمانت لی گئی ہے۔ ضمانت دونوں مقامات پر ضروری ہے۔

ضمانت کے مفہوم کا ایک جزو ہے جس کے بغیر ”اصطلاحی“ عصمت کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔

اس تفصیل کے بعد جب ہم اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور علماء اعلام کے ان بیانات پر نظر ڈالتے ہیں۔ جہاں بہت سے اکابر علماء نے حضرت عباسؑ، حضرت زینبؑ، حضرت علی اکبرؑ اور حضرت ام کلثومؑ جیسی شخصیتوں کے لئے ”عصمت“ کا دعویٰ کیا ہے تو ہمیں اس عصمت کی تحقیق کرنا پڑتی ہے اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس مقام پر عصمت سے مراد کیا ہے؟

کھلی ہوئی بات ہے کہ یہاں عصمت سے مراد وہ درجہ عصمت نہیں ہے جو آل محمدؐ کے منصب کا خاصہ ہے۔ یہ عصمت صرف انہیں حضرات کے لئے ہے ان کے علاوہ سابق کے منصب داروں کو بھی عطا نہیں کی گئی۔ غیر منصب دار افراد کا کیا تذکرہ ہے؟ یہاں وہ عصمت بھی مراد نہیں ہے جو عام منصب کا خاصہ ہوتی ہے اور جس

کی ضمانت منصب کے ذیل میں لی جاتی ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات منصب کے حامل نہیں تھے ان کی مجتہد صدیقہ طاہرہ جناب فاطمہؑ کی جیسی ”عصمت مطلقہ“ بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کے لئے آیت تطہیر کی صراحت موجود ہے۔ اور یہاں ایسی کوئی صراحت و وضاحت نہیں ہے۔

اس کے بعد عصمت کا صرف ایک مفہوم رہ جاتا ہے کہ انسان اتنا پاکیزہ و کردار ہو کہ اس کی زندگی میں کوئی واجب ترک نہ ہو اور کسی حرام کا ارتکاب نہ ہو اور ہر بلکہ مکروہات و مستحبات کا بھی پاس و لحاظ رہے۔ اور اس مطلب کا ان بلند بالا شخصیتوں کے لئے ضمانت کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ نہ اس کے لئے کسی خیرت کی ضرورت ہے اور نہ غلو یا مبالغہ کے تصور کی۔

ارشادات معصومین سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عباسؑ کی اس منزل پر فائز تھے۔ جہاں کسی خطا کے سرزد ہونے کا عادی امکان نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی ضمانت مالک کائنات کی طرف سے نہیں کھنی در نہ اسے ”عصمت مطلقہ“ سے تعبیر کیا جاتا۔

اسی بنا پر میں نے عصمت کی بحث کو درستی اوصاف میں درج کیا ہے کہ یہ عصمت ”پاکیزہ نسل“ اور ”پاکیزہ ماحول“ کا نتیجہ ہے جہاں پیش نگاہ ہمیشہ کردار طیب و طاہر ہوتا ہے۔ اور تربیت اتنی بلند و برتر ہوتی ہے کہ معصیت و گناہ کی طرف طبیعت مائل ہی نہیں ہو سکتی۔

علم و عرفان و بنیاد کرتا ہے اور طہارت نفس برائیوں کے راستوں پر پہرے بٹاتی رہتا ہے۔

حضرت عباسؑ کے بارے میں بعض علماء کرام کے کلمات میں جس علم لدنی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق بھی غالباً اسی پاکیزہ و راست سے ہے جہاں علم علیٰ دلوں

میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ اور نہ نبی و عباس کسی دنیوی تعلیم و تربیت کے بغیر امام معصوم کی نگاہ میں "عالم" کا درجہ رکھتے تھے۔

عباش کو اپنے امتیازی اور مقصدی وجود کی بناء پر مولائے کائنات سے کیا کیا ملا۔ اس کا اندازہ کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

مولائے کائنات نے جس مقصد کے لئے عباش کو بھیجا کیا تھا ان کے جملہ خصوصیات و لوازم عباش کی فطرت میں درجیت فرمادیئے تھے اور امام البینین کا یہ فرزند روز اول سے ان کمالات کا حامل تھا جن کے حامل گزشتہ ادوار میں انبیاء کرام ہوا کرتے تھے۔ بلکہ وجود کا یہ مقصدیت ایک ایسا شرف ہے جس نے عباش کو دیگر شہداء و سابقین سے بھی بالاتر بنا دیا ہے۔

جس کا زندہ ثبوت امام زمین العابدین کا یہ ارشاد ہے کہ :-

"میرے چچا عباش کو وہ درجہ حاصل ہے جسے دیکھ کر روز قیامت شہداء اولین و آخرین غیظ کریں گے۔"

اس مقام پر یہ توہم ہونا چاہیے کہ انبیاء و مرسلین اصفی اعتبار سے ضمانتی عصمت کے حامل تھے۔ اور حضرت عباش اس اعتبار سے معصوم نہ تھے۔ یا انبیاء کرام درجہ نبوت پر فائز تھے۔ اور حضرت عباش کو منصب الہی کا شرف حاصل نہ تھا۔ ایسی صورت میں کیسے ممکن ہے کہ ایک منصب دار معصوم غیر منصب دار کے درجہ پر غیظ کرے اور غیر منصب دار کو ایسا درجہ مل جائے جو منصب دار کو بھی میسر نہ ہو سکے۔

اس لئے کہ قیامت کے درجات دنیا کے درجات سے مختلف ہیں۔ دنیا کے درجات "ذمہ داریوں" کے اعتبار سے تقسیم کئے جاتے ہیں اور آخرت کے درجات "ذمہ داریوں" پر عمل درآمد کے اعتبار سے۔

انبیاء کرام کی نبوتیں تبلیغ دین کی ذمہ داریوں کی بناء پر تھیں جس کے ذمہ جیسی

تبلیغ تھی اتنی ہی اہم اس کی نبوت تھی اور جب وہ ان تمام ذمہ داریوں کو ادا کر کے مالک کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو اسی اعتبار سے انھیں درجہ بھی عطا ہوا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو درجہ تبلیغی ذمہ داریوں کی بناء پر دیا جائے گا وہ کسی اور اہم ذمہ داری کی ادائیگی میں نہ دیا جائے گا یا کسی ذمہ داری کی ادائیگی پر اس سے اہم درجہ نہ دیا جائے گا۔

انبیاء کرام کی تبلیغی ذمہ داریاں اور ان کی ادائیگی مسلم ہے

لیکن مالک کائنات نے ایک ذمہ داری حضرت عباش کے سر رکھی تھی جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے انبیاء کی تبلیغی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ اور اس کی ادائیگی پر ان معصومین کے درجہ سے بلند درجہ بھی مل سکتا تھا۔

یہ سوال الگ ہے کہ یہ شرف ایک غیر منصب دار ہی کو کیوں دیا گیا؟ اور اس کے لئے کسی منصب دار کا انتخاب کیوں نہیں کیا گیا۔

اس کا جواب یہ بھی ممکن ہے کہ دو سابق میں یہ بات ممکن ہی نہیں تھی۔ اسی شرف کا تعلق آخری شریعت کے تحفظ سے تھا۔ اسے سابق کے کسی بھی انسان کو دیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ غیر منصب دار کو عطا کرنا اس لئے ضروری تھا کہ منصب دارین کا تحفظ کرتا ہے خود منصب دار کا تحفظ نہیں کرتا۔ اس کام کے لئے دوسرے ہی افراد ہوتے ہیں۔ مالک کائنات نے یہ شرف انھیں افراد کے لئے رکھا ہے جو صاحبان منصب کے تحفظ میں اپنی جان قربان کر دیتے ہیں اور ہر طرح دین اور صاحب دین کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

سقایت

کسی تشہ لب اور تشہ جگر کو سیراب کرنا ایک ایسا عمل خیر ہے جس کے حسن پر عقل و شرع دونوں کا اتفاق ہے۔

عقلی اعتبار سے سیرابی ایک ضرورت مندر کی حاجتِ روانی اور ایک ”مرزے والے“ کی زندگی کے مرادف ہے جس کے استحسان میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

شرعی اعتبار سے یہ عمل خیر اتنا عظیم عمل ہے کہ خود مالک کائنات نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

انسانوں کو سیراب کرنا تو بڑی بات ہے ممالک کائنات نے تو جانوروں کے سیراب کرنے کو بھی اپنے عظیم احسانات اور پانی کے اسبابِ تخلیق میں شمار کیا ہے۔

”وَإِنزُلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً أَطْهَرًا لِّغَيْسٍ بِهٖ بَلَدًا ۚ وَنَسْفِكَهٖ مِمَّا خَلَقْنَا
الْعَاصَا ۚ وَآنَا سَبِيۡ كَثِيْرًا“

(ہم نے آسمان سے پانی اس لئے نازل کیا ہے کہ اس سے مردہ زمینوں کو زندہ بنائیں اور حیوانات و انسان کو سیراب کریں)

زمینوں کے زندہ کرنے کا تذکرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پانی اسبابِ حیات میں ہے۔ پانی زمین کو کبھی دے دیا جائے تو زمین کو زندہ کرنے کا مرتبہ اُلٹتا ہے۔ صادق آل محمد سے پوچھا گیا۔

مولا! پانی کا ذائقہ کیا ہے۔

فرمایا جو زندگی کا ذائقہ ہے۔ یعنی پانی اور حیات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

حیات ہی نہیں۔ پانی ہر ذی حیات کی اصل اور اس کا قوام ہے۔

”وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيًّا“

ہم نے ہر ذی حیات کو پانی سے خلق کیا ہے۔ پانی اور زندگی میں ایک ایسا گہرا رابطہ ہے جس سے کسی قیمت پر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پانی قوامِ زندگی ہے پانی اصلِ زندگی ہے۔ پانی جانِ زندگی ہے۔ پانی روحِ زندگی ہے۔ پانی خودِ زندگی ہے۔

خالقِ عالم نے پانی کی تخلیق کا بار بار تذکرہ فرمایا ہے۔ اور اسے انسان کے مقابلہ میں اپنا کرم و احسان قرار دیا ہے۔

”أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ“

کامل مبروصہ میں یہ واقعہ درج ہے کہ قصیر روم نے شام کے حاکم معاویہ کے پاس ایک شیشی بھیجی اور یہ کہا کہ اس میں دنیا کی ہر شے رکھ دی جائے؟ حاکم شام اس مطالبہ پر حیران ہو گیا اور اس نے ابن عباس سے مدد چاہی۔ ابن عباس نے فرمایا کہ اس شیشی میں پانی بھر دو۔ وہی ہر شے کی اصلِ روح ہے۔

معاویہ نے پانی بھر کر بھیجا اور قصیر روم یہ دیکھ کر مبہوت ہو گیا کہ حقیقتاً اس مسئلہ کا حل یہی ہے۔

اس واقعہ سے جہاں ابن عباس کے علم اور ان کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی اصالت و اہمیت ایک عقلی مسئلہ ہے جس پر امت قرآن کے علاوہ امت انجیل کا بھی اتفاق ہے۔

اس واقعہ کی روشنی میں جب ابن عباس کے مشہور و معروف اعلان پر نظر جاتی ہے تو تاریخ کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

واقعہ مشہور ہے کہ ابن عباس سے پوچھا گیا کہ آپ کے اور علیؑ کے علم میں کیا فرق ہے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ: ”علیؑ کے علم کے مقابلہ میں میرا علم دیا ہی ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ ہوا کرتا ہے۔“ علیؑ ایک بحرِ ناپیدا کناریں اور میں ایک قطرہِ ناجیز۔

کاش حاکم شام اس نکتہ پر بھی توجہ دیتا اور اسے یہ بھی اندازہ ہوتا کہ قطرہ سے تمک کرنے کے بعد سمندر سے اختلاف کرنا کسی طرح کی دانشمندی نہیں ہے یہ ایک علمی خیانت ہے کہ سمندر سے اختلاف کر کے اس کے قطرہ سے استفادہ کیا جائے۔

پانی کی عظمت سے رقیائی کی عظمت کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے اور روایات و احادیث کا سہارا لے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی تشنہ جگر کو پانی پلانا ایک مردہ کو زندگی دینے کے مرادف ہے۔ تاہم مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے دونوں فرقوں کی بعض حدیثیں نقل کر کے ان کی روشنی میں رقیائی کی عظمت کا اعلان کیا جائے۔

امام احمد ابوداؤد نے بیہقی کے حوالہ سے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضور صرد کائنات نے فرمایا: ”پانی پلانے سے زیادہ باعثِ اجر و ثواب کوئی کارِ خیر نہیں ہے۔“

امام احمدی نے سعید بن عبادہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضور سے عرض کی: ”میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، کیا میں ان کی طرف سے کوئی صدقہ دے سکتا ہوں؟“

آپ نے فرمایا: ”بے شک!“
سعد نے کہا: ”تو بہترین صدقہ و عمل خیر کیا ہے؟“
فرمایا: ”سیرابی۔“

ابن ماجہ نے حضور کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ نے عائشہ سے خطاب کر کے فرمایا: ”جس نے کسی شخص کو اس جگر پانی پلایا جہاں پانی میسر ہے، اس نے گویا ایک نفس کو آزاد کیا۔ اور جس نے وہاں پانی پلایا جہاں پانی میسر نہیں ہے۔ اس نے گویا ایک نفس کو زندہ کیا۔“ (تاریخ ابن عساکر ص ۲۴۱)

مکامِ الاخلاق ص ۵۵ پر یہی روایت صادل آل محمد سے نقل کی گئی ہے اور اس میں اتنا اضافہ ہے کہ جس نے ایک نفس کو زندہ کیا اس نے گویا پوری دنیائے انسانیت کو زندہ کر دیا۔

شیخ طوسی کے فرزند ابنی امالی میں روایت درج کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اکرمؐ سے اس علی کے بارے میں سوال کیا جو جنت سے قریب تر کرنے والا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ ایک مشک خرید لو اور اس وقت تک اس سے سیراب کرتے رہو جب تک وہ پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ یہی وہ عمل ہے جو جنت تک پہنچا سکتا ہے۔“

دارالسلام ص ۳۱۲ کی روایت کی بناء پر تشنہ جگر کو سیراب کرنا بہترین اعمال میں سے ہے چاہے وہ جانور ہی کیوں نہ سیراب کیا جائے۔
ان روایات سے صاف اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب جانور دن کو سیراب کرنا بہترین اعمال میں ہے۔

اور سیرابی زندگی دینے کے مرادف تو جتنی بڑی شخصیت کو سیراب کیا جائے گا اتنی ہی با عظمت زندگی عطا کرنے کا اجر و ثواب ملے گا۔

اور یہی آئینہ ہے جس میں حضرت عباس کی سقائی کا عکس نمایاں طور پر دیکھ جاسکتا ہے۔

اس مقام پر صرف سقائی اور اس کے فضائل و مناقب کا تذکرہ مقصود نہیں ہے تاریخی اعتبار سے یہ ذکر بھی کرنا ہے کہ حضرت عباس کو یہ شرف بھی وراثت میں ملا تھا اور اس کا سلسلہ تاریخ میں بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔

ہاشمی بزرگوں میں اس فہرست میں سب سے پہلے جناب قصی کا نام آتا ہے جن کی سقائی کے سامنے تمام قریش کی گردنیں بار احسان سے خم تھیں۔ اور آپ حاجیوں کو "شیریں پانی" سے سیراب کیا کرتے تھے۔

بلکہ اس راہ میں یہ زحمت بھی برداشت فرماتے تھے کہ بیرون مکہ سے مکہ کے اندر پانی لایا جائے تاکہ حاجیوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ آپ نے ایک کنواں بھی کھودا تھا جو آپ کے لئے سرمایہ افتخار بن گیا اور یہ مشہور ہو گیا کہ اس انداز کی سقایت کسی نے نہیں کی۔ فتوح البلدان ص ۵۴۔

آپ کے بعد یہ ورثہ جناب عبدالطلب کو ملا۔ انھوں نے اپنے آبائی آثار کو زندہ رکھنے کے لئے چاہ زمزم کی تجدید کی اور یہ طے کیا کہ نیا کنواں کھودنے سے بہتر یہ ہے کہ اس کنواں کو برآمد کیا جائے جو حضرت اسمعیل کی پیاس کی نشانی اور ان کی کرامتوں کی یادگار ہے۔

چاہ زمزم آباد ہوا۔ عرب در دراز سے سیراب ہونے کے لئے آنے لگے اور ایک مرتبہ سقائی کی عظمت کا پھر اعلان ہو گیا۔

دین اسلام نے اس عمل خیر کو اس قدر اہمیت دی کہ ایک اللہ کے غلص بندے کو سیراب کرنے کے لئے ہاجرہ نے در پہاڑیوں کے درمیان درادش کی تو اسلام نے اس انداز درش کو ارکان حج میں شامل کر دیا۔ حج کے مبارک موقع پر مسلمانوں کی سعی ہاجرہ

کے اخلاص کی یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ سقائی کی عظمت کا اعلان ہے کہ یہ عمل خیر ایک ایسی عبادت ہے جو سلاسلِ زنجیر زندہ رکھی جاسکتی ہے۔

قریش نے اپنے حسد کی بنا پر چاہا کہ اس کنواں کو ختم کر دیا جائے اور عبدالطلب کا امتیاز ختم ہو جائے لیکن قدرت نے یہ اہتمام کیا کہ جس جس نے اسے تباہ کرنے کی کوشش کی وہ کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ (شرح نہج البلاغہ ص ۴۶)

آپ نے اس نعمت الہی کا شکریہ ادا کیا اور اس میں گمشدہ ڈال کر لوگوں کو شیریں پانی پلانا شروع کر دیا۔ ایک حوض میں درود بھی جمع کر دیا کہ حجاج کرام اس سے بھی سیراب ہو سکیں۔ (سیرہ و طائف ص ۲۱)

آپ کے بعد یہ ذمہ داری جناب ابوطالب نے سنبھالی اور اس حق و خوبی سے ادا کی کہ قرض لے کر اس آبائی یادگار کو قائم کیا اور حسن عمل کا بھی امتیاز تھا کہ آپ کو سب سے پہلے "ساقی الحجج" کے لقب سے یاد کیا گیا۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ نفوس قدسیہ بلند و با عظمت تھے جنہیں اپنے گھروں کا فاقہ گوارا تھا۔ اپنی پشت پر بار قرض برداشت تھا۔ لیکن یہ برداشت نہ تھا کہ در دراز سے آئے ہوئے حجاج عرب کی دھوپ سے جھلے ہوئے چہرے۔ رنگزارِ حجاز سے طیبہ اللہ کے جہانِ پیاس سے رہ جائیں اور ان کے چہروں پر پڑمردگی کے آثار نمایاں ہو سکیں۔

ابوطالب کی زندگی یہی تھی کہ حجاج کرام کو زندگی مل جائے۔ ان کی شادابی یہی تھی کہ اللہ کے جہانوں کے چہروں پر شادابی کی لہر دوڑ جائے جناب ابوطالب کے بعد سقائی کا یہ منصب مولائے کائنات امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کے حصہ میں آیا۔

آپ کی سقائی کے دانتات تاریخ کے ادراک پر بکھرے ہوئے ہیں۔

اس مقام پر صرف تین مواقع کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ایک حیات پیغمبر میں اور دوسرے بعد وفات پیغمبر۔

ان مواقع کا امتیاز یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے عام امت پر احسان فرمایا ہے۔ اور دوسری مرتبہ مسلمانوں کے حاکم کی مشکل کشائی فرمائی ہے۔ تیسری مرتبہ دشمن کے مقابلہ میں اپنے بلند کردار کا ثبوت دیا ہے۔

پہلا موقع

ماہ مبارک رمضان کی سترہویں تاریخ ہے۔ اسلام کا مختصر سا لشکر مقام بدر تک پہنچ چکا ہے۔ اندھیری رات ہے۔ پیاس کا غلبہ ہے۔ مجاہدین پریشان ہیں۔ اور مرسل اعظم ذمہ دار لشکر۔

ایک مرتبہ آپ نے اپنے علم غیب کی بنا پر مسلمانوں کو خبر دی کہ اس مقام پر ایک کنواں ہے۔ تم میں سے کوئی شخص جا کر اس کنویں سے پانی لے آئے۔ اور لشکر اسلام کو سیراب کر دے۔

اسلام کے مجاہدین ”اصحاب بدر“ دم بخود تھے۔ کوئی ایسا نہ تھا جو اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر پیاسے مسلمانوں کو سیراب کر سکتا۔

مجمع کا سکوت دیکھ کر ابو طالب کے لالہ اور عبدالمطلب کے وارث کو جوش آگیا اور آپ نے فوراً اپنے خدمات پیش کر دیئے اور مشکیزہ دوش پر رکھ کر چاہ بدر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اندھیری رات، نئی جگہ۔ ”راہ در چاہ گم۔“ صاحب علم لدنی کے قدم بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ خدا کا شیر بلا خون و خطر آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

یہاں تک کہ چاہ بدر تک پہنچے۔ عرب کے کنویں، رسیاں مفقود۔ تاریکی کا عالم۔ ایک ہمت مردانہ کے ساتھ کنویں کے اندر اترنا اور مشکیزہ کو بھر کر مرسل اعظم کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستہ میں ایک تیز آمدھی آئی اور آپ ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آگے بڑھے اور پھر آمدھی آئی پھر ٹھہر گئے۔ کچھ دیر دم لے کر پھر چند گام چلے اور ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔

تین منزلیں طے کرنے کے بعد مرسل اعظم کو خدمت میں پہنچے۔ آپ نے پانی ملاؤں کے حوالے کر دیا اور حضرت علیؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ”یا علی! تم نے آئے میں بڑی دیر لگائی۔ سوال کا لہجہ بتا رہا تھا کہ مرسل اعظم اپنی زبان مبارک سے کسی حقیقت کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت علیؑ نے بھی نہایت ادب سے فرمایا۔ حضور مجھ سے زیادہ باخبر ہیں۔ تین مرتبہ شدید آندھیوں نے راستہ روکا اور مجھے ٹھہر جانا پڑا۔۔۔ آپ نے فرمایا۔ یا سنی! یہ آندھیاں نہیں تھیں۔ یہ تمہارے مجاہدات کو دیکھ کر مالک کائنات نے جبریل و میکائیل و اسرافیل کو ایک ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ تمہارا استقبال کریں اور تم پر سلام کریں۔ چنانچہ ان فرشتوں نے تم پر سلام بھی کیا ہے۔“

ظاہر ہے کہ امیر المومنینؑ سے بہتر اس حقیقت سے باخبر کون تھا۔ لیکن آپ نے اس علم کو حضور اکرمؐ کے حوالے کر دیا تا کہ اپنی عظیم فضیلت کا اعلان بھی زبان فیض ترجمان رسالت سے ہو اور دنیا کے اسلام کو معلوم ہو جائے کہ علیؑ کی شان کرم کیا ہے اور

علی کو آسمان والے کیا سمجھتے ہیں۔

مولائے کائنات کی یہی نفیلت تھی جس کے پیش نظر کسی "صاحب بعیرت" نے کہا تھا کہ اس علیؑ کے فضائل و کمالات کا کیا احتضار ہو سکتا ہے جس نے ایک شب میں تین ہزار تین فضائل حاصل کر لئے ہوں۔

سید حمیری نے بھی اپنے قصیدہ میں اس منقبت کو نظم کیا ہے۔ قصیدہ کے آخری اشعار یہ ہیں۔

ذَٰلِكَ الَّذِي سَلَّمَ فِي لَيْلَةٍ عَلَيْهِ مِكَالٌ وَجِبْرِيلُ

مِكَالٌ فِي الْفِ وَجِبْرِيلٌ فِي الْفِ وَيَتْلُوهُمْ سَرَّافِيلُ

لَيْلَةَ بَدْرٍ مَدَدًا نَزَلُوا كَأَنَّهُمْ طَيْرًا أَبَابِيلُ

علیؑ وہ صاحب کمال انسان ہے جس پر ایک رات میں میکائیل، جبریل اور اسرافیل نے ایک ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ سلام کیا ہے۔ یہ سب بدر کی رات دلیے ہی مدد کیلئے نازل ہوئے تھے جیسے تحفظ کعبہ کے لئے ابابیل کا لشکر آیا تھا۔

۱۷ فرق مرنے پر ہے کہ کل بیت کے لئے ابابیل کا لشکر آیا تھا۔ (اور آج اہل بیت کیلئے جبرائیل و میکائیل و اسرافیل کا لشکر آیا ہے۔
(جوادی)

دوسری منزل

مسلمانوں کے تیسرے حکمران "عثمان بن عفان" قلعہ بند ہو چکے ہیں۔ انتقامی طاقتوں نے چاروں طرف سے قصر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ آمد و رفت کے سلسلے مسدود ہیں۔ شام سے آنے والی امدادی فوجیں بھی مدینہ سے دور خیمہ زن ہیں۔ اور کسی خاص موقع کا انتظار کر رہی ہیں۔

کوئی نہیں جو "خلیفہ وقت" کی امداد کو پہنچے۔ اور انھیں ان کے دشمنوں سے نجات دلانے "قوم کا حکمران" قصر کی چھت سے فریاد کر رہا ہے۔ اور قوم تماشاخی بنی کھڑی ہے۔

وہ ابوطالب کا لالہ ہی تھا جس نے بنو امیہ کے بادشاہ اور ابوسفیان کے خیر خواہ کی زندگی کی آخری تدبیر کی اور خلف ذرا لے سے قلعہ تک پانی پہنچا دیا۔

مولائے کائنات علیؑ بن ابی طالب پر قتل عثمان کا الزام لگا کر تہل و صفیں کے میدان آراستہ کر دیتا بہت آسان ہے۔ لیکن ایسے نازک وقت میں ایک "تشنہ لب" کی جان بچانا بہت مشکل کام ہے۔ یہ صرف "ساتی کوثر" کا فیض تھا۔ کہ انھوں نے سقیات کی اہمیت کا اعلان کرتے ہوئے حکومت کو سیراب کرنے کا انتظام کیا اور مسلمانوں کو ایک عظیم

۱۸ یہ واقعہ دلیل ہے کہ جس طرح علیؑ نے دنیا میں اہل دنیا کو سیراب کیا ہے اسی طرح آخرت میں کوثر کے کنرے سے مسلمانانِ ایمان کو سیراب کریں گے۔
(جوادی)

سبق دے دیا کہ "انتقامی اقدامات" اپنے مقام پر ہیں۔ کسی پیاسے پر پانی بند نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ جس تاریخ نے ان واقعات کو درج کیا ہے۔
 سنی تاریخ نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ ابن زیاد نے امام حسینؑ اور ان کے بچوں پر پانی بند کرنے کے حکم میں یہ حوالہ دیا تھا کہ انھیں اسی طرح پیاسا رکھو جس طرح خلیفہ عثمانؓ کو پیاسا رکھا گیا تھا۔ بریں عقل و دانش بباہر گریست۔

کاش اولاد رسولؐ کی طرح "ابوسفیان کی اولاد" کو پیاسا رکھا جاتا۔ جس کا شکر دینہ کے باہر پڑاؤ ڈالے رہا اور ایک قدم آگے نہ بڑھا۔ یہاں تک کہ خلیفہ کا قتل واقع ہو گیا۔

امیر المومنینؑ نے بیچ البلاء میں اسکی نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ عثمان کے بارے میں معاویہ کا کردار تین مال سے خالی نہیں تھا۔ اگر وہ انھیں ظالم سمجھتا تھا تو اس کا فرض تھا کہ انھیں ظلم سے روکتا اور مخالفین کی امداد کرتا۔ اور اگر مظلوم سمجھتا تھا تو ان کی کمک کرنا ضروری تھا۔ اور اگر عملی شک میں تھا تو توقف کرنا چاہیے تھا۔ یہ اپنی غفلت یا تقاضا کا ذمہ دار مجھے قرار دے کر میرے خلاف مسلمانوں کو دروغ لگا کا کیا جواز ہے اور اس کی کیا وجہ ہے؟

ارباب تاریخ جانتے ہیں کہ یہ "حضرت عثمان" وہی "بزرگ" تھے جو مولائے کائنات کے مقابلہ میں خلافت کے دعویدار بن کے آئے تھے۔ موقع تو یہ تھا کہ آپ اس رقت کو غنیمت سمجھتے اور انھیں پیاسا ہی مر جانے دیتے۔ انتقام کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں تھا۔ لیکن آپ نے ایسا نہ کیا اور پانی کا انتظام کر کے واضح کر دیا کہ ہم اہلبیتؑ اسی انتقامی کا درائیاں نہیں کرتے جن سے ہمارے دامن غفلت کردار پر کوئی دھبہ آجائے عثمان تو پھر عثمان ہیں۔ انھوں نے تو صرف خلافت میں حضرت علیؑ سے مقابلہ

کیا تھا۔ اور منصب حکومت کو حضرت علیؑ سے سلب کر لے گئے تھے۔ آپ کا کرم تو اس قدر عام تھا کہ جب حالت سجدہ میں سر اقدس پر ضربت لگانے والے ابن ملجم کو قیدی بنا کر لایا گیا۔ اور جراح کی تجویز پر آپ کے لئے جام شربت بھی کیا گیا تو آپ نے اہلبیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

پیاسا یہ بھی ہے۔ تم لوگوں نے جس طرح مجھے سیراب کیا ہے اسے بھی سیراب کرنے کا انتظام کرو۔

مولائی وصیت پر عمل ہوا اور تاریخ میں یہ کردار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گیا کہ علیؑ اس کریم النفس انسان کا نام ہے جو اپنے قاتل سے بھی انتقام نہیں لینا چاہتا۔ اور اس کی حالت نادر پر بھی رحم کھا کر اس کے لئے جام شیر کا انتظام کرتا ہے۔

دوستان را کجا کنی محروم

تو کہ بادشمنان نظر داری

دنیا میں کوئی ایسا حکمران اور رہنما ہے جو اپنے قاتل کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا، شبہات پر قتل کر دینا سب کو آتا ہے اور قاتل کو جام شربت پلانا صرف علیؑ کا کردار ہے۔

یہ عبد مناف کا ترکہ ہے جو سلاً بعد نسل علیؑ تک پہنچا ہے۔ یہ الہی منصب کا فرض ہے جس کا باری علیؑ کے دوش اقدس پر رکھا گیا ہے

تیسری منزل

مصیف کا میدان ہے۔ معادیہ کی فوجیں پیش قدمی کر کے فرات پر قبضہ کر چکی ہیں۔ دشمن کے ذہن میں یہ تصور پیدا ہو چکا ہے کہ اب علی کا لشکر پیاس ہلاک ہو جائے گا اور لڑنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔

اصحاب امیر المومنین نے یہ منظر دیکھا تو گھبرا کر حضرت سے شکایت کی۔ آپ نے اتمام حجت کے لئے معادیہ کے پاس پیغام بھیجا کہ یہ اسلام کا طریقہ جنگ نہیں ہے۔ دریا سے پھرے ہٹالو۔ اس نے اپنے رفقاء کا رسے مشورہ کیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ علی کے لشکر میں عثمان کے قاتل بھی شامل ہیں۔ ان پر پانی بند ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس نے پانی دینے سے انکار کر دیا۔

اصحاب امیر المومنین میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اور آخر کار حضرت اشتراذہ اشعث مولا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی مولا! اس طرح ہمارا لشکر تباہ ہو جائیگا۔ آپ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم شام کے لشکر کو ان کے کئے کا مزہ چکھا دیں۔ مولا نے اجازت دی۔

”ادوا السیون من الدماء ترووا من الدماء“

(تلواروں کو خون سے سیراب کر دو۔ تم پانی سے سیراب ہو جاؤ گے)

(نہج البلاغہ)

اور، اہزار کے لشکر نے یکبارگی حملہ کر دیا۔ شام کے لشکر کو شکست ہوئی اور نہر پر قبضہ ہو گیا

قبضہ ہوا تھا کہ لشکر شام کے ہوش اڑ گئے۔ اب علی کا طرز عمل بھی وہی ہو گا جو ہم نے ان کے لشکر کے ساتھ اختیار کیا تھا۔

دھیرے دھیرے یہ فریاد حاکم شام کے کانوں تک پہنچی۔ اور اس نے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ علی ایک مرد شریف ہیں۔ وہ کسی پر پانی بند نہیں کر سکتے۔ نتیجہ میں ایسا ہی ہو گا جب شام کے نمائندے حضرت کے پاس فریاد لیکر پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ ہم کسی پر پانی بند نہیں کرتے۔ پانی شریعت اسلام کی رو سے ہر ایک کے لئے مباح ہے جس کا جی چاہے سیراب ہو جائے۔ تاریخ اسلام، مناقب شہر آشوب مناقب خوارزمی۔

تاریخ بیان کرے یا خاموش رہے۔ نفسیات انسانی کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ ایسے نازک مواقع پر علی کے ذہن میں کمر ہلا کا تصور آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

آج وہ دن ہے کہ میں نے پانی پر قبضہ کرنے کے بعد اہل شام کو سیراب ہونے کی اجازت دے دی ہے اور کل وہ دن آنے والا ہے جب میرے فرزند اور میری اولاد پر ہی پانی بند کیا جائے گا۔

یہ اشارہ اس لئے ضروری تھا کہ اکثر تاریخ کے اہم واقعات ایسے ہیں جنہیں نام نہاد مورخین نے اپنی کتابوں میں جگہ نہیں دی ہے اور ان کتابوں کا مطالعہ کرنے والا یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے کہ یہ واقعہ کسی ”مستند“ تاریخ میں نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارباب تاریخ نے دنیا کے تمام واقعات کا احصاء کر لیا ہے۔ اور تاریخ واقعات کے ساتھ نفسیات کا بھی کوئی آئینہ ہے۔

تاریخ کے مندرجات پر تفصیلی تبصرہ کر چکا ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ مصیف کے راستے میں مولائے کائنات کے سامنے کربلا کا مرحلہ آچکا تھا اور آپ اس نہر میں

پر شہر کر آئیں وہاں چکے تھے۔ اب یہ ناممکن تھا کہ ایسا نازک وقت آئے اور آپ کے ذہن مبارک میں کربلا کی یاد نہ آئے۔

پانی کی منزل میں کربلا کی یاد یہ لازم رکھتی ہے کہ عباس کی یاد بھی آئے۔ اور صفحہ ذہن پر یہ تصویر بھی ابھرنے لگے کہ آج جس نہر کا پانی میں نے اپنے دشمنوں پر بہا کر دیا ہے۔ کل اسی نہر کے ایک مشک پانی کے لئے میرے عباسی کے شانے قلم ہوں گے اور وہ شہید کر دیا جائے گا۔

نفیات کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ خود حضرت عباسی بھی حضرت کے ہمراہ موجود تھے اور کئی کے عالم میں تھے جس کے بعد جذبات کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ زندگی کے ایک حد تک پہنچنے کے بعد قربانی کا تصور اتنا دلزدہ اور الم انگیز نہیں ہوتا جتنا کئی کے ساتھ شہادت کا تصور "گر یہ خیر" ہوتا ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ کی یہ وہ سقائی تھی جس کا احسان حکومت شام تاخیر نہیں بھول سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ "احسان فراموش طبائع" احسان کا بدلہ نہ دے سکیں۔ نازک حالات اور سخت واقعات صفحہ ذہن سے محو نہیں ہوا کرتے۔ یہ حالات ہمیشہ ذہن کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں اور انسان کی ملامت کرتے رہتے ہیں کہ احسان کا بدلہ وہ نہیں ہے جو آج اپنے دشمن کو دیا ہے۔

معراج سقایت

جناب قسمی سے چلنے والا سلسلہ سقایت امیر المومنین تک پہنچنے پہنچنے معراج کمال کو پہنچ گیا۔ اور آپ کی سقائی کا انداز، وہ نہیں ہے جو گزشتہ اوراق میں بیان کیا گیا ہے جس کا نشان آپ کے اسلاف میں پایا جاتا ہے۔

آپ کی سقائی کی انفرادیت یہ ہے کہ آپ نے یہ "فریقہ انسانیت" بلا تفریق یکا نہ و بیگانہ اور بلا امتیاز دوست و دشمن انجام دیا ہے۔ خالق کائنات کو آپ کی یہ ادا اس قدر محبوب تھی کہ اس نے آپ کے سلسلہ سقایت کو دینا کے ساتھ معدود نہیں بنایا بلکہ اپنے حبیب کی زبان فیض ترجمان سے اعلان کر دیا کہ "یا علیؑ! میں مالک کوثر ہوں اور تم ساقی کوثر ہو" علیؑ کا کمال سقایت دیکھنا ہے تو حوض کوثر پر دیکھنا۔ جہاں چاروں طرف "بارہ کشتان محبت" کا جھرمٹ ہو گا اور پیچ میں بنت اسد کا لال۔ بیٹے والے پی رہے ہوں گے اور پلانے والا۔ اپنے کرم بے حساب کا مظاہرہ کر رہا ہو گا۔

علیؑ کی دنیا و آخرت کی سقائی میں ایک ذرا فرق ضرور ہے۔ کہ دنیا دارِ گل ہے۔ اور آخرت دارِ جزا۔

آپ دنیا میں سقائی کرتے ہیں تو اپنے حسن عمل کے اعتبار سے اور آخرت میں یہ فرض انجام دیں گے تو بیٹے والوں کی لیاقت جزا کے لحاظ سے۔ یہاں درست و دشمن سب کو سیراب کر دیا گیا ہے لیکن وہاں ایسا نہ ہو گا۔ وہاں کے بارے میں صحیح بخاری کی حدیث یہ ہے کہ کچھ لوگ کوثر کے کنارے سے ہٹائے جائیں گے تو حضور سرور کائنات ارشاد فرمائیں گے۔

"پروردگار! یہ میرے اصحاب اور میرے ساتھی ہیں۔ انھیں کیوں ہٹایا جا رہا ہے ارشاد ہو گا۔" انھوں نے آپ کے بعد دین میں بڑی برکتیں ایجاد کی ہیں اور اسے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

کتنا سچا ہے خدا کا رسولؐ۔ کہ قدرت نے اس کے اس دعوے کی تردید نہیں کی کہ "یہ میرے ساتھی ہیں" بلکہ یہ فرمایا ہے کہ انھوں نے آپ کے بعد فتنہ پیدا کیا ہے اور دین میں رخنہ ڈالا ہے۔

حضرت عباسؓ

سقاۃ کا یہ سلسلہ درجہ کمال تک پہنچنے کے بعد پدر بزرگوار کی درانت میں حضرت عباسؓ علمدار کو ملا اور اس شان سے ملا کہ آج تک آپ کے نام کے ساتھ لفظ ”سقاۃ“ زندہ رہ گیا۔ عمدۃ الطالب، تاریخ الخلفاء ۲ ص ۳۱۱ نور الابصار شیعہ ص ۹۳ کبریت الحمراء ۳۲۔

”حیرت“ کی بات ہے کہ امیر المومنین کو ”ساقی“ کہا جاتا ہے۔ جو مبالغہ کا صیغہ نہیں ہے اور عباس کو ”سقاۃ“ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے۔

شاید یہ اس کلمہ کی طرف اشارہ ہو کہ عمل اپنی دشواریوں کے اعتبار سے اہمیت پیدا کر لیتا ہے۔ پر سکون ماحول کی نماز اور ہوتی ہے اور تیروں کی بوجھاری نماز اور زیر سایہ سجدہ اور ہوتا ہے اور زیر خیر سجدہ اور۔

مولائے کائنات کی معراج سقاۃ میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن القاب کی شہرت حالات کی تابع ہوا کرتی ہے۔

ائمۃ معصومین علیہم السلام اور صان و کمالات میں یکسانیت کے باوجود ایک لقب سے مشہور نہ ہو سکے۔ کسی کا صبر مشہور ہوا تو کسی کی شجاعت۔ کسی کے علم کی شہرت ہوئی تو کسی کے تقویٰ و بہارت کی۔

سقاۃ کا کبھی بھی اندازہ ہے۔ علی ساقی دنیا بھی ہیں اور ساقی آخرت بھی۔ لیکن دونوں مقامات پر تاریخ و روایات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مولائے سقاۃ کی منزل میں وہ زمیں ہیں برداشت کیں جو ”سقاۃ“ حرم کو برداشت کرنا پڑیں۔

آپ بدر کی منزل میں کنویں سے پانی لے آئے لیکن کنواں کھودا نہیں۔
حاصو عثمان کے موقع پر آپ نے پانی پہنچا دیا ہے، فراہم نہیں کیا۔ صغیر
کے میدان میں لشکر کو نہر پر قبضہ کے لئے بھیج دیا ہے آپ دریا پر نہیں گئے۔

لیکن عباسؓ کے لئے یہ سارے مصائب ایک منزل پر جمع ہو گئے تھے۔ آپ کو کربلا میں متعدد کنواں بھی کھودنے پڑے۔ دشمنوں کے حصار سے پانی کو بچا کر چلنا بھی پڑا اور نہر پر قبضہ کرنا بھی۔ کوئی معمولی مرحلہ نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس وقت جب غازی کے ہاتھ میں تلوار بھی نہ ہو۔

ایسے حالات میں تاریخ ”سقاۃ“ کے لقب سے یاد نہ کرتی تو ظلم عظیم ہوتا۔ اس سے بڑی ایک نزاکت یہ بھی ہے کہ مولائے کائنات نے جس سقاۃ کے لئے اقدام کیا تھا وہ آخری مرحلہ تک پہنچ بھی گئی تھی۔ بدر میں لشکر کو پانی مل گیا اور صغیر میں مجاہدین سیراب ہو گئے۔

انقلابی جماعت کے محاصرہ کے باوجود دارالامادہ تک پانی پہنچ گیا۔ اور اولاد و تہذیب موجودگی میں قاتل کو جام شیر دے دیا گیا۔

لیکن عباسؓ کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔ کنویں کھودنے مگر پانی برآمد نہ ہوا فرات پر گئے لیکن بھتیجی کی مشک خیمہ تک نہ لاسکے اور پانی ملا بھی تو بچوں کے کام نہ آسکا۔ دنیا کی ہر تاریخ میں جہاں واقع ہونے والے حادثات کی اہمیت ہوتی ہے وہاں حسرتوں کو بھی ایک بڑا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مورخ اس درد کے احساس سے قاصر ہوتے ہیں یہ کام ماہر نفسیات اور صاحب دل کے حوالے ہوتا ہے۔

دین اسلام نے جی جی مقامات پر صبر کی تعریف کی ہے ان سے ضمناً شجاعت کی اہمیت کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ حضور سرکار کائنات نے یہاں تنگ فرما دیا ہے کہ۔
 اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الشَّجَاعَةَ وَكَوْضُ عَلٰی قَتْلِ حَيَاتٍ

”پروردگار شجاعت کو دوست رکھتا ہے چاہے اس کا اظہار ایک سانپ کے قتل ہی کے ذریعہ ہو۔“

اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے شجاعت کا ”ادنیٰ ترین“ معیار سانپ کا قتل کرنا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اتنا بھی نہ کر سکے اور سانپ کے خوف ہی سے روٹنا شروع کر دے تو اسے شجاعت کی کسی منزل پر شمار نہیں کیا جاسکتا؟

مولائے کائنات امیر المومنین نے اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے ذرا دل گہوارہ میں اڑھے کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے کہ اہل دنیا کو معلوم ہو جائے کہ آنے والا بچہ کس قدر قوت قلب کا حامل ہے اور اس کے دست و بازو میں کس قدر زور و بدن پایا جاتا ہے۔

شجاعت کے نفسانی کمال ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مرسل اعظم نے ایک طرف شجاعت کا معیار ”قتل“ قرار دیا ہے اور دوسری طرف یہ بھی فرمایا ہے۔
 ”عَدُوَّكَ تَهْتِكُ فَاقْتُلْهَا“

تمہارا حقیقی دشمن تمہارا نفس ہے اسے بھی قتل کر دو۔

خواہشات نفس کو قتل کے بغیر کسی شجاعت کا مظاہرہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ علامت ہے کہ شجاعت کوئی ظاہری وصف نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق نفس کے کالات سے ہے جو جس قدر کمال نفس کا حامل ہو گا اتنا ہی بڑا شجاع اور بہادر کہا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ کبھی دشمن پر زور کرنا اور اسے تہ تیغ کر دینا شجاعت ہے اور کبھی ضبط نفس کا مظاہرہ کر کے دشمن کو چھوڑ دینا ہی کمال شجاعت ہے۔

یہ تصور بالکل غلط ہے کہ مولائے کائنات کا عمروں عبدود کا سینے پر سوار ہو جانا

شجاعت ہے اور اس کا بے ادبی پر سینے سے اتر آنا شجاعت نہیں ہے۔

درحقیقت یہ در رخ تھے جنہیں مولائے کائنات ایک ہی میدان میں پیش کر رہے تھے۔ دشمن کو زیر کر کے سینے پر سوار ہو جانا شجاعت کا ظاہری رخ ہے اور دشمن پر قابو پا کر بلندی نفس کا مظاہرہ کرنے کے لئے اسے چھوڑ دینا شجاعت کا باطنی رخ ہے۔

شجاعت کی نزاکتوں سے بے خبری کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے میدان جنگ میں مولائے کائنات کے جہاد کا تذکرہ سن کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس طرح علی کا تہتر بٹی سے بھی بڑھ جائے گا۔

ایسا تذکرہ کرنے والے عظمت نبوت سے باخبر نہیں ہیں اس لئے علی کے مرتبہ کو بٹا سے آگے بڑھا رہے ہیں۔

حالانکہ یہ بات ایک توہم سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ حیدر کرار کی شجاعت کا تذکرہ کرنے والے شجاعت کی حقیقت سے باخبر ہیں۔ اور اس کے مدد پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کبھی رسول اکرم کے لئے میدان سے فرار کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اس بات کا اعلان کرتے رہے کہ میدان جہاد میں جہاں علی تھے وہیں نبی تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ علی کے ہاتھ میں دالہ فقر تھی اور نبی خالی ہاتھ تھے۔

ظاہر ہے کہ جہاد کا تذکرہ دو لول قابل قدر ہیں۔ ثبات نفس و تدان دو لول لائق تعریف ہیں۔ لیکن اتنا کہنے کا امکان بہر حال ہے کہ علی کے ثبات میں تلوار نے اپنا حصہ لے لیا تھا اور نبی کے ثبات قدم میں کوئی حصہ دار نہیں بن سکا تھا۔

اب ان کے بعد کبھی علی کے بڑھادیے کا الزام آتا ہے کہ تو آنے دیجئے۔ نبی دعوئی کا فرق باطنی مراتب کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے۔ اظہار کی منزل میں دعوئی نبی

سے آگے بڑھ ہی جاٹے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اسلامی روایات میں اس کے مختلف ثبوت موجود ہیں۔۔۔۔۔ خانہ کعبہ میں بت شکنی کے موقع پر نبوت زیر قدم تھی اور امامت و درش نبوت پر مردوخ پا رہی تھی۔ جنت میں داخلہ کا منتظر۔۔۔۔۔ سردر کائنات نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے کہ علیؑ سب سے پہلے جنت میں داخل ہو گئے اور جب رومی نے سوال کیا کہ کیا آپ سے کبھی پہنچے؟

”فرمایا بے شک! علمدار ہمیشہ آگے رہتا ہے اور سردار ہمیشہ پیچھے رہتا ہے۔“

علیؑ و نبی کی شجاعت کا راز اسی ایک نقرہ میں مضمر ہے۔ شجاعت نبی میں کبھی تھی اور علیؑ میں کبھی۔

فرق صرف یہ تھا کہ میدان جنگ میں علمدار آگے آگے رہتا تھا اور سردار پیچھے
اس فرق کو کسی قیمت پر کبھی نہیں مٹایا جاسکتا چاہے دنیا میں ایک نہیں ایک لاکھ الزاما
عائد کر دیئے جائیں۔

شجاعت اپنے اسی عظیم اور وسیع مفہوم کے ساتھ حضرت عباسؓ کو درانت میں ملی تھی۔

آپ کی اس درانت کا تعلق بھی عہد قدیم سے تھا اور اس میں آباؤ اجداد کا ایک
نیا یا حصہ تھا۔

ناہیال کے اعتبار سے اتنا کافی ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ سے عقد ہی اسی بنیاد پر ہوا تھا کہ بہادر خاندان میں عقد ہو گا اور حضرت عقیل نے وقت عقد اعلان ہی یہ کیا تھا کہ ام النین کے اکابر و اجداد سے زیادہ شجاع عرب میں کوئی نہیں ہے۔

نیزوں سے کیلئے والے اسی خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔ ————— تلواروں پر تکیہ کرنے والے اسی خانزادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ اس شجاعت میں جرأت و ہمت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔
اور ضبط نفس، ثبات عزم، قوت ارادی جیسے عناصر اترنے روشن انداز سے نظر
نہیں آتے ہیں۔“

اس خبرات و سہمت پر مصیقل اس وقت ہوئی جب یہ خاندان خاندان البوطا لب سے وابستہ ہو گیا اور حضرت ام البنین مولائے کائنات کے عقد میں آگئیں۔

علی کی شجاعت تنہا ہی کیا کم تھی کہ اس پر خاندانِ ام البنین کی شجاعت کا ”اضافہ“
بھی ہو گیا۔ اب جو فرزند و نواس خانوادوں کی دراشت لے کر دنیا میں آئے
گا۔ اس کی شجاعت و محبت کا کیا عالم ہو گا۔ ذرہٴ الساقی اس منزل کے
لقوڑ سے قاصر ہے۔

نفسیات کے اس تجربہ سے بہت سے وہ مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جنہیں دنیا کے
اغراض ”عقدہ لائیکل“ سمجھتی ہے اور عالم عقیدت بھی اپنے کو جواب کی منزل میں عاجز
تصور کرتا ہے۔

مثال کے طور پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ حضرت عباسؓ انجام کر بلا سے باخبر تھے اور وہ ایک امام کی فوج کے سپاہی تھے تو تاریخ میں ایسے مقامات کیوں ملتے ہیں جہاں عباسؓ کو جلال آگیا اور امام حسینؓ کو دردناک پڑا۔

در بارہ ولید ————— ساحلِ فرات ————— شبِ عاشورِ حبیبی

مستعد مقامات میں جہاں ”تاریخی بیان کے اعتبار سے“ عباسیوں کو غنیمت آگیا اور امام مظلوم کو مختلف وسائل سے عباسیوں کو خاموش کرنا پڑا جس کا مطلب دولوں کے نظریات و رجحانات میں فرق کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عباسی کا زندگی ایک عجیب و غریب کشمکش سے گزر رہا ہے
تھی۔ آپ کو ایک طرف اپنے جذبات و احساسات کا پاس و لحاظ تھا اور دوسری طرف

حکم امام کا احترام۔ جذبات کھٹکتے تھے تو چہرہ کارنگ بدل جاتا تھا اور امام ردک دیتے تھے تو فوراً رک بھی جاتے تھے۔

عباش کی ایک ذمہ داری یہ بھی تھی کہ دشمن کے قدم قدم پر متوجہ رہیں کہ میرے مولا کا سکوت مشیت الہی اور مصلحت اسلام کی خاطر ہے۔ ہم لوگ مجبوراً واپس ہو کر تمہارے محاصرہ میں نہیں آگئے ہیں۔

یہی تصور جب شدت کے ساتھ ابھرتا تھا تو غازی کو جلال آجاتا تھا اور اسی عالم جلال میں ارشاد فرمادیتے تھے تو عباش خاموش ہو جاتے تھے۔

اس کے علاوہ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس طرح عباش اپنی دہری وراثت کا اعلان کر رہے تھے اور دنیا کو بتا رہے تھے کہ مجھے مال کی طرف سے جرأت و ہمت ملی ہے اور باپ کی طرف سے صبر و شجاعت۔

جب جرأت و ہمت کی منزل آتی ہے تو تیز بگڑ جاتے ہیں اور جب باپ کا "حقیقی وارث" اشارہ کر دیتا ہے تو بابا کی شجاعت کے اظہار میں خاموش ہو جاتا ہر لہر۔ تاریخ میں حضرت عباش کی شجاعت کے مختلف مواقع ہیں۔ جنہیں سوانح حیات کے ذیل میں نقل کیا جائے گا۔ یہاں صرف ایک تاریخی فقرہ نقل کرنا ہے اور چند معمولی کے ارشادات۔

مورخ داؤد کربلا کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کربلا میں شہید ہونے والوں کی تعداد تو بہتر یا اس سے زیادہ ہے لیکن "جنگی نقطہ نظر سے شہیدوں کی تعداد کے بجائے ان مجاہدین" پر غور کرنا پڑے گا جو کربلا میں ایک عظیم مقصد کے لئے جان قربان کر رہے تھے۔ اور اس طرح داؤد کربلا کو کسی قیمت پر جنگ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا اور نہ یہ کہنا ممکن ہے کہ امام حسینؑ کو جنگ کے ارادے سے آئے تھے۔ جنگ کے قانون سے کربلا میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے سپاہی یا فوجی کہا جاسکے۔

کچھ افراد تھے جن کی عمریں بچاس یا ساٹھ سے تباہ کر چکی تھیں۔ کچھ کمسن اور نوجوان بچے تھے۔ اور ایک تو چہرہ جینے کا شیر خوار بچہ تھا۔ ایسے حالات میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سپاہ حسینی میں حضرت عباسؑ کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جسے سپاہی کا درجہ دیا جاسکے کہ یہ لشکر حسینی کا ایک فوجی ہے۔

حسینی کے پاس صرف عباش تھے "وہی سپاہی تھے اور وہی سپاہ۔" اس کے علاوہ تمام مجاہدین دنیا کے "جنگی قوانین کے اعتبار سے" فوجی اور لشکر کے حدود سے خارج تھے۔

مورخ کے اس تجزیہ پر ایک فقرہ کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ کہ یہ امام حسینؑ کی دوسری نگاہ تھی۔ کہ آپ نے عباش کو ستانی کا ذمہ داری دے کر جنگ کرنے سے روک دیا تھا اور تلوار کے بجائے شمشیر دے کر میں ان جنگ میں بھیج دیا تھا۔ اس کا جہاں کربلا پر کسی رخ سے جنگ ہونے کا الزام نہ آئے پائے۔

کربلا کے میدان میں شجاعت عباش کا یہ ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ عباش نے حکم امام کے بعد تلوار کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہایت درجہ سیکسی سے شہید ہونا قبول کر لیا۔ تاکہ میرے مولا کے دامن گردار پر کوئی دھبہ نہ لگنے پائے۔

ورنہ عباش اس صبر و ضبط کا مظاہرہ نہ کرتے اور صرف جرأت و ہمت اور طاقت و قوت ہی سے کام لیتے تو آج کربلا کی جنگ کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔

"امام حسن العابدینؑ نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔"

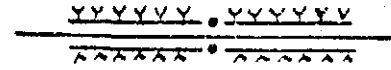
فَتَنَّمُ الصَّابِرُ الْمُجَاهِدُ الْمُحَارِمِ النَّاصِرُ وَالْآخُ الدَّافِعُ عَنْ

أَخِيهِ الْمُجْتَبِ طَاعَةَ رَبِّهِ

رکھا کہنا عباش کا۔۔۔۔۔ وہ بہترین صابر و مجاہد اور حامی و مددگار تھے۔

وہ بہترین بھائی جو اپنے بھائی سے دفاع کر سکے اور اطاعت رب کی آواز پر لبیک کہہ سکے۔

جہاد کے ساتھ صبر اور دفاع کے ساتھ اطاعت رب کا تذکرہ عباسی کی شان شجاعت کا اعلان اور میرے دعویٰ کا مکمل ثبوت ہے۔



علمداری

حضرت عباسی کو بزرگان خاندان سے درآشنا ملنے والے اوصاف و کمالات میں ایک علمداری بھی ہے۔

علم، نشان، پرچم، لوا، رایت، بند، عقاب تقریباً ہم معنی لفظیں ہیں جو مختلف زبانوں میں مختلف حالات کے اعتبار سے استعمال ہوتی ہیں۔ علمداری کی عظمت کا صحیح اندازہ اسی وقت ممکن ہے جب قوموں کی تاریخ میں خود علم اور پرچم کی عظمت کا اندازہ کر لیا جائے گا؟

تاریخ عالم گواہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم نے اپنے پرچم کی اپنی عزت و عظمت کا نشان سمجھا ہے اور اسے اتنی ہی اہمیت دی ہے جتنی پورے ملکی یا قومی وقار کو اہمیت حاصل رہی ہے۔

پرچم کا رواج کل کی دنیا میں بھی تھا اور آج بھی ہے۔ وہ جاہلیت میں بھی رائج تھا اور اسلام میں بھی۔ اس کا سلسلہ مشرق میں بھی ہے اور مغرب میں بھی ہے۔

یعنی یہ کہنا صحیح ہے کہ ملک کے پرچم محدود ہو سکتے ہیں لیکن پرچم کا پرچم ہر ملک و قوم کے سر پر لہرا رہا ہے۔ اور اس کی سر بلندی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

یہی وہ باعزت عنصر ہے جس کی خاطر قوموں کی جانیں قربان کی گئی ہیں۔ اور سرتوں کی بازی لگائی گئی ہے۔

تاریخ باضابطہ طور پر نشانہ ہی سے تو اصرار ہے کہ دنیا کی تاریخ میں پرچم کا درجہ کب سے ہوا اور اس کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟ اس کی عظمت و اہمیت کا حقیقی راز کیا ہے۔

لیکن اجمالی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ در قدیم میں قوموں کی انفرادیت اور ملکوں کی تشکیل کا دھڑا دھڑا رعبہ لشکر کشی اور جنگ و جدل کا سلسلہ تھا اور میدان جنگ میں جانے والے سپاہی غیر منظم و غیر مرتب ہونے کی بنا پر نہ کوئی باہمی نشان رکھتے تھے اور نہ فوجوں کو باخبر کرنے کا کوئی ذریعہ رکھتے تھے۔

فوج بہر حال ایک ترتیب و تنظیم چاہتی ہے اس لئے یہ سوچا گیا کہ اگر ہر قوم اور ہر لشکر اپنا ایک امتیازی نشان مقرر کرے تو فوجوں کو کبھی کرنے میں آسانی ہوگی۔ اور سپاہیوں کو دوست و دشمن کے امتیاز میں بھی سہولت ہوگی جو جن پرچم کے نیچے آجائے گا اسی جماعت میں شمار کیا جائے گا۔

رفتہ رفتہ یہ پرچم میدان جنگ سے بٹ کر ایک استقلال پیدا کرنے لگا اور قوموں نے اسے مستقل شہادت و تکرار بنایا۔ یہ قوم ایک پرچہ بن گئی۔ یہ قوم ایک اور سرسک کا ایک امتیازی نشان معین ہے۔

امتیازات قائم کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اس کے مختلف ابواب ہوتے ہیں اور ہر قوم کے ذوق کے اعتبار سے اس کا تعین ہوتا ہے۔ کوئی قوم مزاجی اعتبار سے جنگجو ہوتی ہے اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ نشان پر جنگی علامتیں بنائی جائیں۔ کسی قوم کو رقص و رنگ سے دلچسپی ہوتی ہے وہ نشان پر دیسے ہی نقش و نگار پسند کرتی ہے۔ کسی قوم کے پیش نظر اسلاف کے کارنامے ہوتے ہیں وہ اپنے پرچم پر ان کارناموں کی

یادگار قائم کرنا چاہتی ہے۔ اور کوئی پرچم کو مذہبی نشان سمجھ کر اس پر مذہبی کلمات تحریر کرتا ہے۔

جس قدر مقاصد و مزاج کا اختلاف ہوتا ہے۔ اسی قدر پرچم کے نقش و نگار میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایک مرحلہ رنگ کا بھی آتا ہے اس میں بھی قوموں کے مزاج کو شدید دخل ہوتا ہے۔ کوئی شرافت کا اعلان کرنا چاہتا ہے تو سفید رنگ اختیار کرتا ہے کوئی فوجی انقلاب لانا چاہتا ہے تو سرخ رنگ منتخب کرتا ہے۔ کسی کے پیش نظر صلح و امن کا پینٹا ہوتا ہے تو سبز رنگ پسند کرتا ہے۔

رنگوں کو مختلف مقاصد کی نشانی قرار دیا گیا ہے اور ہر قوم نے اپنے مقصد کی روشنی میں اپنے پرچم کے لئے ایک رنگ کا انتخاب کیا ہے۔ بسا اوقات تو یہ بھی ہوا ہے کہ ایک ہی قوم کے دو مختلف رنگ کے پرچم رہے ہیں اور دونوں کو الگ الگ مواقع پر استعمال کیا گیا ہے۔ سفید رنگ شرافت کی نشانی بن کر چمکا ہے تو سبز رنگ میدان جنگ میں صلح و آشتی کا پینٹا بن گیا ہے۔

یہ سب سرتوں نے پہنچتے ہوئے نہ کافی مدد فرمائی ہے۔ درخت و قوموں کے پرچم اور ان کے تعلق و رنگ پر عقلی روشنی ڈالی ہے۔ اس موقع پر ان باتوں کے تذکرہ کا کوئی محل نہیں ہے۔

پرچم کی ضرورت کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ اس سے پرچم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور پرچم بلند کرنے والے کی مزاج اور اس کی افتاد طبع کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ مزید تذکرہ تاریخ کا موضوع بن سکتا ہے۔ سیرت نگار کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عربی زبان میں پرچم کے لئے دو لفظیں استعمال ہوتی ہیں۔ لواؤ۔ رایت۔

علمائے اسلام نے اس موضوع پر بھی بحث کی ہے کہ ان دونوں میں کون بڑا ہوتا ہے۔
اور کون چھوٹا۔

بعض حضرات نے روایت کو بڑے پرچم کا نام دیا ہے اس لئے کہ حدیث خیر میں اس کا ذکر کیا گیا ہے اور وہاں مختلف علموں کا کوئی ذکر نہ تھا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ لوہا بڑے پرچم کا نام ہے کہ عسکر کے علم کا نام "لوہ الحمد" ہے جس کے زیر رشتا ایک پوری کائنات محبت سمٹ کر آجائے گی۔
اس مقام پر یہ بحث چنداں دلچسپ نہیں ہے۔ آئندہ کسی موقع پر ان دونوں اقوال کے درمیان حاکم کیا جاسکتا ہے۔

اہمیت پرچم

اقوام عالم کی تاریخ میں پرچم کی اہمیت کا ایک مختصر خاکہ یہ ہے کہ پرچم میدان کارزار میں فتح کی نشانی سمجھا گیا ہے۔ جنگ کے دوران دونوں فوجیں اپنا اپنا علم بلند رکھتی ہیں۔ اور لڑائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جیسے ہی لڑائی فیصلہ کی مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے اور کوئی ایک فریق شکست خوردہ ہو جاتا ہے فوراً اس کا پرچم سرنگوں کر دیا جاتا ہے اور یہ علامت ہوتی ہے کہ حزب اختلاف نے فتح حاصل کر لی۔

دوسری بات یہ بھی ہوتی ہے کہ پرچم علاقائی حکومت کی ایک علامت ہوتا ہے۔ سمندروں میں چلنے والے جہاز اپنے "مالک" کے ملک کا پرچم بلند کر کے دریائوں کی سرکرتے ہیں اور اپنے پرچم سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہ علاقہ کسی حکومت کے زیر اثر یا کسی سلطان وقت کی ملکیت میں ہے۔ صرف ایک پرچم جہاز کی ملکیت کی نشاندہی کے لئے

لہرانا رہتا ہے۔

اس کے بعد جب جہاز کسی ملک کی سرحد میں داخل ہوتا ہے تو فوراً اس ملک کا پرچم بھی لہرا دیا جاتا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ علاقہ "بین الاقوامی" نہیں ہے بلکہ ایک خاص ملک کی ملکیت میں ہے اور کسی خاص بادشاہ کے زیر اثر ہے۔

اس کے علاوہ پرچم ایک قسم کی دراشت کا بھی اعلان ہے۔ جب تک کسی قوم کے سربراہ اس کا دانی و وارث زندہ رہتا ہے اس کا پرچم سر بلند رہتا ہے اور جب ملک و قوم پر کوئی زوال آتا ہے تو سرنگ کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کا پرچم سرنگوں کر دیا جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر اہل دنیا نے مختلف امتیازات رکھے ہیں۔

غیر شکوں کی ہمدردی میں پرچم کا جھکا دینا اور ہوتا ہے اور اپنے غم میں پرچم کا سرنگوں کرنا اور ہوتا ہے۔

یہ سب باتیں علامت ہیں کہ قومی دنیا میں پرچم کی بڑی اہمیت ہے اور اس کے وجود و عدم سے قوموں کی زندگی بے حد متاثر ہوتی ہے۔

اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آج دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر علاقہ میں عباسی کے علم کی سر بلندی اس بات کا واضح اعلان ہے کہ ہر بلا میں فتح عباسی ہی کی ہوتی ہے۔ اور عباس اس فاتح کا نام ہے جس کی فتح کا کوئی علاقہ معین نہیں ہے دنیا کا ہر ملک اور ہر خطہ اس کے مفتوحہ علاقہ میں شامل ہے۔

اس مابعدیے صرف کر بلا و دمشق ہی کا علاقہ نہیں فتح کیا ہے۔ بلکہ "تنظیم لشکر" کے سہارے عالم انسانیت کے دل جیت لئے ہیں۔ اور جب تک کائنات میں انسانوں کا وجود رہے گا اور انسانوں کے دلوں میں مظلوم کی ہمدردی رہے گی عباسی کا پرچم لہرانا رہے گا۔

قومی نظریات سے قطع نظر خود نہ ہی تاریخ میں بھی پرچم کی بے حد اہمیت ہے

مولائے کائنات جنگ صفین کے موقع پر فوجوں کو آمادہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

وَلَا تَمِيلُوا بِرَأْيَا تَكْمُ وَلَا تَزِنُوا وَلَا تَجْعَلُوا هَٰذَا الْأَمْعَ شَجَاعَتِكُمْ
فَإِنَّ الْمَنَاعَ لِبِذِّ مَا رَدَّ الصَّابِرِ عِنْدَ تَرْوُلِ الْحَقَائِقِ أَهْلُ الْحِفَاطِ وَأَعْلَمُوا
أَنَّ أَهْلَ الْحِفَاطِ هُمُ الَّذِينَ يَحْتَفُونَ بِرَأْيَاتِهِمْ وَيَكْتَفُونَ بِهَا وَيَصِيرُونَ
خَلْفَهَا وَأَمَامَهَا وَوَرَاءَهَا وَلَا يُضَيِّعُونَهَا وَلَا يَتَأَخَّرُونَ عَنْهَا فَيَسْلُمُوا
فَهَا وَلَا يَتَقَدَّمُونَ عَلَيْهَا فَيَقْرَبُوا وَفَهَا ————— نَحْ الْبَلَاءِ

ترجمہ :- ”خبردار پرچم اپنے مرکز سے نہ ہٹنے پائے۔ اسے صرف بہادروں کے پاس رہنا چاہیے۔ جو محض مصائب کو برداشت کر سکے اور شائد کا مقابلہ کر سکے وہی محافظ کہا جاسکتا ہے۔ اور جو محافظت کا اہل ہوتا ہے وہی پرچم کے گرد و پیش رہتا ہے اور چاروں طرف سے اس کی حفاظت کرتا ہے محافظ افراد اپنے پرچم کو ضائع نہیں کرتے۔ وہ نہ پیچھے رہ جاتے ہیں کہ پرچم دوسروں کے حوالے کر دیں اور نہ آگے بڑھ جاتے ہیں کہ پرچم کو چھوڑ دیں۔“

ان فقرات سے ایک طرف پرچم کی عظمت و برتری کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے ہر شخص کو علمدار نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کے لئے شجاع، بہادر، محافظ، غیرت دار، ثابت قدم، مستقل مزاج اور صابر انسان کا ہونا بہت ضروری ہے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ کربلا کے میدان میں بے مثل مجاہدین کے ہوتے ہوئے بھی امام حسینؑ کی نظر انتخاب حضرت عباسؑ پر پڑی اور آپ نے انھیں فوج کا علمدار بنایا۔

حضور سرور کائنات نے بھی پرچم کی عظمت کا شدت سے تحفظ فرمایا ہے۔ اور یہ اتنا کیا ہے کہ پرچم اسلام ہر کس و نا کس کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔ اس بات کے مختلف تاریخی شواہد موجود ہیں جن سے صرف چند شواہد کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

احد کی جنگ شباب پر تھی۔ مولائے کائنات تن و تنہا اسلام اور رسول اسلام کا دفاع کر رہے تھے۔ اثناء جنگ میں آپ کے داہنے ہاتھ میں چوٹ لگ گئی اور پرچم اسلام سرنگوں ہونے لگا۔

مسلمانوں نے جا ہا کہ بڑھ کر علم سنبھال لیں۔ آپ نے فرمایا۔ خبردار اسے علیؑ نے بائیں ہاتھ میں دے دو۔ وہی دنیا و آخرت میں میرا علمبردار ہے۔ ان کے علاوہ کئی کویہ علم اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ مناقب ابن شہر آشوب ۳ ص ۱۵۹ نسخ التواتر ج ۳ طبع مجبئی۔

خبر کا معرکہ ہے۔ مسلمان ہریت اٹھا رہے ہیں۔ پہلے دن حضرت عمرؓ تشریف لے گئے اور واپس آئے۔ دوسرے دن حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ تیسرے دن حضرت عمرؓ نے پھر محبت کی لیکن کوئی نتیجہ حاصل نہ ہو سکا۔ آخر کار حضرت سرکار کائنات نے اعلان فرمایا۔ ”کل اس کو علم دوں گا جو کراخبر فرار ہوگا اور صبح کو علم لشکر علیؑ کے حوالے کر دیا۔ علیؑ راہیت لے کر گئے تو میدان کو فتح کئے بغیر واپس نہ آئے۔ (مدارج النبوة ۲ ص ۲۳)

دنیا کے اسلام خیر کی اس تفصیل پر نظر کرے تو اندازہ ہوگا کہ جن طرح ۲۴ رجب کی تاریخ حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی فتح کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے اسی طرح ۲۳، ۲۴ رجب بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔

مستدرک حاکم وغیرہ میں خبر کی پوری روایت دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حضور سرور کائنات نے اپنے علمبردار کے لئے پانچ شرائط کا اعلان کیا تھا۔

۱۔ رَجُلًا۔ مرد میدان۔

۲۔ كَرَّ اِرَا۔ بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والا۔

۳۔ غَيْرُ فَوَاہِمَا۔ میدان سے قدم پیچھے نہ ہٹانے والا۔

۴۔ يُحِبُّ اللّٰهُ وَرَسُوْلَهُ۔ خدا و رسول کا دوست۔

۵۔ يُحِبُّ اللّٰهُ وَرَسُوْلَهُ۔ خدا و رسول کا محبوب۔

(طبری ۳/۹۳، مستدرک ۳/۳۷)

اور حضرت علی ابن ابی طالب انہیں پانچوں صفات کے حامل تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ یہ علمبردار کے پانچ صفات نہیں تھے۔

عالم معنی میں علم اسلام کا پیغمبر تھا جو فتح اسلام کی علامت بنا ہوا تھا اب جس علم میں یہ ”معنوی“ پیغمبر ہو گا وہ فتح کی نشانی بنے گا۔ اور جس پرچم میں یہ پیغمبر ہو گا وہ جھنڈا ہو گا۔ فتح مسبین کی علامت نہ ہو گا۔

اسلامی لشکر جنگ موتہ کے لئے جا رہا ہے۔ حضور سرور کائنات لشکر کی ترتیب کے ساتھ یہ قانون مقرر فرما رہے ہیں کہ سب سے پہلے علم لشکر جعفر طیار کے ہاتھ میں ہو گا اس کے بعد وہ شہید ہو جائیں تو زید بن عاصی علمبردار ہوں گے۔ ان کے بعد نشان فوج عبد اللہ بن رواحہ کے ہاتھوں میں رہے گا۔

لشکر کی تنظیم کے ساتھ علمداری کی ترتیب اس بات کا ثبوت ہے کہ سرسلسلہ اعظم کی نگاہ میں ہر مسلمان مجاہد بھی اس منصب کا اہل نہیں ہے۔

تاریخ یہاں تک بیان کرتی ہے کہ جس وقت یہ مجاہدین میدان جنگ میں داخل ہوئے دے رہے تھے۔ حضور سرور کائنات مسلمانوں کو مسجد میں جمع کر کے اپنے علم غیب کی بنا پر جنگ کے مطالبات فرما رہے تھے۔ علم یہ تھا کہ آپ کی چشم مبارک سے آنسو جاری تھے اور آپ اس حد تک گریہ فرما رہے تھے کہ چمکی بندھ گئی تھی۔

آپ مسلمانوں کو برابر آگاہ کر رہے تھے کہ اب جعفر کی شہادت واقع ہوئی۔ اب زید بن عاصی کا کام آئے۔ اب عبد اللہ بن رواحہ نے جام شہادت پیا۔ یہ اہتمام بھی مسلمانوں کو آگاہ کر رہا تھا کہ علمداری کا مسئلہ اتنا نازک ہے کہ میں اب بھی تم کو باخبر کر رہا ہوں کہ میرے علمداروں نے میری ہدایت پر مکمل طور پر عمل کیا ہے اور اس سے سروموجاؤ نہیں کیا۔

تاریخ کا بیان ہے کہ اسی اثناء میں جناب جعفر کے دونوں ہاتھ قلم ہو گئے۔ اور قدرت نے اسلام کے علمدار کو یہ مخصوص الغام دیا کہ جنت میں دو پر پر از عطا کر دیے اب جہاں بھی چاہیں پوری فضا جنت کی سریر کر سکتے ہیں ملائکہ ان کے ہمراہ ہوں گے اور رحمت الہی سر پر سایہ نگیں۔

درحقیقت یہ الغام علمدار کی عظمت اور علمدار کے مرتبہ کا ایک اعلان ہے جس سے یہ محسوس کرایا جا رہا ہے کہ ہر قانون اپنے پرچم اور اس کے حامل کا احترام کرتا ہے تو اسلام نے بھی اپنے علمداروں کو نظر انداز نہیں کیا۔

جعفر طیار کو جنت میں پر پر از عطا کرنے کے بعد قدرت نے زید بن عاصی کی امتیازی جزا کا اہتمام کیا اور اسلام کے ”آخری لشکر“ میں ان کے فرزند اسماعیل بن زید کو باپ کی وراثت میں لشکر کی سرداری عطا کر دی۔

مسلمانوں نے اس علمداری اور سرداری پر اعتراض بھی کیا۔ لیکن مشیت الہی نے کوئی توجہ نہ کی۔ اور سرسلسلہ اعظم نے مساف اعلان کر دیا کہ یہ اعتراض تم ان کے باپ کے بارے میں بھی کر چکے ہو۔ تمہارے اعتراض کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

مسلمانوں کا اعتراض اور سرسلسلہ اعظم کا جواب دونوں گواہ ہیں کہ علمداری ایک ذی مرتبت عہدہ ہے جسے نہ رسول ہر کس و نا کس کو دینا چاہئے ہیں اور نہ مسلمان ہی اس

کے بارے میں یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ جسے "بزعم خود" نااہل سمجھ رہے ہیں اسے یہ عہدہ دے دیا جائے۔

اس کے علاوہ تاریخ میں اور بھی موارد و مواقع ملیں گے جہاں علم اور علمدار کی غفلت کا اعلان ہوا ہے اور تاریخ اسلام نے اعتراف کیا ہے کہ مرسل اعظم نے اپنا علم کسی نااہل کے ہاتھ میں نہیں جانے دیا۔

علیؑ نہ رہے تو جس سرد میدان کو مناسب سمجھا۔ حامل علم بنادیا اور علیؑ موجود رہے تو کسی کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیا۔

تاریخ علم

تاریخی روایات میں حضرت آدمؑ کے زمانے ہی سے پرچم علم کا ذکر ملتا ہے اور ملائکہ سمادات کے ہاتھوں میں پرچم کا وجود نظر آتا ہے۔

لیکن مذہب کی تاریخ میں سب سے پہلے پرچم کا تذکرہ جناب ابراہیمؑ کے حالات میں ملتا ہے جہاں آپؑ نے پرچم بلند کر کے روم سے مقابلہ کیا تھا اور جناب لوطؑ کو انکی قید سے چھڑا کر لائے تھے۔

اس کے بعد روایات میں کوئی صراحت نہیں ہے لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب الہی کا یہ پرچم اولاد ابراہیمؑ ہی میں رہا اور وہی وقت ضرورت اسے بلند کرتے رہے۔ چنانچہ ارباب سیر کا بیان ہے کہ قریش کا پرچم قحطی بن کلاب کے پاس تھا۔ ان سے جناب عبدالمطلب کی طرف منتقل ہوا۔ اس کے بعد حضورؐ سرور کائنات کی بعثت ہوئی تو آپؐ نے منتقل طور پر یہ پرچم نبی ہاشم کے حوالے کر دیا اور پہلی ہی جنگ میں حضرت علیؑ

کو علمبردار بنادیا۔

اس کے علاوہ ایک لواء جنگ نبی عبداللہؐ میں مصعب بن عمیر کے پاس تھا اس لئے کہ یہ قبیلہ تازہ تازہ اسلام لایا تھا۔ اور مشرکین نے اپنا علم اسی قبیلہ کے ایک آدمی کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا۔

جناب مصعب بن عمیر نے پوری ہمت و جواںمردی کے ساتھ علم کا تحفظ کیا یہاں تک کہ جب دونوں ہاتھ قلم ہو گئے تو سینے سے علم کو نکال لیا اور جنگ کرتے رہے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب ان کی پشت پر نیزہ لگا اور خاک پر گر پڑے۔ رسول اکرمؐ نے فوراً وہ علم بھی حضرت علیؑ کے حوالے کر دیا اور آپؐ روایت دلو اور دونوں کے مالک ہو گئے۔ ارشاد مفید (۲) مناقب ابن شہر آشوب ۱۵۹، طبری ۱۷۴، ابن اثیر ۵۲، وغیرہ۔ تاریخ کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسلام کے تین عظیم علمدار تھے اور تینوں کے ہاتھ قلم ہو گئے۔

جنگ احد میں جناب مصعب کے شانے قلم ہو گئے، جنگ موتہ میں جناب جعفر کے ہاتھ کام آئے اور کربلا میں حضرت عباسؑ نے اپنے شانے قربان کر دیے اور درحقیقت میرے دعویٰ کی ایک دلیل ہے کہ اقوام عالم میں علم کی بے حد اہمیت ہے اور میدان جنگ میں ہر فریق کا خیال ہوتا ہے کہ اگر علم کو سرنگوں کر لیا تو فتح دور نہیں ہے اور اگر علم دار قتل ہو گیا تو لشکر کی ہمت شکنی میں کوئی کسر نہیں ہے۔

امیر المومنین کی شان علمداری کے سلسلے میں "ایک روایت" یہ بھی ملتی ہے کہ رسول اکرمؐ کا زاریت جنگ متقل طور پر سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں رہا کرتا تھا اور جنگ کا موقع آتا تو آپؐ سعد سے لے کر حضرت علیؑ کو دیدیا کرتے تھے۔

جس کے بعد یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ حیات مرسل اعظمؐ میں اسلام کی علمداری کا شرف صرف حضرت علیؑ کے لئے تھا اور اگر کبھی تالیف تطلب یا "کسی مصلحت" کی بنا پر

کسی دوسرے صحابی کو علم دیا بھی تو فوراً واپس لے لیا گیا۔ یہ صرف حضرت علیؓ کی ہستی تھی جس سے علم اسلام واپس نہیں لیا گیا اور روایات نے مختلف شکلوں میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

ابن عبد البر اور علامہ ترمذی کا اعتراف ہے :-
 ”هُوَ الَّذِي كَانَ يَوْمَئِذٍ مَعَهُ فِي كَيْفٍ رَحِيْفٍ“

علیؓ ہی وہ مجاہد ہے جس کے پاس ہر جنگ میں علم اسلام رکھا کرتا تھا
 استیعاب - ترمذی۔

صاحب الرزح المطالب کے الفاظ یہ ہیں :-
 ”كَانَ آخِذًا بِرَأْيَةِ رَسُولِ اللَّهِ يَوْمَ بَدْرٍ وَالْمُشَاهِدِ كُلِّهَا“
 جنگ بداد اور حلیہ معرکوں میں رسول اکرمؐ کا راہیت حضرت علیؓ ہی کے ہاتھ میں تھا

جنگ احد کے بارے میں ابھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہاں بھی راہیت ولواء دونوں حضرت علیؓ کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ خیبر میں علیؓ کے ہاتھوں میں راہیت اسلام اظہر من الشمس تھا۔

خصوصیات علم اسلام

علم اسلام کے بارے میں اس خصوصیت کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ یہ علم دوسری قوموں کے پرتوں کی طرح دست بردست نہیں چلا ہے بلکہ اس کے اٹھانے والوں میں ایک مخصوص امتیاز دیکھا گیا ہے اور اسے مکمل طور پر عزت اسلام کا نمائندہ سمجھا گیا ہے۔

جنگ خیبر کے بارے میں مورخین کا بیان ہے کہ جس وقت مرسل اعظمؐ نے راہیت خیبر کا اعلان کیا اور حضرت علیؓ کے حوالے یہ پرچم اسلام کیا تو آپؐ نے ایک فقرہ ارشاد فرمایا تھا۔
 ”يَا خِذْهَا بِحَقِّهَا“

آج وہ مجاہد مریدان بنے گا جو علم کو اس کے حق کے ساتھ اٹھائے گا۔
 اسلام میں علم کا بھی ایک حق ہے اور علمدار کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم کو اٹھائے تو اس کا حق بھی ادا کرے۔ اسی بات کی طرف جنگ موتہ اور جنگ احد میں اشارہ کیا گیا تھا جس کے بعد قدرت نے صلہ کے طور پر حضرت جعفر طیار کو پروردار عطا فرمائے تھے۔

جنگ جمل کے موقع پر مولائے کائنات نے اپنے عزیز فرزند محمد بن الحنفیہ کو علم لشکر دے کر میدان میں بھیجا تو یہ فرمایا :-
 ”هَذِهِ رَأْيَةُ رَسُولِ اللَّهِ شَرُّ قِطْعٍ“

یہ رسول اللہ کا پرچم ہے جو پلٹا نہیں کرنا۔ اور محمد بن الحنفیہ نے بھی باقاعدہ رادشجاعت دی جیسا کہ شیخ مفید نے کتاب الجمل ص ۱۶۵ پر بالتفصیل ذکر فرمایا ہے لیکن ایک مرحلہ وہ بھی آگیا جب محمد کے قدم ایک لمحہ کے لئے رک گئے اور انھوں نے عرض کی :-

”أَلَا تَرَى الْبَيْتَ هَامَ كَأَنَّهُ شَايِدٌ بِمِطْطَا“

بابا آپ دیکھ رہے ہیں کہ تیروں کا سینہ برس رہا ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا :-

”فَيْلَتْ عِمَاقُ مِنْ أُمْلَةٍ“

یہ تمہاری رگ مادری کا اثر ہے۔

(شرح نہج البلاغہ)

معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن الحنفیہ جیسے مجاہد کے یہاں بھی اگر مسادری سلسلہ میں شجاعت و بہمت نہیں ہے تو کسی بھی وقت میدانِ جہاد میں قدم رکھ سکتے ہیں۔

اب عباس کی عظمت کا اندازہ کیا جائے جہاں قدم کار کنا کیسا۔ تلوار ہاتھ میں نہیں ہے۔ مشکیزہ کی ذمہ داری سر پر ہے اور مجاہد خانی ہاتھ فوجوں سے مقابلہ کر رہا ہے۔

تیروں کی بارش ہو رہی ہے اور عباس یہ نہیں کہتے مولا کسی سیر کا انتظام کر دیکھئے یا تلوار ہی دے دیکھئے!

شانے قلم ہو رہے ہیں لیکن مجاہد پریشان نہیں ہوتا اور کمالِ اطمینان کے ساتھ حق پرچم ادا کر رہا ہے۔ جس علم کو بابائے مرسل اعظم سے لیا تھا اس کی عزت آج بھی سلامت ہے۔

علامت علم اسلام

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ابتدائی طور پر اپنے پرچم کے لئے کوئی مخصوص علامت مقرر نہیں کی ہے اور عرب کے عام دستور کی طرح اسلام کا پرچم بھی سفید ہی تھا۔

اس کے بعد مختلف میدانوں میں مختلف قسم کے پرچم استعمال کئے گئے۔ جنگِ بدر میں جنابِ حمزہ کا علم سرخ تھا اور امیر المومنین کا علم زرد۔ جنگِ احد و خیبر میں لواء اور رایت دونوں سفید تھے۔

(مناقب شہر آشوب ۲۲، قمر بنی ہاشم علامہ مقرر طاب ثراہ)

اس کے بعد ہر قوم نے اپنا ایک مخصوص رنگ قرار دے دیا۔ بنی امیہ نے سرخ رنگ کا انتخاب کیا۔۔۔ بنی عباس نے سیاہ رنگ پسند کیا اور علویین کے حصہ میں سفید رنگ آیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد علویین نے رنگ پرچم بدل دیا اور مستقل طور پر سبز رنگ کا انتخاب کر لیا۔

یہ انتخاب اس قدر رائج ہوا کہ حضرت امام رضا کو دلی عہدِ مملکت بنا دیا گیا تو مامون نے بھی اعلان کر دیا کہ اب حکومت کا رنگ سیاہ کے بجائے سبز ہو گا اور سیاہ رنگ یکسر ترک کر دیا جائے گا۔

امامت کا یہ ایک احسان تھا کہ دلی عہد ہی کا منصب سنبھال کر بنی عباس کی سیاسی کوزا اُٹل کر دیا اور انھیں منہ سے صلح و آتش کا رنگ دے دیا۔ خدا جانے سبز رنگ میں کیا خصوصیت ہے کہ دنیا کی ساری قومیں اسے صلح و آشتی اور امن و امان کی علامت سمجھتی ہیں۔ اور آج بھی سرخ رنگ جنگ کی علامت ہے۔ اور سبز رنگ صلح و اتحاد کی نشانی؟

عجب نہیں کہ دہن بشر میں یہ بھی کر بلا کی دین ہو اور تاریخ نے یہ مزاج دہن سے حاصل کیا ہو کہ سرخ پرچم دالے اپنے نبی کے گھرانے کا خون بہانے پر آمادہ تھے اور سبز پرچم کا علمدار ہاتھ کٹا کر بھی تلوار اٹھانے پر تیار نہ تھا۔

وراثت علم

علمداری کو وراثتی اوصاف میں شمار کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کیونکہ اُدی میراث

اسے فوجوں کی شکست و فتح کی فکر نہیں ہوتی، اصول اور مقصد کے تحفظ کی فکر ہوتی ہے۔ اس کا تمام تر مشاہیر ہر لمحہ کہ میری زندگی رہے نہ رہے میرے اصول زندہ رہیں۔ اور میرا مقصد جہاد باقی رہ جائے۔

مرسل اعظم کے بعد مسلمانوں کی لڑائیوں پر جنگ کی چھاپ کا بنیادی راز یہی ہے کہ مسلم سربراہوں نے میدان کا رخ نہیں کیا اور فوجوں کو محاذ جنگ کی طرف ڈھکیل کر خود کو نصر حکومت میں استراحت کرتے رہے اور وقتاً فوقتاً اپنی فتح کا اعلان بھی کرتے رہے۔

اسلامی مجاہدات کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ مرسل اعظم کا تنہا سپاہی اور اسلام کا واحد مجاہد سر محاذ جنگ پر بنفس نفیس حاضر رہا اور آخر وقت تک دامن کو اپنے پیچھے سے صلح و آتش کی دعوت دیتا رہا۔

مکہ بلا کے میدان میں صبح عاشور سے عصر عاشور تک امام حسینؑ کے متعدد خطبات اعلان کر رہے ہیں کہ امام حسینؑ جہاد راہ خدا کے لئے نکلے تھے جنگ اقتدار کے لئے نہیں۔ اور شام کے دار الحکومت میں بیٹھ کر فوجوں کا محاذ جنگ پر بھیج دینا۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ یزید ایک جنگ جو انسان تھا اور اسے جہاد راہ خدا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

حضرت عباسؑ کا علم اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ فوج حسینیؑ کا منتظم محاذ جنگ پر ہمیشہ آگے آگے رہا۔ اور ایک لمحہ کے لئے کبھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ یہ مجاہد کے مجاہد ہونے کا بھی ثبوت ہے اور جہاد کر بلا کے جہاد ہونے کا بھی اعلان ہے۔

پرچم کی قومی، سماجی اور سیاسی عظمت ہی تھی کہ اردو ادب کے عظیم شعرا نے اسے ایک مستقل موضوع بنا دیا اور حضرت امینؑ نے اپنے مراثنیٰ میں علمداری کو موضوع بنا کر

حضرت عونؑ و محمدؑ اور حضرت عباسؑ کے استحقاق پر ایک تفصیلی بحث کی ہے اور آخر کار اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ علم جعفر طیار کی وراثت نہیں ہے حیدر کرار کی وراثت ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔

حضرت جعفر طیار ایک جنگ میں اسلام کے علمبردار تھے اور حضرت علیؑ ہر غزوہ و جہاد میں علمداری کا شرف رکھتے تھے۔

ان میں مرحوم کا مکالمہ علم کی عظمت اور اس کی برتری کا بہترین اظہار ہے جو ادب کی روح انبیاء کی جان ہے۔ ادب مضمون آنرہی کا نام نہیں ہے۔ بہترین خیالات کے بہترین اظہار کا نام ہے۔

حضرت جمیل منظر ہی نے اپنے بعض مراثنیٰ میں علم کا تذکرہ کرتے ہوئے عصر حاضر کے افکار کی روشنی میں اس کی عظمت کا اعلان کیا ہے اور آخر میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

دل آفاق کی دھڑکن ہے پھر برا اس کا
شعرا و کرام کے تخیلات و افکار کے علاوہ عملی اعتبار سے بھی پرچم کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔

قطب شاہی علم آج تک شہرہ آفاق ہیں۔ حیدر آباد میں عزاداری میں پرچم کو ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے اور اسے ”علم مبارک“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور لعین کے موقع پر میں نے خود یہ منظر دیکھا ہے کہ جب دو علم باہم ملائے جاتے ہیں تو جوش و خروش اور گریہ و زاری کا عجیب سماں ہوتا ہے۔ مومنین اس قدر بے چینی سے گریہ کرتے ہیں جیسے ان کے سامنے یہ منظر ہے کہ سردار لشکر اپنے علمدار سے بغلیں جو رہا ہے اور جعفر طیار و مرسل اعظم کی طرح امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔

یونی کے افضل علی شہر اور جو پور کا علم بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا بیجہ کسی قیمت پر دس پندرہ کلو سے کم وزن کا نہیں ہے اور اسے صرف ایک شخص اٹھاتا ہے جو بیک وقت بیجہ اور پھر مرادولوں کا بار سنبھالتا ہے اور نہایت سکون سے راستہ طے کرتا ہے۔ میں نے بھی اس علم مبارک کی زیارت کا شرف قصہ بڑے گاؤں کے "جلوس عاری" میں حاصل کیا ہے اور اسکے کرامات کا مشاہدہ کیا ہے۔

مراسم عزرا اور علم

اس مقام پر ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پرچم و علم ہر قوم کا ایک امتیازی نشان ہے تو اسے خصوصیت کے ساتھ واقعہ کر بلا کے مراسم عزرائیں شمار کرنے کا کیا مطلب ہے؟ علم صرف لشکر امام حسین ہی میں نہیں تھا کہ اس کی یادگار قائم کی جائے۔ پرچم کا وجود لشکرِ یزید میں بھی ثابت ہے۔

اس سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ علم ہر ایک علم کی یادگار نہیں ہے۔
 یہ علم اس علم کی یادگار ہے جو لشکر امام حسین کا نشان تھا اور جس کا علمدار قمر بنی ہاشم تھا۔

مراسم عزرائیں کسی شے کو بھی اس وقت تک داخل نہیں کیا جاتا۔ جب تک اس کی تبلیغی اہمیت اور مذہبی نوعیت کا جائزہ لے لیا جائے۔

علم کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ ایک وفادار کی وفا کی نشانی ہے جو بلند یوں سے اعلان کر رہا ہے کہ اسے ایک وفادار نے اس شان سے اٹھایا تھا کہ دونوں ہاتھ تلم ہو گئے لیکن لشکرِ علم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔

اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سبق دے رہا ہے کہ علمدار بننے کا حوصلہ ہو تو وہ کلیجہ اور وہ جگر بھی پیدا کر د جس کا سبق کر بلا کے علمدار اور علی کے لال

مَنَازِلُ قِمَرٍ

”وَالْقَمَرُ قَدْ رُفِئَ مَنَازِلُ“

منزلِ اول

آسمان دنیا پر چمکنے والا قمر زبئی سیرِ کمال کو پورا کرنے کے لئے چند منزلوں سے گزرتا ہے۔ ان منازلِ سفر میں دنیا، اس کی خشکی اور تابانی سے استفادہ بھی کرتی رہتی ہے اور وہ نقص و کمال سے اعتبارِ حالات زمانہ کی عکاسی بھی کرتا رہتا ہے۔

ایک منزل ہوتی ہے جب یہ "قمر فلک" طالع ہوتا ہے۔ سنیکڑوں نگاہیں سولے آسمان رہتی ہیں۔ لاکھوں دعائیں ساتھ ہوتی ہیں۔ اربابوں کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ اور گھروں میں رست کی لہر دوڑنے لگتی ہے۔

عہدِ ظلمت کے خاتمہ کی عید۔ عہدِ نور کے آغاز کی عید۔ دیکھتے دیکھتے یہ ماہِ شہادت جہاں تاب و جہ کمال کو پہنچتا ہے اور چوہہ دنوں کے اندر اپنے کمال کی ساری منزلیں طے کر کے دنیا کے سامنے امکان کے عکس کمال کی نمائش کرتا ہے۔

اندھیروں کی روشنی۔ راہوں کا اجالا۔ بے چراغ گھروں کا چراغ۔ بے نور خانہ کائنات کا نور۔ غریبوں کا دیا۔ امیروں کی شمعِ محفل۔ فقیروں کی زندگی کا سہارا اور دیسوں

کی خشکی چشم۔

مسافر شمع راہ سے بے نیاز۔ خانہ نشین چراغ خانہ سے مستغنی۔ ایک مالک
چراغ جگہ کار ہے۔ اور ساری روشنیاں ماریم پڑی ہوئی ہیں۔
لیکن غریب زور! یہ دنیا ہے دنیا۔ اسکان کی دنیا۔ عزت کی دنیا۔ یہاں کمال
ظاہر کے لئے زوال ناگزیر ہے۔ عروج صوری کے لئے سبوتا لازمی ہے۔

ایک رات کا مسافر کمال جب سفر کی منزل میں آگے بڑھتا ہے۔
تو قریبان کمال پر وہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہیں گردش زمین حاصل ہو جاتی ہے۔
کہیں سیر شمس۔ کوئی اس کمال کو بے نہیں رہنے دیتا۔ اور کسی یگانہ حوصلہ
نہیں ہے کہ کمال ظاہر کی حوصلہ افزائی کر سکے

دھیرے دھیرے یہ کمال مہتاب پر دلوں میں پھنسنے لگتا ہے۔ حریف کی طاقت کمزور
رہتی ہے تو تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنا جلوہ دکھا دیتا ہے۔ کس رخ سے بھی اپنے جمال
کی تابندگی کا اظہار کر دیتا ہے۔

لیکن جب حالات بدل جائے، یہاں اور پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔
تو قدرت بھی "نظم عالم کو برقرار رکھنے کے لئے" پوری طاقت کے اظہار کے اجازت نہیں
دیتی۔ اور نتیجہ کے طور پر چند دنوں کے لئے نگاہ عالم سے روپوش ہو جاتا ہے اور عالم تمام اندھیرے
کی دین چلا جاتا ہے۔

اسی وقت لور کی قدر ہوتی ہے اور روشنی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔
لگا ہوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور بدگمانوں کو اپنے اعتراض کا قرار دے
اعتراف ہوتا ہے۔

راہ کمال میں حائل ہونے والوں کو دوام نہیں۔ وہ کتنا بڑا کرہ
سہی۔ وہ کتنی حسین دنیا سہی۔ لیکن ایک وقت ضرور آئے گا جب یہ سب

راستہ چھوڑ کر مٹ جائیں گے اور مہتاب درخشاں پھر اپنا جلوہ دکھا کر دنیا کو اپنے کمال سے
نیفیاب کرے گا۔

دنیا بھی سمجھے گی کہ "تحت الشعاع ڈوب جانے والا قمر" اب کسی کو روشنی نہیں دے
سکتا ہے۔

منازل سفر تمام کر لینے والا مسافر اب دوسرے مسافروں کو فیض نہیں پہنچا سکے گا۔
لیکن چند ہی لمحات میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ سارے تقورات غلط تھے اور بالکمال
اپنے کمال کی روشنی روک نہیں سکتا۔

ماہ فلک کو "قمر بنی ہاشم" سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ آفتاب
کی شعاعوں پر زندہ رہنے والا چاند۔ "مہر اامت کی آغوش کے پروردہ قمر"
کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن قمر کی تشبیہ اپنے اندر ایک معنویت
ضرور رکھتی ہے۔

"قمر بنی ہاشم" کے منازل حیات کو بھی تین حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔
دور تکمیل۔ جب بچہ باپ کے سایہ تربیت سے نیفیاب
ہو رہا تھا اور علی پوری توجہ کے ساتھ اپنی تمناؤں کے مرکز کو اپنے مقصد کا آئینہ دار بنا
رہے تھے۔ حسین کی محبتوں کی چھاؤں تھی اور ام البنین کی آرزوں
کا سایہ۔ روح زہرا دعائیں دے رہی تھی اور تمناؤں کی سرل اعظم
ہائیں لے رہی تھی۔

یہ دور زندگی ۳۶ سے شروع ہو کر سن ۳۷ پر تمام ہوتا ہے۔ جب آفتاب
امامت ضربت ابن ہلیم سے اپنے خون میں ڈوب گیا اور "قمر بنی ہاشم" اپنے کمال کی ماری
منزلیں طے کر چکا۔

قمر فلک کے اسکال کی چودہ منزلیں ہو کر تھیں۔ قمر بنی ہاشم نے بھی زندگی کی چودہ

گزر چکے ہیں اور باقی آئندہ بیان کئے جائیں گے۔

کر بلا کے میدان میں بنی ہاشم کے کمن بچوں کا جہاد اور علی اشغر کا اطمینان نفس گواہ ہے کہ بنی ہاشم کے افراد ایک انفرادی شان کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا قیاس دنیا کے دوسرے بچوں پر نہیں کیا جاسکتا۔ اور جب بنی ہاشم کے عام بچوں کا یہ حال ہے تو قریب بنی ہاشم کا کیا کہنا؟

حضرت عباس نے مولائے کائنات کے زیر سایہ ۴۱ سال کی طویل عمر استعداد و صلاحیت "گزارای تھی اور اس امام برحق سے شرف تربیت حاصل کیا تھا جس کی ایک نگاہ کرم کائنات میں انقلاب برپا کر سکتی ہے۔

یہ ذرہ گرہ نگہ مہر بود تراب کند

یہ آسمان رود کار آفتاب کند

علیؑ کی نگاہ ہر ذرہ کو آفتاب بنا سکتی ہے۔ تو کیا اپنے نورِ نظر کو مایتاب نہیں بنا سکتی۔

۴۱ سال کی عمر کے سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک تاریخی لطف کا ذکر بھی کر دیا جائے۔

یہ لطفہ تاریخ کے طالب علم کے لئے خاص دلچسپی رکھتا ہے اور صاحب تحقیق کے لئے تنقید کے عجیب و غریب مواقع فراہم کرتا ہے۔

اعظم گدھ کے مائے ناز مصنف مولانا شبلی حضور سرور کائنات کے وقتِ آخر کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے واقعہ قرطاس پر تبصرہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ روایتِ روایت کے اعتبار سے ناقابل قیاس ہے۔

لغایتی اعتبار سے صحابہ کرام کے بارے میں یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ محبوب کردگار قلم و دوات مانگیں اور وہ قلم و دوات دینے سے انکار کر دیں یا ان کی شانی

منزلیں آفتابِ امامت کے زیر سایہ گزاری ہیں۔ ظاہری پھر کے اعتبار سے عباسؑ "بالغ" کی حدوں میں تھے۔ لیکن رشد و عقل و فہم و ادراک کے اعتبار سے درجہ کمال پر فائز تھے۔

۴۱ سال کی عمر میں حضرت عباسؑ کے کمال و فہم و ادراک میں شبہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ تاریخ میں "ابن عباس" کی شخصیت کا جائزہ لیں۔ ابن عباس مفسرِ قرآن، جبرامت، دنیاوی اسلام کے معتبر ترین راوی اور علوم دین کے عظیم ماہر شمار کئے جاتے ہیں۔

ان کی شخصیت کے نام پر دنیاوی اسلام سر دھن رہی ہے۔ لیکن ان کی عمر بھی مرسلِ اعظمؐ کے انتقال کے وقت اس سے زیادہ نہ تھی۔ ابن عباس نے رسول اکرمؐ کا اتنا ہی عہدِ حیات دیکھا ہے جتنا حضرت عباسؑ نے مولائے کائنات کا دور زندگی دیکھا ہے۔

ابن عباس پیغمبرِ اسلام کے ساتھ رہ کر اتنے علوم و فنون کے ماہر اور اصحابِ خاص میں شمار ہو سکتے ہیں تو حضرت عباسؑ مولائے کائنات کے نورِ نظر، پارہ جگر، جان و دل اور روح رواں ہو کر اس عظیم مرتبہ کے حامل کیوں نہیں ہو سکتے۔

۴۱ سال کی عمر باصلاحیت افراد کے لئے کم نہیں ہوتی۔ عباسؑ کی غیر معمولی صلاحیت تاریخ کے مسلمات میں ہے۔ مورخین نے یہاں تک لکھا ہے کہ عباسؑ ظاہری نشوونما کے اعتبار سے بھی عام بچوں سے بالکل مختلف تھے۔

مسلمانوں کی چودہ صدیوں کی تاریخ میں بے شمار ہیں جنہوں نے نہایت ہی کمسنی میں اعلیٰ درجہ کے کمالات کا مظاہرہ کیا ہے اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مذہبی نظریات سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی ایسے انسانوں کا وجود ہے جو غیر معمولی صلاحیت و استعداد کے حامل ہوئے ہیں اور عباسؑ یقیناً انہیں افراد میں سے تھے جس کے متعدد شواہد

مشاہدات

تاریخی اعتبار سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ حضرت عباسؓ نے اس دور میں کن حالات کا مشاہدہ کیا اور ان سے کیا حاصل کیا۔

انسان کی تکمیل زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے ان عناصر کا پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔

۲۶ھ کا زمانہ وہ ہے جب امیر المومنینؓ کو شہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے "مسلمان حکومت" کے دور گزار چکے تھے۔ اور "خلافت" تیسرے مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی۔

خلافت کے دور دوم کے بعد یہ بات تقریباً یقینی ہو چکی تھی کہ امت اسلامیہ میں اس بارگراں کو اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔ اور قوم و ملت کے جملہ مسائل کا حل علیٰ ابن طالب کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے۔

لیکن خلیفہ دوم نے وقت آخر شوریٰ کی ایک ایسی ترتیب مقرر کر دی کہ ابن عباس کو فریاد کرنا پڑی کہ لب خلافت امت مک بنی ہاشم میں پلٹ کر نہیں آ سکتی۔ نتیجہ بھی یہی ہوا کہ مو ائے کائنات کے سامنے کتاب و سنت کے ساتھ سیرتِ فاخا

پر عمل کرنے کی شرط رکھ دی گئی اور آپ نے یہ کہہ کر اس شرط کو ٹھکرا دیا کہ میں کتاب و سنت سے مختلف کسی قانون پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

حضرت عثمان نے وقتی طور پر اس شرط کو منظور کر لیا اور اس کے نتیجہ میں تختِ حکومت پر قابض ہو گئے۔ ابن ابی الحدید ۶۳۱، ابن خلدون ۲۶۱، طبری ۳۷۵۔

بنی ہاشم کے دل پر یہ واقعہ ایک گہرا گھاؤ بن گیا اور ہر ایک نے یہ سمجھ لیا کہ اب حکومت ان ہاتھ میں پہنچ گئی ہے جن سے کسی خیر کی امید نہیں کی جاسکتی۔ (کامل ۲۷۱، البراء القدر ۶۵، ۶۶)

تاریخ کے پہلے ادوار بھی بنی ہاشم کے حق میں کچھ کم معیبت کے نہیں تھے لیکن ان میں کم از کم "اسلامی رسوم" اور "ظاہری سادگی" کا رواج تو تھا۔ بنی امیہ سے تو یہ بھی امید نہیں کی جاسکتی۔

سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ جس معاویہ کو خلیفہ دوم نے اپنے سیاسی مصراع کے تحت گورنر بنادیا ہے اس کا اقتدار اور مضبوط ہو جائے گا۔ اور بنی امیہ کو اسلام سے قطعاً کھیل کھیلنے کا موقع مل جائے گا۔

چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ عثمان کی خلافت کے بعد ابوسفیان مبارکباد کے لئے آیا تو سب سے پہلے یہ جملہ کہا کہ:-

اب تیم دعدی کے بعد خلافت تمہارے ہاتھ میں آگئی ہے اسے گیند کی طرح بچاؤ اور بنی امیہ کو مرکزی حیثیت دو۔ یہ ملک ہے ملک۔ یہاں جنت و جہنم کا کوئی گزر نہیں ہے۔ طبری ۳۵۷، مروج الذهب ۴۲۱، ابن عساکر ۶۷۷ اور استیعاب ۶۹۲۔

ظاہر ہے کہ بنی امیہ کے ہر گھر میں اس "جعل سازی" کا ذکر رہا ہو گا اور معاویہ

کے مظالم ان تذکروں میں مزید شدت پیدا کرتے ہوئے۔
ایسے ہی ایک پر آشوب دور میں ابو قحفل العباس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے گرد و پیش
معاصی و آلام کی ایک دنیا دیکھی۔

شدائد کا سمندر موجیں مار رہا ہے اور مظالم کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ معاشرہ
میں ایک ہی چرچا تھا کہ بڑا امیہ نہایت ذلیل، خبیث، سرکش اور باغی قوم ہیں اور بنی ہاشم
روزِ اذل سے مظلوم ہیں۔

یہ حالات حضرت عباسؓ کے دل و دماغ پر نقش ہوئے رہے اور آپ کے ذہن میں دین
و مذہب کے ساتھ قوم و ملت کا درد گہرا لیتا رہا۔

علماء نفسیات کا کہنا ہے کہ ۶ برس کی عمر انسانی تاثرات کی ابتداء فی عمر ہوتی ہے اور
اس عمر میں انسان کے دل و دماغ پر سماج کے اثرات نقش ہونے لگتے ہیں۔

حضرت عباسؓ اپنے پورے معاشرہ میں ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ ان
کے دل و دماغ پر حالات کے نقش ہونے کے علاوہ ان کے علاج کے تقورات بھی ابھر
رہے تھے۔

بچپن کی حدیں طے ہو رہی تھیں۔ اور بنی امیہ کے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کا
جذبہ شدید تر ہو تا جا رہا تھا۔

عباسؓ کے کسی جذبہ کا تعلق دنیا داری یا راحت طلبی سے نہیں تھا۔ ان کے پیش نظر
اپنے باپ کا کردار تھا جہاں پچیس برس کی مسلسل خانہ نشینی کے باوجود انقلاب و احتجاج
کا کوئی کام نہیں شروع ہوا تھا۔

۶ سال سے۔ ۱۰ سال کے اندر کا زمانہ اور شدت کا تھا۔ پورے
اسلامی سماج میں ایک ہیجان برپا تھا اور ہر طرف سے احتجاج و انقلاب کی آوازیں آرہی
تھیں۔

حضرت عثمان کی ناماقتب اندیشی سے ایک عام طوفان پیدا تھا اور ہر طرف ان کی
زیادتوں کا چرچا ہو رہا تھا۔ کہیں اصحاب رسولؐ کے قتل کا ذکر کہیں
محبان آل محمدؐ کے معاصی کا تذکرہ۔ کہیں حضرت ابوذرؓ کی جلاوطنی کی
فریاد۔ اور کہیں احکام شریعت میں ترمیم و تفسیر کے خلاف "شور
انقلاب"۔

ساری اسلام گواہ ہے کہ حضرت ابوذرؓ کو صرف اسلامی احکام کی تبلیغ کے جرم
میں شہید کر دیا گیا تھا۔ مردوخ الذمہب ا۳۳۰: ابن ابی الحدید ا۳۲۰ فتح الباری
۳۳۰: تاریخ یعقوبی ۱۳۵۲ بخاری زکوٰۃ۔

منیٰ میں قسریٰ پڑھی جانے والی نماز پوری پڑھی جانے لگی تھی۔ بخاری ۱۰۲۲: مسلم
۲۶۶۲: احمد ۲۵۸۲۔

بنی امیہ میں داد و دہش کا سلسلہ اس قدر عام ہو گیا تھا کہ اللہ کی پناہ۔
ایک ایک نااہل کو لاکھوں کی دولت تقسیم کی جا رہی تھی۔ اور مسلمانوں کا بیت المال اقربا
پروری پر صرف ہو رہا تھا۔

علامہ امینی طاب ثراہ نے العذیر میں ان عطا یا کی ایک فہرست مرتب کی ہے جس کا
مختصر خاکہ یہ ہے :-

شخصیت	دینار	حوالہ
مردان	۵۰۰۰۰۰	معارف ۸۴۔ ابو الفداء ۱۳۱۰: الناب
	۳۵۵	
ابن ابی سرح	۱۰۰۰۰۰	تاریخ ابن کثیر ۱۵۲
طلحہ	۲۰۰۰۰۰	

شخصیت	دینار	حوالہ
عبدالرحمن	۲۵۶۰۰۰۰	طبقات ۹۶، مردوخ الذہب ۴۳۲
		لیقونی ۲۳۶
لیعلیٰ بن امیہ	۵۰۰۰۰	مردوخ الذہب ۴۳۲
زید بن ثابت	۱۰۰۰۰	"
ذاتی ملکیت	۲۰۰۰۰ + ۱۵۰۰۰۰	استیعاب ۲، ۴۶، طبقات ۳۷
		انساب ۳۳

کل میزان :- ۴۳۱۰۰۰۰ دینار

شخصیت	درہم	حوالہ جات
حکم	۲۰۰۰۰	انساب ۵۲
آل حکم	۲۰۲۰۰۰	
حارث	۲۰۰۰۰	انساب ۵۲
سمید	۱۰۰۰۰	" ۲۵۵
دلیہ	۱۰۰۰۰	عقد فرید ۲، ۲۴۲
عبداللہ	۶۰۰۰۰ + ۳۰۰۰۰۰	" ۲، ۲۶۱، معارف ۸۴
		ابن ابی الحدید ۶۹
ابوسفیان	۲۰۰۰۰	شرح ابن ابی الحدید ۶۱
مردان	۱۰۰۰۰	
طلحہ	۲۲۰۰۰۰ + ۳۰۰۰۰۰	طبقات ۳، ۱۵۵

شخصیت	درہم	حوالہ جات
زبیر	۵۹۸۰۰۰۰	انساب ۵۷، مردوخ الذہب ۴۳۲
ابن ابی وقاص	۲۵۰۰۰۰	شرح بخاری باب برکہ غازی ۵۲
		طبقات ۳، ۱۵۵، مردوخ الذہب ۴۳۲
ذاتی ملکیت	۳۰۵۰۰۰۰	

میزان کل ۱۲۶۷۷۰۰۰۰ درہم

اس کے علاوہ ایک آخری جرم جس کے بعد آپ کی زندگی بحال ہو گئی اور آپ کو بالآخر موت سے ہم کنار ہونا پڑا۔ اصلاح حال کا تقاضا کرنے والوں کے ساتھ وہ غیر اخلاقی اور غیر انسانی برتاؤ تھا جو سیاست کی دنیا میں شائد قابل قبول ہو۔ لیکن سیاست مذہب میں کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

مسلمانوں کے دغدغے آتے رہے۔ حالات کی اطلاع کرتے رہے۔ اصلاح حال کا تقاضا ہوتا رہا۔ لیکن آپ کا صرف ایک جواب تھا۔ "یہ مردان کی حرکت ہے" "یہ امر وزارت سے تعلق رکھتا ہے" "اس کا صدر مملکت سے کوئی تعلق نہیں ہے"

مسلمانوں نے عاجز آ کر یہاں تک کہہ دیا کہ مردان کو نکال باہر کیجئے۔ گورنروں کو تبرا کیجئے۔ دوسرے عمال مقرر کیجئے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ نے بھی ہر موقع پر اصلاح امر کی کوشش کی اور ایمان میں پڑ کر منافقت کرانا چاہی۔ لیکن خلافت کے نشہ میں چور بادشاہ کے دہن میں کوئی بات نہ آ سکی

اور مردانیت کے غلبہ نے انھیں تیاہ و برباد کر دیا۔

امت کا ایک مطالبہ قبول بھی کیا گیا تو اس انداز سے کہ ایک شخص کو گورنر بنایا گیا اور دوسرے کو اس کے قتل کا فرمان بھیج دیا گیا۔

(الوفاء ۱۷۹ طبری ۳/۳۹۱)

خط بکڑا گیا۔ حالات بد سے بدتر ہوئے۔ اور اختلافی جماعت نے ہر عذر کو صفحے سے انکار کر دیا۔ آخر کار وہ موقع بھی آگیا جب مسلمانوں کا یہ بادشاہ اپنے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اور "یوفا امت" نے اپنے حاکم کا کوئی ساتھ نہ دیا۔

امت تو امت وہ گورنر جو بادشاہ کے دم قدم سے زندہ تھا اور جس کی ساری شہریت اسی حاکم کی دی ہوئی چھوٹ کا نتیجہ تھی اس نے بھی ہر ممکن انداز سے علی انکار کر دیا اور شام کی فوجیں مدینہ کے باہر ہی کٹھہری رہیں۔ حاکم امت قلعہ میں محصور ایک ایک قطرہ پانی کا مطالبہ کر رہا تھا اور امت اپنی خلافت سازی کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔

یہ حضرت علیؑ کا حکم تھا کہ انھوں نے ایسے نازک وقت میں بھی حاکم کی امداد کی اور اپنے بچوں کو خطرہ میں ڈال کر پانی بھیج دیا۔ اختلاف اپنے مقام پر ہے لیکن پیاسے کو پانی پلانا ایک اسلامی شعار ہے۔

ساتی کوثر کا طرز عمل صاف اعلان کر رہا تھا کہ اسلام میں "واجب القتل" کو بھی پیاسا نہیں قتل کیا جاسکتا۔

حزب اختلاف خلیفہ کو واجب القتل سمجھا ہے تو یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس طرح پانی بند کر دیا جائے اور کسی شخص کو تیغ و خنجر کے بجائے تشنگی اور گرسنگی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

۸۔ ارضی الحجہ کو محاصرہ کرنے والی جماعت اپنے عزائم کا مایاب ہوئی اور "حزب اختلاف" نے گھر کے اندر داخل ہو کر خلیفہ کی زندگی کا ٹھکانہ کر دیا۔

حالات کا صحیح جائزہ لینے والے جانتے ہیں کہ اس خون کی تمام ترمذہ داری ان افراد پر ہے جنہوں نے انھیں حکومت پر بیٹھایا تھا اور پھر انداز کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ذمہ داری ان افراد پر ہے جس نے ان کے نام پر ہر بد سے بدتر کردار کا نظا ہر کیا اور اس کے نتائج کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

ان شامی گورنر معاویہ بن ابی سفیان پر ہے جس نے انداد کا وعدہ کر کے حوصلے تو بڑھا دیئے لیکن عین وقت پر اپنے لشکر کو مدینہ سے باہر روک دیا اور خلیفہ کے قتل کے بعد واپس شام بلالیا۔

اس زوج رسول پر ہے جس نے "أُتُكِلُوا لَعْنَةُ اللَّهِ" کا نعرہ لگا کر ان کے خلاف آمادہ کر کے ان کا خون کر لیا تھا۔ (طبری ۳/۳۸۹)

اتنے بڑے مدینہ میں ایک سہرورد جماعت کا نہ پیدا ہونا حیرت انگیز تھا۔ لیکن ام المومنین حضرت عائشہ کی قومی اہمیت اور ان کے زوج رسول ہونے کے احترام کو پیش نظر رکھنے کے بعد حیات آسان ہو جاتی ہے۔ امت کو اپنے رسول کی زوج سے عقیدت تھی اور وہ ان کے ارشادات کو بڑی توجہ کے ساتھ ناکرتی تھی۔

اب اگر وہی خاتون اختلاف پر آمادہ ہو جائے اور کھلے عام قتل کا فتویٰ دینے لگے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ امت خلیفہ کے کسی احترام کی قائل رہ جائے اور ان کی حفاظت کو کوئی بھی شرعی امر سمجھے۔

یہ امت ایک ناکرہ گنہگار کے خلاف اجتماع کر سکتی ہے اور جبل کا پورا سنگامہ کھڑا کر سکتی ہے تو اس کے لئے وہاں سنگامہ کرنے میں کیا زحمت ہے جہاں سارے حالات اپنی آنکھوں کے سامنے ہوں اور حکومت کی بے راہ روی کا مسلسل مشاہدہ ہو رہا ہو۔

خلیفہ سوم کا قتل واقع ہو گیا۔ لاش تین دن تک پڑی رہ گئی۔ مسلمانوں میں جرات رخن بھی نہ ہوئی۔

شام کے لشکر کو بھی یہ ”توفیق“ نہ حاصل ہو سکی اور آخر کار حزب اختلاف کے شدید احتجاج کی بنا پر مسلمانوں کے قبرستان سے الگ یہودیوں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

(طبری ۳-۴۸۶)

عثمان کا قتل ہوا تھا کہ حکومتوں کے زیر اثر رہنے والی امت نے اپنے کو بے دانا وارث سمجھنا شروع کر دیا۔ اور ایک نئے خلیفہ کی فکر لاتی ہو گئی۔

(الامتہ والسیاستہ ۴۵)

ارباب ہوس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ پہلے یہ کوشش کہ خود ان کی جماعت کا کوئی آدمی منصب پر آجائے اور اگر بدلے ہوئے حالات میں رائے عامہ اس بات کا موقع نہ دے تو کسی ایسے آدمی کو خلیفہ بنایا جائے جس سے خلافت کے نام پر بے پناہ دہرہ داریوں کا مطالبہ کیا جائے اور ان کے پورا نہ ہونے کی شکل میں اس سے بھی اپنے غرام کا انتقام لے لیا جائے۔

چنانچہ خلیفہ ساز جماعت کے رکن اعلیٰ طلحہ و زبیر سیدان میں آگئے اور امت کے رجحان کا اندازہ کر کے اپنا نام پیش کرنے کے بجائے حضرت علیؑ نے پاس آئے آپ سے تقاضہ کیا کہ آپ خلافت کو قبول فرمائیں۔

آپ نے شدت سے مخالفت کی اور فرمایا کہ :-

”میں روزِ ازل بھی اس امر کا اہل تھا لیکن اس وقت یہ خلافت نہیں دی گئی تو آس کا کیا عمل ہے؟“

مجھے ایسی حکومت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ آپ اس کے لئے کوئی دوسرا حقدار تلاش کر لیں۔

گرفتاریوں میں پھنسی ہوئی امت جائے تو کہاں جائے؟ مشکلات کٹائے وقت سے پھر فریاد شروع کی اور علیؑ کی دو شرطوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ ۱۰-۱۲ سال کے

اندرونا غظیم انقلاب آگیا کہ کل علیؑ کے سر پر شریطیں بار کی جا رہی تھیں۔ اور آج ان کی تمام شرطوں کو اپنے سر پر جگہ دی جا رہی ہے۔

شریطیں قبول کی گئیں اور مولائے کائنات نے بدرجہ مجبوری مسلمانوں کی بیعت قبول فرمائی۔

بیعت تمام ہو گئی۔ لیکن طلحہ و زبیر کے دل میں یہ حسرتیں کڑھیں بدلتی رہیں کہ ہمیں حالات نے کس قدر مجبور کر دیا تھا کہ ہم جیسے مستحقین خلافت کو دوسروں کی بیعت کرنا پڑی۔

حالات ناسازگار تھے تو یہ بھی ہو گیا۔ لیکن اس کے لئے کوئی دوسری نگر گنا ضروری ہے

باجی مشورے ہوئے اور یہ طے پایا کہ اس کارِ بار کے لئے ام المومنین کو ذریعہ بنایا جائے۔ ان کا قوم میں احترام ہے اور ان کی آواز میں اثر ہے۔ ظاہر ہے کہ جو قوم ان کے کہنے سے امتدادِ حاکم کا خون برداشت کر سکتی ہے وہ خانہ نشین علیؑ سے اختلاف کیوں نہیں کر سکتی۔

یہ طے کر کے نہایت ”سعادت مندی“ سے مولائے کائنات کی خدمت میں عرض کی۔ ”ہم دونوں عمرہ کے لئے مکہ معظمہ جانا چاہتے ہیں۔ ام المومنین اس وقت مکہ ہی میں تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس عمرہ سے غداری کی بو آتی ہے لیکن اگر جانا ہی چاہتے ہو تو جاؤ۔“

مولائے کائنات یدِ بے ہوئے حالات و حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے مکمل طور پر تیار تھے۔

اس لئے آپ نے نہایت ہی اطمینان و سکون کے ساتھ دونوں کو اجازت دیدی۔ اور حالات کا جائزہ لینے لگے۔ اب صرف اس وقت کا انتظار ہے جب

ان دونوں کی سازش کا اگرچہ اور اسلام ایک نئے فتنے کا شکار ہو جائے۔

طلحہ و زبیر مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور ادھر ام المومنین مکہ سے حج تمام کر کے مدینہ کی طرف آ رہی تھیں۔ راستہ میں دونوں کی ملاقات ہو گئی انھوں نے سب سے پہلے عثمان کے بارے میں دریافت کیا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کی نگاہ میں جس منصوبہ کی اہمیت ہوتی ہے اسی کا ہر وقت خیال رہتا ہے اور دہن میں اس کا خاکہ گردش کیا کرتا ہے۔ ام المومنین نے ”قتل عثمان“ کے لئے بے پناہ کوشش کی تھی۔ ان کے خلاف فتوے جاری کئے تھے۔ قیصر رسول کو دکھلا کر امت کو درغلا یا تھا کہ ”ابھی یہ قیصر مسمی نہیں ہوئی ہے۔ اور تم نے سنت رسول کو بدل ڈالا ہے۔“

فطری طور پر انھیں نتائج کی فکر ہونا ہی چاہیے تھی۔ ان کا یہ سوال بالکل بر محل تھا کہ عثمان کا کیا حشر ہوا۔ اور حضرت عثمان کے قتل کی خبر پر ان کا مسرور ہونا بھی بے محل نہ تھا۔ تاریخ یعقوبی ۲/۱۵۷

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قتل عثمان کے بعد جب حضرت علیؑ کی خلافت کی خبر سنی تو بلاناصلہ عثمان کی مظلومیت کا اعلان کر دیا اور انتقام ”خونِ ناحق“ کے نام پر صف آرائی کے لئے تیار ہو گئیں۔ طبری ۳/۲۶۹

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو صرف عثمان کی حیات کے خاتمہ سے دلچسپی نہ تھی بلکہ عہدہ خلافت سے کبھی آپ کی دلچسپیاں وابستہ تھیں اور آپ نے سارا اور طلحہ و زبیر کی خلافت کے لئے صرف کیا تھا اور جب ان دونوں نے اپنے منصوبوں کی ناکامی کی خبر دی اور بتایا کہ امت کے حالات اپنے حق میں سازگار نہیں ہیں۔ قوم نے حضرت علیؑ کی بیعت کر لی ہے تو یکبارگی برہم گئیں اور حکومت کی مالالٹھی کا شکوہ کرنے کے بجائے علیؑ سے خونِ عثمان کا انتقام لینے پر آمادہ ہو گئیں۔

واقعات پر تفصیلی تبصرہ مقصود نہیں ہے۔ صرف تاریخی پس منظر کا سامنے لانا مقصود ہے۔

ورنہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عائشہ کو شرعی اعتبار سے کسی شخص کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا حق نہیں تھا۔

وہ سرزمینِ قتل سے دور تھیں۔ انھیں حالات کی صحیح اطلاع نہ تھی۔ ان کا پہلا فرض تھا کہ جن افراد کو قاتل سمجھ رہی تھیں انھیں اپنے منصوبہ کی کامیابی پر مبارکباد پیش کریں اور اگر یہ ممکن نہیں تھا اور خلیفہ کے بارے میں ان کی رائے بدل چکی تھی تو کم از کم تحقیق حال کرنے کے لئے یہ کہیں کہ آپ کے بارے میں قتل عثمان کی شکایت ملی ہے۔

نہ یہ کہ بے سرد سامان خبروں پر ایک ایسے شخص سے انتقام لینے پر تیار ہو جائیں جو آخر وقت تک خلیفہ کے لئے پانی کا انتظام کرتا رہا اور قعرِ حکومت کے باشندوں کو پیاس سے ہلاک نہ ہونے دیا ہو۔

حضرت علیؑ کی کوئی خطا ہے تو یہی ہے کہ انھوں نے ”حضرت عائشہ“ کے منصوبہ کے خلاف خلیفہ کی مدد کی انھیں پانی سے محروم نہیں کیا۔ اس کے علاوہ کسی اور جرم و خطا کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت عائشہ کو عثمان کے ورثہ میں کبھی نہ تھیں انھیں انتقام کا حق پیدا ہوتا۔ ۹

توازنی اعتبار سے حاکمِ وقت اور خلیفہ المسلمین کا عہدہ حضرت علیؑ کے پاس تھا۔ انتقام کی کارروائی انھیں کرنا چاہیے تھی۔ حضرت عائشہ کو یہ حق کہاں سے پیدا ہو گیا۔ ۹

انھیں انتقامی کارروائی کرنا تھی تو مہمبیدی طور پر خلیفہ المسلمین بھی سے ملنا

کہ باپ کی گودی سے توحید کا بیجام دیا ہے اور واضح لفظوں میں اعلان کر دیتا کہ جس زبان سے ایک کہہ دیا اس زبان سے دوسرے نہیں کہا جاسکتا۔

حضرت عباسؓ نے اپنے گھرانے کے عظیم کردار کے علاوہ دنیا کے اسلام کے بدلتے ہوئے حالات کا بھی جائزہ لیا ہے اور یہ دیکھ لیا ہے کہ یہ امت علیؑ جیسے بلند کردار دنیا سے بھی دنیا نہیں کر سکتی تو کسی دوسرے کا کیا ذکر ہے۔

بنی امیہ ہاشمی گھرانے کے ساتھ دین اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں۔ اور ہمارے گھروالے ہر ممکن قربانی دے کر اس دین کا تحفظ کر رہے ہیں۔ پدر بزرگوار نے عزت دین کی خاطر تخت حکومت کو چھوڑ دیا۔

حکام جور کی تائید نہ کرنے کی بنا پر شدید مصائب کا سامنا کیا۔ حق کی پاسبانی کے جرم میں ۲۵ سال خانہ نشین رہے۔

۱۰۰ برس رسولِ عربیؐ کے تحفظ میں جمل کی لڑائی کا مقابلہ کیا ہے۔ اور نہ جانے کس طرح ایسے نازک حالات میں زندگی گزاری ہے۔

ایسے حالات ایک عام انسان کے اندر بھی دین کی حفاظت کا جذبہ اور اموی سازشوں کے بے نقاب کرنے کا حوصلہ پیدا کر سکتے ہیں۔ عباسؓ کی منزل تو بہت بلند ہے۔ ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا کوئی مشکل نہیں ہے کہ اگر دین کی خاطر تخت حکومت چھوڑا جاسکتا ہے تو فرات کا کنارہ چھوڑ دینے میں کیا اوجھ ہے اگر مذہب کے نام پر خانہ نشینی اختیار کی جاسکتی ہے تو وطن چھوڑ کر غربت کی زندگی بسر کرنے میں کیا تکلیف ہے

تحفظ اسلام کے لئے ذوالفقارِ نیام میں رہ سکتی ہے تو امامِ وقت کے اشارہ پر تلوارِ نیام میں کیوں نہیں رہ سکتی۔

عباسؓ کے علاوہ کوئی دوسرا انسان ہوتا اور علیؑ کے علاوہ کسی اور کی آغوشِ تربیت

میں پروان چڑھا ہوتا۔ تو اس کے ذہن میں حکومت کے خلاف انتقامی جذبات کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ اسے ہر آن یہی فکر ہوتی کہ کس طرح اپنے خالین سے بدلے لیا جائے اور ان کے وجود کو صفحہٴ تاریخ سے محو کر دیا جائے۔ اب تو اپنے گھر میں ظاہری اقتدار بھی آچکا ہے اور عرب و عجم کی عظیم حکومت کا تخت زیرِ قدم ہے۔

عراق بیت کئے ہوئے ہے۔ ایران کردار کی بلندی پر قربان ہے۔ علمی وقار گروہوں کو خم کئے ہوئے ہے اور چین تدبیر پر سارا عالم اسلام نازاں ہے۔ ایسے حالات میں انقلابی ہم کا جلا دینا اور دشمن کو ایک ایک کر کے تباہ و برباد کر دینا ایک فطری امر تھا۔ جسے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔ . . .

لیکن عباسؓ علیؑ کی آغوش کے پروردہ تھے۔ انھوں نے مولائے کائنات کی حیات و سیرت کا مطالعہ کیا تھا۔

ان کے پیش نظر اموی مظالم کے ساتھ باپ کا عظیم کردار بھی تھا جو روادار سے اپنے حقوق کی پامالی پر صبر کر رہا تھا اور مسلسل اعلان کر رہا تھا کہ اگر حفاظتِ دین مقصود نہ ہوتی اور امت کے منقلب ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو مجھ سے بڑی طاقت کا حامل کون تھا اور مجھ سے بڑا انقلاب کون لاسکتا ہے؟

عباسؓ اسی دل و دماغ کے ایک انسان کا نام تھا۔ ان کی رگوں میں علیؑ کا لہو تھا تو دہن و دماغ میں علیؑ کے افکار۔ . . . بازوؤں میں علیؑ کی طاقت تھی تو زندگی میں علیؑ کی تربیت کے آثار۔

جمل کا پورا ادا تھے عباسؓ کی نگاہوں کے سامنے گزر گیا۔ اور بنی ہاشم کے کمسن بچا ہی نے ان تک نہ کی۔

الغاف والے بتائیں کہ کیا اس وقت عباسؓ کی رگوں میں خونِ شجاعت بہاؤش نہ رہا ہوگا۔

کیا علی کا شیر بیچ و تاب نہ کھارہا ہوگا۔

کیا فطرت بشر میدان جنگ میں کود پڑے پر آمادہ نگرہی ہوگی۔

یقیناً یہ سب رہا ہوگا لیکن عباس صرف طاقت کے دھنی کا نام نہیں ہے۔

عباس علم و عرفان کا پیکر ہے۔ امام وقت کی مصلحت کا عارف ہے۔ عباس کو بخوبی معلوم ہے کہ اذن امام کے بغیر جہاد نہیں ہو سکتا اور امام وقت سے بہتر کوئی مصلحت جہاد کا واقف و عارف نہیں ہے۔

جمل کا واقعہ تمام ہوا۔ اور علی کے شیر دل فرزند نے است کے حالات کے ساتھ باپ کے بلند کردار کا مکمل طور پر مشاہدہ کر لیا۔

حالات انسانی زندگی پر بہر حال اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور غیر معصوم اپنے گرد و پیش کے حالات سے بہت کچھ حاصل کرتا ہے۔ حادثات زمانہ انسانی ذہن کو تختہ اور انسانی غم کو مستحکم بناتے رہتے ہیں۔

ناز و نفہم کا پلا ہوا انسان مصائب کے مقابلہ میں سفر کے درجہ پر ہوتا ہے اور اندھیوں اور ٹولفانوں سے کھیلنے والا بچہ مصائب و آلام کے مقابلہ میں جوان ہوتا ہے۔

علمدار کمر بٹا کی تاریخی زندگی کو دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ آسان ہے کہ عباس عمر میں کتنے ہی گھنٹوں علم و عرفان میں کامل، حالات کے تجزیہ میں ماہر۔ قوت فیصلہ کے اعتبار سے مکمل اور غم و دہشت کے اعتبار سے کسی جوان سے کم نہ تھے۔

علامہ خوارزمی کی یہ روایت بالکل صحیح ہے کہ عباس صفین کے میدان میں ایک "کامل مرد" تھے۔ اس سال کا بچہ مرد کامل کہتے جاتے یا حقدار نہیں ہوتا۔ اس عمر کے انسان پر عربی زبان کے اعتبار سے مرد کو بھی اطلاق نہیں ہوتا۔

چہ جائیکہ مرد کامل

لیکن ابو الفضل العباس کے حالات کا تجزیہ گواہ ہے کہ وہ ایک مرد کامل تھے اور ان کی زندگی یقیناً ایسی تھی کہ انھیں مرد کامل کہا جائے۔

وہ علم و عرفان کے اعتبار سے بھی کامل تھے اور غم و دہشت کے اعتبار سے بھی۔ فن حرب کے اعتبار سے بھی کامل تھے۔ اور جذبہ خدمت کے اعتبار سے بھی۔ ان کا کمال ان کی میراث تھا۔ ان کے عزائم کی بلندی انھیں اب وجد سے ملی تھی۔

ان کے ارادوں کی پختگی ان کی آغوش تربیت کا عطیہ تھی ان کا حوصلہ جہاد ان کے نسل ابو طالب میں ہونے کا نتیجہ تھا۔

جنگ صفین

حضرت عباس کو اپنے حوصلوں کی تکمیل کا پہلا موقع صفین کے میدان میں ملا۔ جب پدر بزرگوار نے خود اپنے فرزند کو ایک نئے انداز سے میدان جنگ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اور عباس نے اپنے مکمل جوش و خروش کے ساتھ میدان جنگ میں قدم رکھا۔

صفین کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ جمل کی دافع شکست کے بعد حاکم شام نے یہ محسوس کر لیا کہ علی کا اقتدار بڑھ چکا ہے اور اب یہ اسکاں قوی ہے کہ وہ نجد

سے سخت ترین محاسبہ کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

اسلامی میزان و معیار پر میرا حساب دینا سخت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

بہتر ہے کہ کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر کے علی پر دوبارہ جنگ مسلط کر دی جائے تاکہ وہ خانگی مسائل میں مبتلا ہو کر جنگ کی تیاری میں مصروف ہو جائیں اور مختلف علاقوں کے عمال سے کوئی محاسبہ نہ کر سکیں۔

ظاہر ہے کہ اس تحریک میں ہر باغی اور خائن عامل کا شامل ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کس بنیاد پر علی کے مقابلہ میں کھڑے ہوں گے اور اپنی جان بچانے کی فکر کریں گے۔

علی کی حکومت یا ان کی اسلامی تنظیم میں کوئی عیب نکالنا آسان کام نہیں ہے عیب نکالنا تو بڑی بات ہے، عیب تراشنا بھی ایک ناممکن سا امر تھا۔ حاکم شام نے کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ابھی قوم کے دل میں انتقامی جذبات زندہ ہیں بلکہ شدید تر ہو چکے ہیں۔

اب تک صرف قتل عثمان ہی کے انتقام کی بات تھی۔ اب مختلف گھراؤں میں قتل کے مقتولین کے ورثہ کا بھی ایک گروہ تیار ہے۔ ان سے بروقت فائدہ اٹھالینا اور ان کے جذبات کو براہِ نیتہ کر کے اپنا مطلب بحال لینا وقت کی بہترین سیاست ہے۔ حاکم شام کے لئے کامیابی کی ایک راہ یہ بھی تھی کہ ام المومنین کا کوئی رابطہ اموی خاندان سے نہ تھا۔ ان سے محاسبہ نہایت آسان تھا کہ آپ کا کوئی تعلق اس خاندان سے نہیں ہے۔ لہذا آپ خون عثمان کی وارث نہیں ہیں۔ اس کا حق صرف ان کی اولاد اور ان کے ورثہ کو پہنچتا ہے۔ لیکن حاکم شام کے ساتھ یہ کمزوری نہ تھی؟

”بہر حال اسی خاندان کی ایک فرد اور ”حشیم و جراح“ تھا۔ اسے یہ کہنے کا حق تھا۔

کہ میرے خاندان کا خون ہوا ہے۔ مجھے قاتل سے انتقام لینے کا حق ہے۔۔۔۔۔ اور امت بھی اس بات کو بادر کر سکتی ہے۔

بھلا وہ امت جو بلا سبب عائشہ کا ساتھ دے سکتی ہو اور بیعت کے بعد علی سے مقابلہ کر سکتی ہو۔ اس کے لئے معاویہ کی بات کے بادر کر لینے میں کیا زحمت تھی؟

چنانچہ معاویہ نے خون عثمان کے نام پر ”خونِ جمل“ کے انتقام کی تیاری شروع کی۔۔۔۔۔ اور اپنے ہر عیب پر پردہ ڈالنے کا انتقام کر لیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں شام کی ایک لاکھ بیس ہزار فوج تیار ہو گئی اور سارا لشکر مقام صفین کی طرف روانہ ہو گیا۔

امیر المومنین کو اپنے علاقہ میں لشکر کے آنے کی اطلاع ملی تو آپ بھی ایک لشکر کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

راتے میں آپ کا گزر سرزمینِ کربلا سے ہو جہاں آپ نے ٹھہر کر انوہا ادا اپنے فرزندِ حسینؑ کی شہادت کو یاد کر کے فرمایا۔

”صَبْرًا يَا عَمْبِلَ اللّٰہِ“

حسین! اٹھیں اس منزل پر صبر کرنا ہو گا۔

اصحاب حیران تھے کہ مولایہ کیا فرما رہے ہیں۔ اور کسے تلقینِ صبر کر رہے ہیں؟ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یرمہ راز کھل گیا۔ اور ۶۱ھ میں وہ موقع بھی آگیا جسے یاد کر کے مولائے کائنات اشک افشائی فرما رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ جب مولائے کائنات نے اپنے فرزندِ حسینؑ کی مصیبت کو یاد کیا ہو گا۔ اور حسینؑ کے بچوں کی پیاس یاد آئی ہوگی تو عیاش کا خیال ضرور آیا ہو گا اور مولا کی نگاہوں میں وہ نقشہ بھی پھر گیا ہو گا جب ان کا یہ شیر ذلت

البتہ یہ ممکن ہے کہ میں اپنے کسی بیٹے کو بھیج دوں۔ اور وہ اس کا کام تمام کر دے
یہ کہہ کر اس نے اپنے بیٹوں کو ایک ایک کر کے میدان میں بھیجنا شروع کیا اور جب سب
تہ تیغ ہو گئے تو ابن الشہداء کو غصہ آگیا اور وہ خود میدان جنگ میں آگیا۔ علی کے شیر
نے اسے بھی ایک حملے میں اس کے ساتوں بیٹوں سے ملا دیا۔

اب میدان جنگ میں شیر کی ہیبت کا قبضہ تھا۔ اور کسی عہد دم مارنے کی
ہمت نہ تھی۔

لوگ اس بے نظیر شجاعت کو دیکھ کر یہی سمجھ رہے تھے کہ حیدر کرار جہاد کر
رہے ہیں۔ لیکن جب نقاب رخ الٹا تو اندازہ ہوا کہ علی نہیں ہیں علی کا شیر ہے حیدر
کرار نہیں ہیں حیدر کرار کا درختہ دار ہے۔

علامہ موصوف نے واقعہ کو درج کرنے میں اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ
اگرچہ لوگوں کی نگاہ میں واقعہ قرین قیاس نہیں ہے اور وہ کسی میں حضرت عباس
کے جہاد کو بعید از قیاس سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ آپ ایک مرد کامل اور
۷۰ سال کے جوان تھے اور حیدر کرار کی شجاعت کے درختہ دار بھی تھے۔

آپ کے مرد کامل ہونے کا ثبوت علامہ خوارزمی کی یہ عبارت ہے۔

”خروج من عسكر معاویہ رجل یقال له کریب کان
شجاعا قویا یاخذ الدار لهم فی غمزہ باہما مہ فتذهب
کتابتہ فنادی لیخرج الی علی قبر ترالیہ مرتفع بن وضاح
الزبیری فقتله ثم برز الیہ شرحبیل بن بکر فقتله
ثم برز الیہ الحرث بن الحلاج الشیبانی فقتله فساء
امیر المومنین ذلک فدعی ولدہ العباس علیہ السلام

وکان قاما کاملًا من الرجال وامرہ ان ینزل عن
فرسہ وینزع ثیابہ قلبس علی ثیاب ولدہ العباس
ودکب فرسہ واللبس ابنہ العباس ثیابہ وارکبہ فرسہ
لملا یجلبن کریب عن مبارزتہ اذا عرّضہ فلما برز
الیہ امیر المومنین ذکرہ الاخرۃ وحذرہ باس اللہ
وسخطہ فقال کریب لقد قتلت لبیغی لہذا اکثر
من امثالک ثم حمل علی امیر المومنین فاتقاء بالدار
وضربہ علی علی۔ راسہ فشقہ لصفین ورجع
امیر المومنین وقال لولدہ محمد بن الحنفیہ قف
عند مصرع کریب فان طالب وترہ یا نیک فامتل
محمد امرا بیہ فاتاہ احد بنی عہدہ وصالہ عن
قاتل کریب قال محمد انا مکانہ فتجا ولا ثم قتله
محمد وخرج الیہ آخر فقتله محمد حتی اتی علی
سبعۃ لہم (مناقب خوارزمی ص ۱۲۷)

معاویہ کے لشکر سے کریب نامی ایک بہادر برآمد ہوا جس کی طاقت کا یہ عالم تھا
کہ انگلی سے درہم کو دبا کر دیا کرتا تھا۔ تو اس کے نقوش مٹ جاتے تھے۔ اس نے میدان
میں اگر حضرت علی سے مبارزہ طلبی کی۔ آپ کی طرف سے مرتفع بن وضاح زبیدی نکلتے۔
اس نے انہیں قتل کر دیا۔

اس کے بعد شرحبیل بن بکر نکلتے۔ وہ بھی قتل ہو گئے۔ اس کے بعد حرث بن صلاح
شیبانی برآمد ہوئے وہ بھی قتل ہو گئے۔

امیر المومنین کو یہ بات سخت گراں گزری اور آپ نے اپنے "فرزند" عباسؓ کو بلایا جو تمام دُمر و کامل تھے۔ اور انھیں حکم دیا کہ گھوڑے سے اتر کر اپنا لباس اتار دیا انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔
آپ نے ان کا لباس زیب تن فرمایا اور انھیں اپنا لباس پہنا دیا تاکہ دشمن منافق سے گھبرائے نہیں۔

اس کے بعد میدان میں آکر خدا کی یاد دلائی اور عذابِ آخرت سے ڈرایا کہ یہ نے اکر کر کہا میں نے اپنی اس تلوار سے آپ جیسے کتنوں کو تہ تیغ کر دیا ہے اور یہ کہہ کر حضرت پر حملہ کر دیا۔ آپ نے دارِ خالی دے کر ایک وار کیا اور اسے دو ٹکڑے کر دیا۔

والس آتے ہوئے آپ نے محمد حنیفہ سے فرمایا کہ تم اسی جگہ ٹھہرے رہو ابھی اس کا دارِ آبرو ہے۔

محمد تعمیلِ حکم میں ٹھہرے۔ تھوڑی دیر میں اس کا ایک غریزہ آگیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ کس کا قاتل کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ فی الحال تو اس کی جگہ پر میں ہوں۔ اس نے یہ سن کر حملہ کر دیا۔ آپ نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پھر ایک دُمر اسٹخف آیا۔ آپ نے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہاں تک کہ سات آدمی کھل کر آئے اور سب کے سب فنا ہو گئے۔

اس عبارت سے حضرت عباسؓ کا مردِ کامل ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس کے بعد محدث لوزی کے اس ارشاد کا کوئی محل نہیں رہ جاتا کہ یہ واقعہ عباس بن حارث کا ہے۔ حضرت عباسؓ کا ذکر اشتباہاً ہو گیا ہے۔

عباس بن حارث کا واقعہ اپنے مقام پر ہے۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ دُمر واقعہ غلط ہے۔ ایک میدان میں ایک طرح کے دو واقعات کا پیش

آنانہ محال ہے اور نہ ہی خلافِ قیاس۔

صاحبِ کتاب "تقریبی ہاشم" علامہ عبد الرزاق مقرم اور صاحب "ذکر العباس" نجم الاول اعظم مولانا نجم الحسن کراوی نے اس واقعہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے اور برادرِ محترم طاب ثرا نے کبریتِ احمر سے اس کے متعلقات کو بھی نقل کیا ہے۔ اور مسئلہ کی مکمل تیقح کر کے ایک ایک جزو پر بحث کی ہے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تاریخ کسی واقعہ کو نظر انداز کر دینا اس کے بے بنیاد ہونے کی دلیل نہیں ہے نگر یہ بات تو بہر حال غور طلب ہے کہ ان حضرات نے جن روایات سے استدلال کیا ہے اسکی بنیادوں سے خود بھی متفق ہیں یا نہیں؟

صاحبِ کبریتِ احمر نے حضرت عباسؓ کی عمر کا اندازہ تقریباً ۱۰ سال لکھا ہے اور علامہ خوارزمی نے صرف مردِ کامل کہا ہے۔ سن کا کوئی اندازہ نہیں بتایا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عباسؓ کی عمر کسی قیمت پر ۱۰ سال نہیں تھی۔ آپ کی ولادت ۲۶ھ میں ہے۔ اور جنگِ صفین کا خاتمہ ۳۵ھ میں ہوا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی ہے۔

اس مقام پر ایک دلچسپ بحث یہ ہے کہ میرے ایک "کثیر المطالعہ" مخلص نے ایک مرتبہ یہ اعتراض کیا تھا کہ کربلا کے میدان میں حضرت عباسؓ کی عمر شریف ۳۲ یا ۳۳ سال بالکل غلط بتائی جاتی ہے۔ مولائے کائنات نے جناب ام البنین سے کوفہ میں عقد کیا ہے۔

میں نے اس وقت ردِ اردی میں ان سے حوالہ دریافت نہیں کیا تھا اور نہ اس موضوع پر کوئی گفتگو ہو سکی تھی۔ اس وقت ۶۰۵ سال کے بعد جب اس موضوع پر تالیف کی نوبت آئی تو یہ کبھی یاد آیا اور ضروری معلوم (بقیہ حاشیہ ۲۵ پر)

خود کہ بلا میں ۳۱ھ میں آپ کی عمر ۳۴ سال کی بتائی جاتی ہے جس میں سے ۳۳ھ کم کرنے کے بعد ۱۱ سال سے زیادہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

بقیہ حاشیہ ۲۵۱ پر

ہو کہ اس کی مختصر تحقیق بھی کر دی جائے۔

جہاں تک ”ارباب تحقیق“ کا تعلق ہے، انھوں نے حضرت عباسؓ کی ولادت ۲۶ھ ہی میں نقل کی ہے۔ کوثر میں عقد کا تذکرہ کسی معتبر روایت یا کتاب میں نہیں ہے۔

اس کے علاوہ چند قرائن ہیں جو حضرت عباسؓ کی عمر کی تعیین اور حضرت ام البنین کے عقد کے بارے میں واضح فیصلہ کرتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ حضرت ام البنین کا عقد حضرت عقیل کی ”جنتو“ سے ہوا تھا اور مولائے کائنات نے پہلے انھیں سے مشورہ کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ حضرت عقیل سے یہ مشورہ مدینہ ہی میں ہو سکتا ہے۔ کوثر میں ایسے حالات کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تاریخ نے جناب ام البنینؓ کی آمد کا نقشہ اس انداز سے کھینچا ہے کہ بیت الشرف میں قدم رکھنے کے بعد شہزادوں سے عرض کی

بچو میں تمہاری مراں بن کر نہیں آئی ہوں۔ تم مجھے اپنی مادر گرامی کی ایک کتیز تصور کرو۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ کوثر میں امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی عمریں ۳۲-۳۳ سال تھیں اور اس عمر کے انسان کو کسی اعتبار سے بچہ نہیں کہا جاسکتا۔ ۲۶ھ

میں بھی امام حسنؓ اور امام حسینؓ بچے نہیں تھے لیکن ان کی جوانی پر یہ بات کما حقہ معلوم ہوتی ہے ۳۲-۳۳ کی عمر میں نہیں۔

بقیہ حاشیہ ۲۵۱ پر

کبریت احمر کا بیان لکنا ہی معتبر کیوں نہ ہو اس کی بنیاد بہر حال کمزور ہے۔ فرد مناقب خود از زمی کی روایت میں بھی حضرت عباسؓ کو ”مرد کامل“ کہا گیا ہے جو سنہ زوی اعتبار سے قطعاً صحیح ہے۔ لیکن ظاہری اعتبار سے قابل غور ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ بعض مورخین نے جناب ام البنینؓ کے عقد کو جناب امام سے پہلے لکھا ہے۔ اور جناب امام کا عقد مدینہ میں ہوا تھا۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ ام البنینؓ کا عقد کوثر میں ہوا ہو۔

جناب امام کے مدینہ میں عقد کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ ان کے بارے میں صدیقؓ ظاہرہ کی وصیت تھی کہ وہ میرے بچوں کا زیادہ خیال رکھتی ہے اور ان کی بہتر نگہداشت کر سکتی ہے۔

ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ مولائے کائنات اس عقد میں اس قدر تاخیر فرمائیں کہ بچے جوانی کی منزل میں آجائیں اور نگہداشت کی کوئی ضرورت ہی نہ رہ جائے۔

چونکہ اور اہم ترین ثبوت یہ ہے کہ صاحب عمدہ نے صادق آل محمدؐ سے حضرت عباسؓ کے فضائل کے ذیل میں نقل فرمایا ہے۔

تسلی دلہ اربع و ثلثون سنہ تئ۔

آپ نے ۳۳ سال کی عمر میں شہادت پائی ہے۔

اس امر کی بیان کے ہوتے ہوئے یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ مولائے کائنات کا یہ عقد کوثر میں ہوا ہو۔ جب کہ کوثر میں متولد ہونے والا فرزند کر بلا میں ۳۴ سال کا نہیں ہو سکتا۔

بقیہ حاشیہ ۲۵۱ پر

کی عمر میں انسان مرد کامل ہوگا تو ۳۴ سال کی عمر میں کیا ہوگا؟
 نسخہ نے آپ کے بارے میں یہ جملہ ضرور نقل کیا ہے کہ: **بِالْفَرْسِ الْمَطَهَّمِ وَخِلَافِهِ**
 (آپ جب اسپ درد کا بہ پر سوار ہوتے تھے تو آپ کے پیر زین پر خط
 دیتے تھے۔)

لیکن یہ آخری درد کا تذکرہ ہے اس کا کوئی تعلق دس برس کی عمر سے نہیں
 ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ پھر تبدیلی لباس کے بارے میں کیا کیا جائے۔۔۔۔۔
 اور عباس کا لباس امیر المؤمنین کے جسد اقدس پر کیوں کر درست ہو گیا؟ تو اسکے
 بارے میں برادر محترم طالب ثراہ نے کافی تفصیل دی ہے اور ایسے لوگوں کی طویل
 فہرست بیان کی ہے جن کا قد و قامت ۲۵ ہاتھ کے قریب تھا اور ان میں بعض

بہر حال مذکورہ بالا دلائل کے تاریخی اور روایتی حوالے کتاب کے مختلف
 مقامات پر آچکے ہیں۔ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ (رد باب ذوق
 نظر فرما سکتے ہیں۔)

جناب عباس کا سید ان صفین میں موجود ہونا ایک تاریخی امر ہے جس کا
 تذکرہ علامہ خوارزمی نے ”مناقب“ میں کیا ہے اور کبریت احمد نے بھی اپنے
 طور پر نقل کیا ہے۔ اس کو مشکوک بنانے کے لئے کو تو میں عقد کی داستان
 اور اس پر زور دینے کے لئے ۷۱ سال کی عمر ثابت کرنا بھی غیر ضروری ہے
 بنی ہاشم کے کچھ کمسنی میں بھی وہ کارہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں جو دیگر
 گھرانوں کے جوان انجام نہیں دے سکتے۔

(جوادی)

حضرات عباس کے ناہمال بزرگوں میں بھی تھے۔ جس سے یہ حساب لگایا گیا ہے کہ اگر
 ۴۰ سال کا آدمی ۳۵ ہاتھ کا ہوگا تو ۱۰ سال کا آدمی ۶ ۱/۲ ہاتھ کا ضرور ہوگا۔ یا کم از کم
 ایک اچھے خاصے قد و قامت کا ہوگا اور حضرت علیؑ میانہ قامت انسان تھے۔ ان کے
 لباس کا عباس کے جسم پر منطبق ہو جانا تعجب خیز نہیں ہے۔

واقعہ اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن حساب کا یہ اندازہ نہایت درجہ دلچسپ ہے۔
 ۴۰ سال کی عمر غالباً اس لئے فرض کی گئی ہے کہ یہ عام انسانی نشوونما کا آخری
 دور ہوتا ہے۔ اور اسی اعتبار سے ہر عمر کے قد و قامت کا حساب لگایا گیا ہے۔
 سوال یہ ہے کہ اگر نشوونما کے مسائل کو اسی انداز سے ”ہندسی“ اعداد و
 شمار سے طے کیا گیا تو نتیجہ میں ہر سال ایک الگ قد و قامت فرض کرنا پڑے گا
 اور انسانی قد و قامت کا حساب بنائات جیسا ہو جائے گا۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہے
 اور انسانی حیثیت کا حساب اس سے قطعی مختلف ہے۔

حقیقت صرف یہ ہے کہ بنی ہاشم کے کمسن مجاہد کامیدان جہاد میں آکر داذبعت
 دنیا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

جس گھرانے کا ۱۳ سال کا قاسم ازرق شامی کے سات بیٹوں کو تہ تیغ کر سکتا
 ہے۔ اس گھرانے کا عباس ابن الشعثاء کے سات بیٹوں کو بھی داخل جہنم کر سکتا
 ہے۔!

عقلی امکان کے ہوتے ہوئے اس روایت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے جو کسی
 مذہبی مسلمہ کے خلاف نہ ہو اور یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد نہ قد و قامت
 کے حساب کی ضرورت ہے اور نہ سترہ سال کا سن فرض کرنے کی ضرورت ہے
 تبدیلی لباس کے امکان کے لئے حضرت علیؑ کا درمیان میں ہونا بہت
 کافی ہے۔

حضرت عباسؓ اور امیر المومنینؓ کے درمیان تو نشوونما کا تفاوت فرض بھی کیا جاسکتا ہے۔

حضرت علیؓ اور رسول اکرمؐ میں تو کوئی ایسا بھی تفاوت نہیں تھا۔۔۔۔۔ حالانکہ ہجرت کی رات ۳۳ سال کے علیؓ ۵ سال کے رسولؐ کے بستر پر سو رہے تھے۔ اور قیادہ شامان عرب کو رات بھر یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ نبیؐ سو رہے ہیں یا علیؓ؟

امیر المومنینؓ کا صاحب اعجاز ہونا ہر مسئلہ کا حل ہے۔ آپؓ کو ساری کائنات کی طرح اپنے قد و قامت پر کبھی مکمل اختیار تھا اور جب چاہتے مصلحت اسلام کیلئے اسی قد و قامت میں ظہور فرما سکتے تھے۔ اس کے لئے کسی اور حساب کی ضرورت نہیں ہے۔

عباس بن ماریث کا نام غالباً اس لئے آگیا ہے کہ کریب سے پہلے انھیں سے مقابلہ ہوا تھا۔ اس کے بعد امیر المومنینؓ عباسؓ کا لباس پہن کر میدان جنگ میں تشریف لائے تھے اور اس کا کام تمام کیا تھا۔

صفین کے میدان میں حضرت عباسؓ کے دو مشاہدات انسانی زندگی کے بہت قیمتی مشاہدات ہیں۔

پہلا موقع وہ جب جنگ کے دوران مولائے کائنات نے صفوں کے درمیان مصلیٰ بچھایا اور ابن عباسؓ نے بڑھ کر دریافت کیا۔ مولایہ تو وقت جنگ ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: اَلَا اِنَّهَا لَقَاتِلُهُمْ عَلٰی الصَّلَاةِ۔

ہم ان سے اسی نماز کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔

جنگ و جدال کے ایسے نازک وقت میں صفوں کے درمیان مصلیٰ بچھا دینا۔

اور بغیر کسی انتظام کے بارگاہ احدیت میں سجدہ ریز ہو جانا اس بات کا اعلان ہے کہ مقام عہدیت کسی اہتمام کا محتاج نہیں ہے۔ جب جہاں اور جس وقت موقع مل جائے انسان کو بارگاہ بے نیاز میں سرنیزا خم کرنا چاہیے۔

یہ انداز تعلیم عام انسانوں کے ذہن پر اثر انداز ہو یا نہ ہو۔۔۔۔۔ اس ذہن پر یقیناً اثر انداز ہو گا جس کی ساخت پر درخت کا مکمل انتظام مولائے کائنات نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا اور جسے اپنے جذبات کا ائینہ دار بنانا چاہتے تھے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ کربلا کے شدید ترین ماحول میں بھی نماز کا اہتمام کرنے کی خاطر عباسؓ جیسے بہادر نے دشمن کے نادر الکلمات کو برداشت کر لیا اور کوئی اُترا نہیں کیا۔

جب کہ حبیب حسیا مخلص چاہنے والا اسے برداشت نہ کر سکا۔۔۔۔۔ علیؓ کے گھرانے کے شیدائی اور علیؓ کے آغوش کے پروردہ کا یہی ایک نمایاں فرق ہے امام حسینؓ کا درد اصحاب کو آگے کھڑا کر دینا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کربلا کے جذبات مصیفین کے جذبات سے بالکل جدا گانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ وہاں کا صحابی اصل نماز پر حیران و ششمنہ تھا تو کس کے لئے جماعت کا اہتمام کیا جاتا اور کسے سینہ سپر بنایا جاتا۔

اور یہاں کے اصحاب نماز کے لئے بے چین ہیں۔ اب کیسے ممکن ہے کہ انھیں نظر انداز کر کے فرادہ نماز ادا کر لی جائے۔

یادشمن کے بچے درپے حملوں کے یاد جو در نماز مکمل کی جاسکے۔ یہاں محافظ اصحاب کا بند و بست کرنا یقیناً ضروری تھا۔

امیر المومنینؓ کے لئے یہ انتہائی اندام لاشی لمحہ تھا۔ قرآن کریم کی مخالفت

کریں تو اپنے مقصد کی پامالی بھی ہو اور دشمن کا منصوبہ بھی کامیاب ہو جائے کہ علیٰ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور ان قرآنوں کے مقابلہ میں پسرانِ داخہ ہو جائیں تو دشمن کے مکر و دغا کی کھلی ہوئی کامیابی تصور کی جائے گی۔

آپ نے اپنے حسن تدبیر سے ایک درمیانی راستہ یہ نکالا کہ پہلے اپنی فوج کو شامی مکر کی حقیقت سے باخبر کیا۔ اور جب یہ بات واضح ہو گئی کہ ان میں جہاد راہِ خدا کا حوصلہ نہیں ہے اور یہ ادنیٰ بہانے سے جنگ ملتوی کر دینا چاہتے ہیں تو آپ اسے حفاظتِ عزتِ قرآن کے خیال سے جنگِ روک دی۔

جنگِ روک دینا بھی مولا کے حق میں کچھ کم ”مفسر“ نہیں تھا۔ وقت وہ ہے جب شام کی ہسکانی ہوئی ایک جماعت یقیناً یہ کہنے پر آمادہ ہو جائے گی کہ علیؑ نے جتنی ہوئی جنگ کو از خود شکست خوردہ بنادیا۔ لیکن آپ نے احترامِ قرآن کی خاطر یہ بھی برداشت کر لیا۔

جنگ کے روک دینے میں آپ کی ”سیاستِ آلہیہ“ کی ایک عظیم کامیابی یہ ہوئی کہ اس طرح حاکمِ شام کو قرآن حکیم کا پابند بنانے کا موقع مل گیا۔۔۔۔۔ اور اس کے ہر طرزِ عمل پر قرآن حکیم کی روشنی میں تنقید کرنے کا جواز حاصل ہو گیا

چنانچہ قرآن حکیم کو معیار بنا کر خلافت کے فیصلے پر طرہیں کا اتفاق ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ آخر میں نامِ قرآن کے بجائے پھر حکمین کی رائے پر فیصلہ ہو گیا اور تختِ دناج حاکمِ شام کے قبضہ میں چلا گیا۔ علیؑ کے حصے میں صرف نہروان کے باغیوں سے مقابلہ آیا۔

حالات جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن امتِ اسلامیہ آج بھی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والے کو جائز حاکم نہیں تصور کیا جاسکتا

تختِ دناج کی تاریخ ہی یہ ہے کہ یہ ہمیشہ حق کے قبضہ میں نہیں رہا۔۔۔۔۔ یہ کبھی باطل کے ہاتھوں میں رہتا ہے تو کبھی حق کے قدموں میں۔ صرف حقانیت ہے جو کبھی باطل کے قبضہ میں نہیں آسکتی۔

مولائے کائنات کا کردار آج بھی آواز دے رہا ہے کہ کل وقتی طور پر مجھے ”شکست خوردہ“ ضرور کہہ دیا گیا تھا اور مجھ پر سیاست سے ناواقفیت کا الزام ضرور لگا دیا گیا تھا لیکن آج حق و انصاف کی تاریخ بڑھو۔ حاکمِ شام اپنے دام میں خود اسیر ہو گیا ہے۔ علیؑ نے قرآن حکیم کا احترام کر کے شام کے تختِ دناج کی عزت کو قیامت تک کے لئے خاک میں ملا دیا ہے۔

عباسؑ کے پیش نظر احترامِ مذہب اور سیاستِ آلہیہ کے یہ تمام مشاہدات تھے اور آپ کو مستقبل میں انھیں مناظر کو دہرانا تھا۔ کہ بلا کی تاریخ میں عباسؑ کے جذبات انھیں مشاہدات کے آئینہ دار تھے۔

جذبہٴ فداکاری

دراشتی صفات و کمالات کے علاوہ حضرت عباسؑ کو ایک ایسا مقدس ماحول اور ایسی طیب دطاس ہر آغوش بھی ملی تھی جس کی نظیر تاریخِ عالم میں ناممکن ہے۔

امیر المومنینؑ نے آپ کی تربیت میں ایک امتیازی انداز رکھا تھا اور ابتداء

اَنَا عَبْدٌ مِنْ عَبْدِ مُحَمَّدٍ
کی حقیقی تصویر نگاہوں کے سامنے پھرنے لگی۔

وقتِ آخر

یہاں تک کہ ماہ رمضان سن ۱۰۰۰ھ کا زمانہ آیا اور ابن بطیم کی تلوار سے مسجد کوفہ میں امر المؤمنین زخمی ہوئے۔

۱۹ رمضان المبارک۔ صبح کا ہنگام ہے۔۔۔ فضا میں ایک کھرام برپا ہے
 کائنات کا امیر مسجد میں زخمی ہو گیا ہے اور اب نہ ہر کے اثر سے بسر پر کر دین بدل
 رہا ہے۔ شاجی حکومت کا مدعا پورا ہو چکا ہے اور امت اپنے عظیم رہنمائے محروم

چنانچہ بچپن کا عالم تھا۔ جناب ام البنین تشریف فرمائیں۔ ایک مرتبہ مولائے کائنات نے اپنے فرزند عباس کو گودی میں بٹھایا اور آستینوں کو الٹ کر بازوؤں کو بوسہ دینے لگے۔ ام البنین نے آپ کا یہ انداز محبت کو دیکھ کر عرض کی! مولایہ کیسا طریقہ محبت ہے۔ یہ بازوؤں کو بوسے کیوں دیئے جارہے ہیں؟ یہ آستینیں کیوں الٹی جارہی ہیں۔

آپ نے فرمایا اے اللہ! تمہارا یہ لالہ کربلا میں شہید ہو گا۔ اس کے شانے
تعم ہوں گے۔ پروردگار اسے دو پر عنایت کرے گا جس سے یہ معصوم بچہ کی طرح
جنت میں پروا نہ ہو گا۔

علامہ مقدم بحوالہ ”قربنی ہاشم فارسی، زندگانی، قربنی ہاشم
عماد زادہ اصفہانی۔

یہ وہ نازک لمحہ ہے جہاں ماں کے سامنے ایک طرف بیٹے کی شہادت ہے
اور دوسری طرف جنت الفردوس۔

دل دھڑکتا ہے۔ اور کبھی ٹھہر جاتا ہے۔ چہرے پر خزنِ دالم کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اور مرست کے علامات یس بدل جاتے ہیں۔

مولائے کائنات عباسؑ کو مستقبل سے باخبر کرنے کے ساتھ دنیا کو متوجہ کر رہے ہیں کہ ہمارے گھر کے بچے حالات میں گرفتار ہو کر قربانی نہیں دیا کرتے وہ آغاز حیات سے قربانی کے لئے تیار رہا کرتے ہیں۔

حضرت علیؑ کا دیا ہوا جذبہ فداکاری ہر آن عباسؑ کے پیش نظر ہوا اور انھوں نے ہر موقع پر بڑے سے بڑے خطرہ کے لئے اپنی جان کو پیش کر دیا۔ خصوصیت کے ساتھ

ہو رہی ہے۔۔۔ وقت کے ساتھ ساتھ ذہر کا اثر بڑھتا جا رہا ہے کوئی دوا کارگر نہیں ہو رہی ہے اور ہر علاج بے کار ثابت ہو رہا ہے۔

دیکھتے دیکھتے وہ لمحہ بھی آگیا جب زندگی کے آخری لمحات آنکے اور جراح نے زخم کی گہرائی کا اندازہ کر کے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ”مولا! اب آپ وصیتیں فرمائیں۔“

وصیتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسلامی احکام۔ تقویٰ الہی۔ تحفظ دین کی کی تلقین کرتے ہوئے خاندان کی ایک ایک فرد کو الوداع کہا اور سب کا ہاتھ امام حسین کے ہاتھ میں دیدیا۔ ایک عیاش باقی رہ گئے۔ جن کی طرف مولانا نے بظاہر کوئی توجہ نہیں فرمائی۔

بچے کا دل تڑپا۔ ددڑ کر مادر گرامی کی خدمت میں آیا۔ مادر گرامی غضب ہو گیا بابا نے سب کا ہاتھ امام حسین کے ہاتھ میں دیا اور میری طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی کیا میں ان کا لال نہیں ہوں؟

مال نے اپنے نال کا ہاتھ پکڑا اور لے کر مولا کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔۔۔۔۔
”دالی! آپ کے اس فرزند سے کوئی خطا ہو گئی ہے؟ آپ نے اس کا ہاتھ امام حسین کے ہاتھ میں کیوں نہیں دیا؟“

حضرت کا دل تڑپ گیا۔ آنکھیں کھولیں۔ نگاہ حسرت سے عیاش کے چہرے کو دیکھا۔ فرمایا ”میرے لال! یہ کہہ کر عیاش کو قریب بلایا اور امام حسین کے بجائے امام حسین کو نزدیک بٹھا کر عیاش کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ فرمایا عیاش! میں نے سب کو حسن کے حوالے کیا ہے اور تجھے حسین کے حوالے کیا ہے۔“

ریاض القدس مائتین۔

اب عیاش کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔ ۴۱ سال کی عمر کوئی معمولی عمر نہیں ہوتی ہے۔

جو بچہ ابتدائے عمر سے اس قدر حساس اور ہر شے پر ہلکا ہو کہ آغوش پدر میں بیٹھ کر توحید کے حقانیت کا اعلان کرتا ہو۔ جس کی پرداخت میں مولائے کائنات نے خاص اہتمام برپا ہو اور اپنی خصوصی نگرانی سے اسے پروردان چڑھایا ہو اس کا ۴۱ سال کے سن میں کیا عالم ہوگا۔ اور اس کے جذبات کس منزل پر ہوں گے۔ اس کا اندازہ ہر صاحب ہوش کر سکتا ہے۔ عباس نے اس وصیت کو محفوظ کر لیا اور اس طرح نبیالہما کہ جس طرح کائنات کا عظیم ترین انسان اپنے عظیم ترین باپ کی وصیت کو پورا کر سکتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب عاشور کی رات زہیر تین لے یا دل لایا۔ اور کہا عیاش! آپ کو یاد ہے کہ آپ کے پدر بزرگوار نے آپ کو کس دن کے لئے ہمیا کیا ہے؟ تو عیاش نے اس طرح انگڑائی لی کہ رکابیں ٹوٹ گئیں اور فرمایا۔

”اَسْتَحْيِيْنِيْ بِمِثْلِ هٰذَا الْيَوْمِ يَا زَهِير“

زہیر آج کے دن شجاعت دلا رہے ہو۔

عاشورہ کی رات تمام ہونے دو۔ اور صبح کا وقت آنے دو۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ بیٹے نے باپ کے مقصد کو کس انداز سے پورا کیا ہے۔ اور عیاش اپنے عہد و وفا پر کس طرح قائم ہے۔

• • •

عہ بعض روایات میں یہ واقعہ صبح عاشور کے سلسلے میں درج کیا گیا ہے؟

منزل دوم

جہل و مصیبن کے معرکے تمام ہو چکے ہیں۔ تحکیم کے تلخ تجربات نگاہوں کے سامنے ہیں۔ مسلمان اپنے امیر کی اطاعت نہ کرنے کا انجام دیکھ رہے ہیں شام کی حکومت کو ”استحکام“ حاصل ہو چکا ہے اور نہروان کی بغاوت کا سلسلہ تمام ہو چکا ہے۔

مولائے کائنات کی شہادت کے اجتماعی اور سیاسی اثرات کے سامنے ہیں۔ اور تادمخ ایک ایسے موڑ پر آ چکی ہے۔ جہاں قتل عثمان کا سہارا لے کر مصیبن کا میدان کارزار گرم کرنے اور نہروان افراد کو موت کی بھینٹ چڑھا دینے والا حاکم صلح کا پیغام دے رہا ہے۔

تقاضہ یہ ہے کہ اگر علی کے وارث حقیقی امام حسن تخت و تاج کو حاکم شام کے حوالے کر دیں تو جنگوں کا یہ طویل سلسلہ ختم ہو سکتا ہے اور خون ریزیوں پر ایک باندھ



بہت جلد شائع ہو رہی ہے

تصنیف

علامہ سید عبدالحسین الموسوی

ترجمہ

علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

ملنے کا پتہ

محمد انعام نقوی۔ مذہبی دنیا، ۲۲ رانی منڈی الہ آباد

باندھا جاسکتا ہے۔

امام حسنؑ کے سامنے اسلام کے اعلیٰ ترین مصالح ہیں۔ انھیں ایک "عام" بیٹے کی طرح اپنے باپ کے دشمن اور قاتل سے کسی قیمت پر صلح نہیں کرنی چاہیئے اور بہر طور اس سے انتقام لینا چاہیئے۔

اگر معاویہ عثمان کا وارث نہ ہونے کے باوجود ان کا "موجود" قصاص لے سکتا ہے تو امام حسنؑ تو بہر حال حضرت علیؑ کے وارث اور جانشین ہیں۔ انھیں حق قصاص سے کون روک سکتا ہے۔

شہادت امیر کے سماجی اثرات بھی کسی حد تک مدد دینے کو تیار ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ صفین و نہر دان کی "زخم خوردہ" فوج بھی ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جائے اور اپنے مقتولین کے انتقام کے طور پر سبھی حکومت شام کے مقابلہ میں صفین آدا ہو جائے۔

لیکن امام حسنؑ نے یہ کچھ نہ کیا۔ اور صلح کے پیغام کو فوراً قبول

کر لیا

گویا آپ اپنے کردار سے دنیا کو متوجہ کر رہے تھے کہ مجھے "ایک بیٹے کی حیثیت" سے وہی کرنا چاہیئے تھا جو دنیا والوں کا خیال ہے۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ میں علیؑ کا ایک فرزند ہونے کے ساتھ دین کا محافظ اور رسول اکرمؐ کا خلیفہ برحق بھی ہوں۔ میرے سامنے انتقام "خونِ ناحق" سے بالاتر مقاصد بھی ہیں اور ان مقاصد کی راہ میں یہ ساری قربانیاں برداشت کی جاسکتی ہیں۔

امام حسنؑ کا صلح پر آمادگی ظاہر کرنا تھا کہ شام میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ یہ مسرت اس بات کی نہیں ہے کہ "تحریکِ صلح" کامیاب ہو گئی۔ مسرت اس بات کی ہے کہ تخت و تاج کے سلسلہ میں اپنا فریب کام آگیا اور حکومت کسی زحمت کے بغیر

اپنے ہاتھ میں آگئی۔

امام حسنؑ کے پیش نظر خون ریزیوں کے اثرات تھے۔ آپ علمِ امامت کی بناء پر حالات سے مکمل طور پر واقف تھے۔ اس لئے جنگ کے نتیجہ میں "فسادِ مذہب" کا نقصہ دیکھ کر آپ نے صلح کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔

اور نہ جانے حالات کا تقاضہ کیا تھا کہ حاکم شام نے صلح کے لئے کوئی شرط مقرر نہیں کی اور یہ طے کر دیا کہ سادے کاغذ پر جو شرط امام حسنؑ تحریر کر دیں گے میں اسے منظور کر لوں گا۔

امام حسنؑ کے سامنے اسلام کی عظیم ترین مصلحت یہ تھی کہ ایسے نہرے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسلام کو صلح نامہ کی شکل میں قیادت کا ایک دستور دیدیا جائے اور دنیا نے اسلام کو متوجہ کر دیا جائے کہ اس دور کے حالات کیا ہیں اور حکامِ جور کس کردار کے مالک ہیں۔

صلح نامہ مرتب کیا اور نہایت "سادہ" شرطیں رکھی گئیں۔

کتابِ سنت پر عمل کرنا ہوگا۔

مولائے کائنات پر سب دشمن کا سلسلہ بند کرنا ہوگا۔

کوئی خون ریزی نہ ہوگی۔

معاویہ اپنے لہجہ کے لئے کسی حاکم نہ بنائے گا۔

حاکم شام نے بظاہر صلح نامہ کو منظور کر لیا اور تخت و تاج پر قابض ہو گیا۔

یہ بات نہ محتاجِ تشریح ہے اور نہ محتاجِ بیان۔ کہ حکومت شام نے صلح نامہ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ اور حاکم شام نے اسے بیرونِ تلے کس طرح روزِ ندوالا۔ تحقیق طلب بات صرف یہ ہے کہ ایسے حالات میں "صلح و اتفاق" فتح ہے یا

شکست ۹

ظاہر ہیں افراد بھی خیال کرتے ہیں کہ امام حسنؑ نے تخت و تاج سپرد کر کے اپنی شکست تسلیم کر لی اور حکومت شام کی مکمل کھلافت کا اقرار کر لیا۔
یہ تصور اس قدر عام ہوا کہ صلح کے بعد ہی ظاہری غلبہ میں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ:-

”آپ نے مومنین کو ذلیل کر دیا۔ اور صلح سے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا ہے“

یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ امام حسنؑ کے ساتھ آجانے والے افراد وہ حکومت پرست ذہن رکھتے تھے کہ ان کے خیال میں تخت و تاج پر قبضہ کر لینا فتح تھا۔ اور ان سے دست بردار ہو جانا کھلی ہوئی شکست تھا۔
حالانکہ اسلام نے روزِ اول ہی یہ تعلیم دی تھی کہ ہمارا مقصد حکومت و اقتدار پر قبضہ کرنا نہیں ہے اور جب ہم تخت و تاج کے خواہاں نہیں ہیں تو تخت و تاج ہماری فتح و شکست کے معیار بھی نہیں بن سکتے۔

اسلام اصول و آئین کا مذہب ہے۔ _____ اس کی فتح و شکست اصول و آئین کی کامیابی سے وابستہ ہے۔

اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ امام حسنؑ اصولی طور پر کامیاب ہوئے یا ناکام۔
تمہیدی طور پر یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ فتح و شکست کا فیصلہ دورانِ جنگ نہیں ہوا کرتا۔

جنگ کے خاتمہ پر اقتدار کا سنبھال لینا بھی اس کا معیار نہیں ہے۔ فتح و شکست کا حقیقی فیصلہ ارباب عقل و انصاف کے مدح و ذم سے کیا جاتا ہے۔
دنیاوی نقطہ نظر سے ظالم مظلوم کو طمانچہ مار کر اپنے کو ”فاتح اعظم“ تصور کرتا ہے۔

لیکن اہل انصاف یہی کہتے ہیں کہ ظالم نے برا کیا۔ اسے ایسا غیر عادلانہ برتاؤ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور یہی درحقیقت مظلوم کی فتح کی علامت ہے۔
فتح کا تعلق مار لینے یا مار کھانے سے نہیں ہے۔ فتح کا تعلق عمومی ہمدردی اور اہل انصاف کی مدح و ثنا سے ہے۔ اہل انصاف مدح کریں تو عمل صحیح ہے اور اہل انصاف مذمت کریں تو اقدام غلط۔

امام حسنؑ نے اپنے معترفین کو اسی عظیم نکتہ کی طرف متوجہ کرایا تھا۔ معترفین کا دعویٰ تھا کہ آپ معاویہ کے ساتھ صلح کرنے میں دھوکہ کھا گئے۔

اس نے آپ کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر آپ سے تخت و تاج چھین لیا۔
آپ نے ذرا ”دورانِ نشی“ سے کام لیا ہوتا تو اسکے ناپاک عزائم کے پیش نظر کبھی صلح پر آمادہ نہ ہوتے۔

لیکن آپ کا یہ ارشاد تھا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں نے دھوکہ کھایا ہے۔
دھوکہ دیا نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ میری صلح ”الصلحِ خیر“ کے ضابطہ کے تحت ہوئی ہے۔

اگر یہ صلح تمہاری نظر میں دھوکہ کھانے کے مراد ہے تو اسلام میں دھوکہ دینا جرم ہے۔ دھوکہ کھانا ہم نہیں ہے۔ دھوکہ کھانا نیک نیتی اور اخلاص عمل کی علامت ہے اور دھوکہ دینا عیاری و رکاری کی نشانی ہے۔ اسلام عیاری کو ناپسند کرتا ہے، نیک نیتی کو نہیں۔

حقائق پر گہرا نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہو گا کہ امام حسنؑ نے کسی قسم کا فریب نہیں کھایا اور آپ اپنے مقصد میں مکمل طور پر کامیاب ہوئے۔ کامیابی کا اندازہ کرنے کے لئے یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے۔

فکر یہ ہوتا ہے کہ اپنے عیوب پر پردہ ڈال جائے اور کوئی بھی فریق آخری وقت تک اپنے ظلم کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

مظلوم بننا حسن ہے اور ظالم بننا عیب ہے۔ اب اگر کوئی فریق اپنے مخالف فریق سے ظلم کا اقرار لے لے تو اس سے بڑی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

امام حسنؑ اور حاکم شام کے درمیان دو اخلاقی مسائل تھے۔ ایک دینی قیادت اور ایک ظلم و تعدی۔

حاکم شام کا دعویٰ تھا کہ دینی قیادت کے جملہ شرائط میرے کردار میں مجتمع ہیں اور امام حسنؑ اسے قیادت کے جملہ شرائط سے عاری تصور فرماتے ہیں۔

حاکم شام اپنے ہر اقدام کو عادلانہ اور عینی پرالفان تصور کرتا تھا۔ اور امام حسنؑ اس کی زیادتیوں کو واضح کر کے یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس نے برہنہ برہنہ سے ہمارا نام و نشان تک مٹا دینے کے لئے منصوبہ بنا رکھا ہے اس کا ارادہ پتہ ہے کہ اسلامی حکومت میں کوئی شخص بھی ہمارے ذکر خیر اور ہمارے اوصاف و کمالات سے باخبر نہ رکھ جائے۔

ضرورت تھی کہ امام حسنؑ دونوں محاذوں پر دشمن کو شکست دیں اور خود اس قلم سے ان جرائم کا واضح اقرار لے لیں۔

آپ نے تخت و تاج ضرور دے دیا لیکن ان دونوں باتوں کا اقرار بھی لے لیا اور پھر صلح نامہ کی دستاویز کی شکل میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی کرادیا

دین سگ یہ لقمہ دوختہ بہ

صلح کے دراہم شرائط یہ تھے۔

(۱) حاکم شام کو کتاب و سنت پر عمل کرنا ہو گا۔

(۲) امیر المومنینؑ پر سب دشتم کے سلسلے کو بند کرنا ہو گا۔

پہلی شرط نے پہلے محاذ پر فتح کا اعلان کیا — اور دوسری شرط نے دوسرے محاذ پر —

کتاب و سنت پر عمل کرنے کا مطالبہ اس سے نہیں کیا جاسکتا جو کتاب و سنت پر برابر عمل کر رہا ہو۔

یہ مطالبہ اسی شخص سے کیا جاتا ہے جس نے اپنی خواہشات کے پیچھے کتاب و سنت کو نظر انداز کر دیا ہو اور فرمان الہی کو پس پشت ڈال دیا ہو۔

امام حسنؑ نے صلح کی پہلی شرط یہی رکھی تھی کہ حاکم شام کتاب و سنت پر عمل کرے گا اور حاکم شام نے اس بات کو منظور بھی کر لیا۔ جو اس بات کا کھلا ہوا اقرار ہے کہ حکومت شام احکام الہیہ پر عمل پیرا نہیں ہے اور فرزند رسول کو صرف احکام الہیہ کی برتری کی فکر ہے تحت تاج کی نہیں۔

اسی ذیل میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قیادت امت میں ”سیرت شیعین“ پر عمل کا مطالبہ ایک غیر اسلامی شرط ہے۔ ورنہ شام کا حاکم ضرور کہتا کہ میں کتاب و سنت کے ساتھ سابق اموی بادشاہ کی طرح سیرت شیعین پر بھی عمل کروں گا۔ اور اس طرح بہت سے احکام الہی کو نظر انداز کرنے کا موقع مل جاتا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا

اس کا مطلب یہ ہے کہ مولائے کائنات نے تحت حکومت کو ٹھکرا کر یہ بات واضح کر دی تھی کہ اسلامی آئین میں اس ”ہمل“ شرط کی کوئی جگہ نہیں ہے اور اسے وہ حاکم بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہے جس کے خاندان میں اقتدار اسی شرط کے طفیل میں آیا ہے۔

دوسری شرط میں امام حسنؑ نے سب دشتم پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ

کیا جس کی منظوری اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شام میں حضرت علیؑ پر سب و شتم کا سلسلہ جاری تھا اور حکومت اس شعبہ کو بڑے تشدد کے ساتھ چلا رہی تھی۔

ظاہر ہے کہ امام حسنؑ جنگ کر لیتے یا حکومت کے مقابلہ پر کھڑے ہو جاتے تو دنیاوی نگاہوں میں کامیاب کہہ لئے جاتے۔ لیکن وہ مدعا کبھی حاصل نہ ہوا جو اس خاموش دستاویز سے حاصل کر لیا گیا ہے۔ اور ظلم اس طرح اپنے ظلم کا کبھی اقرار نہ کرتا جس طرح صلح کے موقع پر کیا گیا ہے۔

سب و شتم کی پابندی کے مطالبہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ حکومت "شام" اسلامی آئین کے ساتھ اہل بیت سے مقابلہ نہیں کر رہی تھی۔

بلکہ اس کا عظیم ترین حربہ پروپیگنڈہ اور جعلی شہرت تھی جسے اسلام کسی قیمت پر پسند نہیں کر سکتا۔

اس کے ماسوا امام حسنؑ نے آخری شرط میں یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ یہ تختہ تاج کسی استحقاق کی بنا پر نہیں دیا گیا۔ ورنہ اپنے بعد کسی کو حاکم نہ بنانے کی شرط نہ رکھی جاتی۔ یہ صرف ایک "رفع الوقتی" ہے جس میں دین الہی کے تحفظ کے ساتھ مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت مقصود ہے۔ اور اس طرح حاکم شام کے ان تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا گیا جن کے زیر اثر یہ صلح کی تحریک کی گئی تھی۔ اور جس کا تمام تر منصوبہ یہ تھا کہ حکومت کو اہل بیت سے ہٹا کر قاذوفی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بنی امیہ کے حوالے کر دیا جائے۔

امام حسنؑ نے واضح کر دیا کہ حکومت پر قبضہ کر لینا آسان ہے لیکن اس کا قاذوفی جو از تلاش کر لینا مشکل ہے۔

تاثرات

۱۔ میں امام حسنؑ اور امام شام میں صلح ہوئی۔ اس وقت حضرت عباسؑ کی عمر ۵ سال کی تھی۔

پندرہ سال کی عمر میں آپ نے اپنے خاندان کے تین عظیم کرداروں کا مطالعہ کیا اور ہر موقع پر اپنی فطری اور خداداد صلاحیت سے اس امر کا جائزہ لیا کہ باطل کے مقابلہ میں ہمارے خاندان کا شمار کیا جا رہا ہے۔ اور ہمارے بزرگوں نے باطل سے تقاضا کرنے کے لئے کیا حربے کئے ہیں۔

جنگ صفین۔ واقعہ تحکیم۔ صلح امام حسنؑ۔ یہ تین اہم مواقع تھے۔ جب حق و باطل کا خاموش مقابلہ ہوا اور ہر موقع پر اہل بیت کا ایک ہی کردار اور ایک ہی مقصد رہا۔ مالک کائنات نے بھی انہیں اپنے نیک مقصد میں کامیابی عطا کی۔

صفین کا معرکہ ایک فیصلہ کن موڑ پر آچکا تھا۔ علیؑ کا سپاہی حاکم شام کے خیمہ کے قریب تھا اور نزدیک تھا کہ خیمہ کی طنائیں کاٹ کر جنگ کا خاتمہ کر دے کہ اچانک دشمنوں نے نیزوں پر قرآن بلند کر دیے اور قرآن سے فیصلہ کی دعوت دیدی۔

حضرت علیؑ کے لئے یہ شدید آزمائشی لمحہ تھا۔ جنگ کو روک دیں تو بظاہر فتح شکست میں بدل جائے گی اور جاری رہنے دیں تو مخالف قرآن کا الزام آجائے گا۔

حضرت علیؑ کے لئے یہ شدید آزمائشی لمحہ تھا۔ آپ نے بظاہر جیتی ہوئی جنگ کو روک دیا لیکن دشمن کے اس ناپاک ارادہ کو ناکام بنادیا کہ علیؑ قرآن پر عمل کرنا نہیں چاہتے۔

آپ کا کھلا ہوا اعلان تھا کہ عزت قرآن کا معاملہ آجائے تو میں جیتی ہوئی لڑائی کو ظاہری شکست سے تبدیل کر سکتا ہوں۔ عزت قرآن کی بربادی برداشت نہیں کر سکتا۔

تاریخ کا دوسرا نازک موڑ حکیم کا واقعہ تھا جہاں مولائے کائنات کسی قیمت پر عوام کے نمائندوں کو حکم بنانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن جب حالات ٹکڑے ٹکڑے اور شام کے منصوبے کامیاب ہوتے نظر آئے تو آپ نے فوراً قرآن کی برتری کا اعلان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ فیصلہ کوئی بھی کرے۔ میری نظر میں وہ فیصلہ اس وقت تک قابل قبول نہ ہو گا جب تک کتاب الہی سے اس کی منہ نہ مل جائے۔

واقعہ تمام ہوا۔ ابو موسیٰ اشعری نے دھوکہ کھایا۔ عوام کی عیاری کام آگئی اور تخت و تاج، حکومت و اقتدار شام کے حوالے ہو گیا۔

لیکن تاریخ والوں کو یہ بات بھی درج کرنا پڑی کہ حکیم کے پورے واقعہ میں قرآن حکیم کا نام نہیں آیا۔ اور یہ حضرت علیؑ کی کھلی ہوئی فتح تھی۔ دنیا نے اندازہ کر لیا کہ میدان جنگ میں قرآن حکیم کا نام صرف ایک عیاری کے تحت لیا گیا تھا۔ حکومت شام کو قرآن حکیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تخت و تاج پانے کے بعد حالات بدل جایا کرتے ہیں۔ عوام حکومت کے اشاروں کے پابند ہوتے ہیں۔ اور حکومت کے پروپیگنڈوں پر

بہت جلدی ایمان لے آتے ہیں۔

حالات کے تحت یہ شدید خطرہ تھا کہ حاکم شام رائے عامہ کو تبدیل کر دے اور مختلف حیلوں سے قوم کو یہ باور کرادے کہ میری حکومت کی بنیادیں قرآن و سنت پر استوار ہیں۔

اہل بیت کا اختلاف ”معاذ اللہ“ ایک حد کی بنا پر ہے کہ انھیں حکومت نہیں مل سکی اور ان کا خواب اقتدار شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا۔

مولائے کائنات دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ شامی زہرا بینا کام کر چکا تھا حکومت کے لئے پروپیگنڈے کی زمین مکمل طور پر ہموار تھی۔ اب نہ کوئی تلوار اٹھانے والا تھا اور نہ معرکہ کارزار گرم کرنے والا۔

حالات میں تیزی سے تبدیلی آچکی تھی۔ اور حکومت کی مطلق العنانی سے شدید خطرات پیدا ہو چکے تھے۔

امام حسنؑ نے نگاہ امامت سے حالات کا جائزہ لیا اور نتیجہ میں یہ فیصلہ کر لیا کہ ایسے اوقات میں جنگ مختلف تعبیروں کا شکار ہو جائے گی۔ اور حکومت کو نت نئے بہانے تراشنے کا موقع مل جائے گا۔

مناسب یہ ہے کہ تلوار کے بجائے قلم کا استعمال کیا جائے اور ظلم کا مقابلہ کرنے کے بجائے ظالم سے ظلم کا اقرار کیا جائے۔

چنانچہ آپ نے بار دیگر حکومت و اقتدار سے سبکدوشی کا امدادہ ظاہر کر کے حکومت کی کتاب و سنت سے بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔

صلح حسنؑ تخت و تاج کی صلح نہیں ہے۔ ظالم سے ظلم کا اقرار لینے کی صلح ہے۔ اس راہ میں امام حسنؑ کو صد فی صد کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

حضرت عباسؑ کے پیش نظر یہ تینوں اہم مشاہدات تھے۔ اہل حالات کو دیکھ کر

ایک عام انسان بھی یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ ہاشمی گھرانے کا کردار جاہ طلبی اور حب ریاست نہیں ہے۔

یہاں صرف قاتلون کی برتری اور آئین کی عظمت کا تحفظ کیا جاتا ہے اور اس راہ میں ہر قربانی دیا۔ اور اس مقصد کے لئے ہر مصیبت والہ قابل قبول ہے۔

پھر آپ کی بعیرت؟ ————— وہ بعیرت جسے علماء اسلام نے ”علم لدنی“ سے تعبیر کیا ہے؟ کیا وہ بعیرت حالات کا مکمل جائزہ لینے کے بعد ایک عظیم کردار کی تعمیر نہ کرے گی۔ اور کیا اس کے بعد عباس کا طرز فکر قربانی و فداکاری کے علاوہ کچھ اور ہو گا۔

دنیا صلح امام حسن کے آئینہ میں امام حسین کی اولوالعزمی کا مشاہدہ کرتی ہے کہ آپ نے بھائی کی صلح سے ذرہ برابر اختلاف نہیں کیا۔ لیکن مجھے اس موقع پر حضرت عباس کے کردار کی بلندی کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔

امام حسین امام تھے۔ اور ”دنیاوی اعتبار“ سے ۲۶ برس کے تجربہ کلا معتدل مزاج اور پرسکون انسان تھے۔ عباس ۱۵ برس کے جوان بننا تھے۔ انکے خون میں مکمل حرارت تھی۔ ان کی رگوں میں ہاشمی شجاعت خون کی طرح دڈر رہی تھی۔ ان کے سن رسال سے کسی اعتدال پسندی اور ظاہری طو پر ”شکست آمیز“ صلح کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

لیکن تاریخ گواہ ہے کہ عباس نے بھائی کی صلح کے خلاف ایک کلمہ نہیں کہا اور پوری نیک نیتی کے ساتھ امامت کے اقدام کے سامنے سر تسلیم خم کئے رہے۔

اس سن رسال میں یہ معتدل اقدام علی کے لال۔ علم و عرفان کے کمال

بعیرت و بعادت کے جلال کے علاوہ کسی اور سے متوقع نہیں ہو سکتا ہے۔

شہادتِ امام حسن

مذہب کی راہ میں اس فداکاری اور مزاج کی اس اعتدال پسندی کا اثر تھا کہ حضرت عباس نے ان مواقع پر کبھی صبر سے کام لیا ہے۔ جہاں بڑے سے بڑا مبار بھی عنان صبر کو ہاتھوں سے چھوڑ دیتا ہے اور ان نازک لمحات میں بھی امامت کی رائے کا احترام کیا ہے جہاں کوئی دوسرا انسان اس احترام کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر سکتا۔

شامی زہرا اپنا اثر کر چکا ہے۔ فرزند فاطمہ کے جگر کے بہتر ٹکڑے پر چکے ہیں۔ امام حسین غسل و کفن کے بعد حسب وصیت جنازہ کو نجد مدینہ کے لئے نانا کے نزار کی طرف لے جا رہے ہیں۔

بنی امیہ میں یہ خبر عام ہو چکی ہے کہ امام حسین اپنے بھائی کو نانا کے پہلو میں دفن کرنا چاہتے ہیں۔

خبر کا نشر ہونا تھا کہ اختلاف کی پوری مشینری حرکت میں آگئی اور مردوں کے دوش بدوش ”عورتیں“ بھی جنازہ کو روکنے کے لئے باہر نکل آئیں۔ ایک خاتون کے بارے میں تو یہاں تک نقل کیا گیا ہے کہ وہ پھر بر سوار ہو کر جنازہ کو روکنے کے لئے آئی تھیں جس کو دیکھ کر ابن عباس کو یہ کہنا پڑا کہ اونٹ اور بچر

کی نوبت تو آچکی ہے۔ اب اگر کچھ دنوں اور زندہ رہ گئیں تو ہاتھی ہی کی باری ہے۔

مناقب ابن شہر آشوب ۴۵، روضۃ الصفا ۳۵

بجاء الا لاور۔

امام حسینؑ نے سمجھایا کہ ہم مانائے روضہ پر تجدید عہد کے لئے آئے ہیں۔ اگر تم لوگ مزاحم ہو گے تو جنازہ کو یہاں دفن نہ کریں گے۔

دشمن نے پوری طاقت سے فراقت کی اور بنی ہاشم نے وصیت کا احترام کرتے ہوئے جنازہ کو جنت البقیع میں دفن کر دیا۔ (جہاں قبر کے آثار آج بھی پائے جاتے ہیں۔ اصل قبلہ مرابن سعود کے مظالم کا نشانہ بن چکی ہے۔)

روضۃ الصفا کی روایت ہے کہ اس دوران تیر بارانی بھی ہوئی جس کے نتیجہ میں امام حسنؑ کے جنازے میں شتر تیر پر بست ہو گئے۔ قیامت کی منزل ہے کہ امام حسینؑ۔ محمد بن الحنفیہ اور عباسؑ جیسے مجاہدین موجود ہیں۔ اور جنازہ پر تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔

دشمن کے دستہ کی قیادت ایک خاتون کے ہاتھوں میں ہے۔ جو کل شکست کھا چکی ہیں۔ اور آج اس کا انتقام لے رہی ہیں۔ اور ایک مردان کے ہاتھ پیچھے جھکی ہوئی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

بنی ہاشم کی طرف سے امام حسینؑ کے علاوہ جمل کے مجاہد محمد حنفیہ اور صفین کے شیر عباسؑ علمدار بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تلوار نہیں اٹھتی اور جنازہ کو مانوس سے سپرد خاک کر دیا جاتا ہے۔

کیا کردار کی بلند ہی کی اس سے بڑی کوئی مثال ہو سکتی ہے کہ جوانوں کے اتنے بڑے مجمع میں جنازہ کے ساتھ بے ادبی کی جائے اور کوئی ان کی نہ نہ کرے۔

اب عباسؑ باپ کے سایہ تربیت سے نکل کر کمال کی اعلیٰ منزلوں میں آچکے ہیں۔ اب آپ کے اظہار کمال کا وقت ہے۔

چنانچہ آپ نے پہلے پہل اپنے کمال مبر کا مظاہرہ کیا اور یہ واضح کر دیا کہ وصیت کا احترام ملحوظ خاطر نہ ہوتا تو آج مدینہ کی گلیوں میں خون کی ندیاں ہوتیں اور اس وقت دشمن کو اندازہ ہوتا کہ ہاشمی شیروں کی شجاعت و بہادری کا کیا عالم ہے۔

مگر انوس کہ وصیت درمیان میں حاصل ہے اور ہمارے گھرانے کے کردار میں بزرگوں کا احترام ہے۔ شتر زنی نہیں ہے۔

اس واقعہ کا سب سے بڑا شرمناک پہلو یہ ہے کہ اس شہادت کبریٰ کی خبر پانے کے بعد حاکم شام نے شکر کا سجدہ کیا اور تکبیر کی آواز بلند کی۔

طبری العقد الفرید، تاریخ حمیس، حیوۃ الحيوان ماہ وغیرہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن زہرا کا خون کوئی مباح خون تھا جو بہ گیا۔ یا آغوش رسولؐ کا پروردہ کو فدا واجب القتل تھا جو تلوار کے

گھاٹ اتار دیا گیا۔

غیرت اسلامی اس منزل پر پہنچ جائے تو کسی خیر کی توقع لغو اور کسی اصلاح کی امید مہمل ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ مورخین اس کے بعد بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ معاویہ نے اپنے وصیت نامہ میں امام حسینؑ کے ساتھ ملکہ رحم کا حکم دیا تھا اور اس کا منشاء یہ تھا کہ انھیں اذیت نہ پہنچائی جائے۔ یہ یزید کا ذاتی کردار تھا کہ اس نے باپ کی مخالفت کرتے ہوئے شدت سے بیعت کا مطالبہ کر دیا۔

میرے خیال میں یہ تصور انتہائی مہمل ہے۔ معاویہ اپنے بیٹے کو اس نکتہ

کی طرف متوجہ کر رہا تھا کہ تیری حکومت کو انھیں افراد سے خطرہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے انھیں کا تصفیہ کر لیا جائے۔

درد کوئی وجہ نہیں تھی کہ یزید کی حالت کو جانتے ہوئے _____ امام حسین کے منع کرنے کے باوجود اسے اپنا جانشین بنانا اور اس کے لئے عرب و عجم سے غلامی کی بیعت لیتا۔

معاویہ کے بارے میں کسی صفائی کا امکان نہیں ہے۔ اس نے خود اپنے درد میں رسول کے بڑے فرزند کو زہر دلایا ہے۔

ابوالفداء ۱۸۳، رد فتنہ العفاد ۳۷ حبیب السیر ۲۱۸۔

اور اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے کو وصیت کر دی ہے کہ رسول کے دوسرے فرزند کا خاتمہ کر کے نسل نبوت کو مٹا دیا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شیعہ کیا سمجھے جسے روشن خدا کرے

ایک المیہ

حضرت عباس کی حیات کا ایک عظیم المیہ یہ بھی ہے کہ آپ کو پوری زندگی میں جنگ صفین کے چند لمحات کے علاوہ کہیں بھی راد شجاعت دینے کا موقع نہیں ملا۔ ایسا عظیم مجاہد اور ایسا ہم آتما بہادر کسی موقع پر شجاعت کے جوہر نہ دکھاسکے۔ اس سے بڑا المیہ قابل تصور نہیں ہے۔

کسی بہادر کی زندگی میں زور آزمائی کا موقع نہ آئے تو کوئی انوس ناک بات نہیں ہے لیکن موقع آنے کے بعد جنگ کا موقع نہ ملے تو اس سے بڑا کوئی مارا نہیں ہے۔

حضرت عباس کی زندگی میں متعدد مواقع آئے ہیں جہاں تلوار کا بیخ جانا مانگ رہا تھا۔ اور بظاہر موقع تھا کہ خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔

امام حسن کے جنازے کے ساتھ بے ادبی _____ پیر جزر گواد کی شان میں مسلسل گستاخی _____ مخلصین کا بے دردی کے ساتھ قتل، فرات سے قیموں کی عیلمدگی _____ کوئی معمولی حادثہ نہیں تھے _____ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ کربلا میں "سقاء" کے بعض مواقع کے علاوہ کبھی عباس کے ہاتھ میں تلوار نہیں دیکھی گئی۔

حد ہو گئی کہ خود عاشورہ کے قیامت خیز مرحلہ پر بھی عباس کو اذن جنگ نہیں ملا۔ اور مجاہد خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ حسرتوں کی اتنی بڑی پامالی اور تمناؤں کا اتنا عظیم خون ایک بہادر کی زندگی پر کیا اثر ڈالتا ہے۔ اس کا اندازہ ایک بہادر ہی کر سکتا ہے لیکن عباس کے چہرے پر شکن تک نہیں آئی۔

یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ عباس صرف ایک بہادر نہیں ہیں۔ ان کی رگوں میں صرف خون شجاعت نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے آباد اجداد سے صرف تیغ آزمائی نہیں سیکھی ہے۔ بلکہ ان کے دل دماغ میں تعلیمات عہمت کے نقوش بھی ہیں۔

ان کی زندگی علم و عرفان کے سانچے میں ڈھلی ہے۔ ان کے کردار کے عناصر میں باپ کے حلال کے ساتھ ماں کا علم بھی شامل ہے۔ انھیں علی کی گودی نے پر دلان چڑھایا ہے تو نہ ہڑا کی دعاؤں نے کمال صبر کی آخری منزلوں تک پہنچایا ہے۔

شجاعت کے ساتھ صبر ————— بہت کے ساتھ ضبط —————
 زور بازو کے ساتھ قرب قلب اور تلوار کے ساتھ محنت مند انکار ہی انسانی کردار کے
 اہم عناصر ہیں جن کے بغیر کوئی انسان حقیقی معنوں میں انسان کہے جانے کے قابل
 نہیں ہے۔

غسلِ امامِ حسنؑ

اسی بلند کردار اور عظمتِ نفس کا اثر تھا کہ حضرت عباسؑ کو ان مواقع پر
 بھی شریک کار بنایا گیا ہے۔ جہاں غیر معصوم کا گزر نہیں ہو سکتا اور جس ماحول کے
 لئے صرن اہل عصمت کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ درآدم سے امام حسن عسکریؑ تک کوئی ایسا در نہیں آیا
 جب کسی معصوم کے غسل و کفن کی ذمہ داری کسی غیر معصوم کے لئے حوالے کر دی گئی
 پر تفصیلات تاریخ کے دامن میں نہیں ہیں۔ لیکن جہاں کبھی غسل و کفن کا ذکر ہے
 وہاں اس امر کی تصریح ہے اور جہاں یہ تذکرہ نہیں ہے وہاں ایک قانون کلی کا
 ذکر ہے۔ معصوم کی تجہیز و تکفین معصوم ہی تک محدود ہے۔

”الْإِمَامُ لَا يُلِي الْأَمْرَ إِلَّا صَاحِبُهُ“

بعض معاصرین نے اس قانون میں بھی اشکال کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ
 معصوم کے تمام امور تجہیز و تکفین معصوم سے متعلق نہیں ہیں۔ اس کا تعلق صرف نماز

جنازہ یا غسل سے ہے۔ دفن اس کے حدود سے خارج ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ
 عام مصفون کی روایت ضعیف ہے۔ اور ضعیف روایات سے عقائد کا اثبات نہیں
 کیا جاسکتا۔

ان بزرگوار کو یہ توہم ہو گیا ہے کہ عقیدہ کی بنیاد اس روایت پر ہے اور
 یہ روایت ضعیف ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ روایت نہیں ہے بلکہ اسے علماء
 اعلام نے بطور رسالت نقل کیا ہے۔

عقیدہ کی بنیاد وہ متواتر تعلیمات ہیں جو مختلف شکلوں میں معصومین کی طرف
 سے بیان ہوتے رہے ہیں۔ اور جن میں کسی منزل پر تجہیز و تکفین کی تشریح کی گئی ہے
 تو اسی منزل پر اسے خصوصیات عصمت و امامت میں شمار کیا گیا ہے۔

بہر حال اس حقیقت کو عقائد میں شمار کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ یہ امر مسلم ہے
 کہ تاریخ میں کسی معصوم کے غسل و کفن میں غیر معصوم نے برابر کا حصہ نہیں لیا۔
 حدیث گئی کہ جب مرسل اعظمؑ کے غسل میں فضل بن عباسؑ نے پانی دینا شروع کیا تو
 امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ فضل اپنی آنکھیں بند کر کے رہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری آنکھیں
 ضائع ہو جائیں۔

(امالی شیخ طوسی ص ۵۹)

یہ وہ منظر جمال ہے جس کا تحمل ایک معصوم کے علاوہ کسی میں نہیں ہے۔
 طور کا قصہ سننے والے جانتے ہیں کہ جب لڑا اپنی اصلی حالت میں سامنے آجاتا ہے
 تو کسی کے ہوش سلامت نہیں رہ جاتے۔

وفات کے بعد امام کا رشتہ مادی دنیا سے کسیر قطع ہو جاتا ہے اور تبلیغی ذمہ
 داریوں کا رابطہ کبھی باقی نہیں رہ جاتا ہے۔

لہذا اپنی اصلی حالت میں آجاتا ہے اور روحانیت و معنویت اپنے صحیح حد و خال

میں سامنے آجاتی ہے۔

یہ وہ منظر ہے جس کا تحمل نگاہ میں نہیں ہے اور یہ وہ جلال و جمال کا محل ہے جس کے لئے چشم معصوم درکار ہے۔

لیکن اس کے باوجود تاریخ گواہ ہے کہ جب امام حسینؑ کو غسل دے رہے تھے تو آپ نے حضرت عباسؑ کو اپنا بقاعہ کا شریک بنایا تھا اور آنکھ بند کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

(ذخائر العقبیٰ عبد الدین طبری ص ۱۲۱)

یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ عباسؑ کا مرتبہ عام انسانوں سے قطعی مختلف ہے اور آپ عصمت سے قریب تر مرتبہ کے مالک ہیں۔ بلکہ ایک جہت سے معصومین میں شمار کئے جانے کے لئے لائق ہیں۔ جیسا کہ آیتہ اللہ شیخ طہ نجف طاب ثراہ نے اتفاق المقال میں تحریر فرمایا ہے کہ عباسؑ کا تذکرہ عام انسانوں کے ساتھ نہیں بلکہ اہلبیت معصومین کے ساتھ ہونا چاہئے۔

اس کا ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ معصوم کو معصوم ہی سے غسل و کفن دینے کے قانون میں ایک قسم کی تعلیم پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ غسل و کفن دینے والے معصوم کے بشر ہونے کی شرط نہیں ہے بلکہ ملک بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کسی شخص نے معصوم کا ساتھ دینا چاہا تو آپ نے یہ کہہ کر الگ کر دیا کہ میرے ساتھ میری مدد کرنے والے موجود ہیں۔ یا ملا کہ میری مدد کر رہے ہیں۔

(بصائر الدرجات)

مقصود یہ ہے کہ اصل ذمہ داری بشر معصوم کی ہے لیکن اعانت و امداد کے طور پر ملک معصوم بھی شریک کار ہو سکتا ہے۔ عصمت اختیاری کے ساتھ

عصمت انظاراری کی شرکت اصل مقصد کے لئے مضر نہیں ہے۔ جس کے بعد یہ کہنا آسان ہے کہ اگر غسل معصوم ملک کی عصمت کا متعل ہو سکتا ہے تو جس کا کردار عصمت ملک جیسا ہو اور جس کی زندگی مکمل اختیارات کے باوجود انتہائی پاک و پاکیزہ اور صاحبِ تہذیب کی آغوش کی پروردہ ہو اس کی شرکت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

عباسؑ عصمت کردار کی اس منزل پر تھے جس کی بلندی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو صرف اتنا کہ امام معصوم نے امام معصوم کے غسل میں شریک کا قرار دیا ہے۔ اور اس سے بالاتر کسی منزل کا تصور ممکن نہیں ہے۔

انوس۔۔۔۔۔ کہ تاریخ نے آل محمدؑ کی زندگیوں کو ہمیشہ پردہ خفاء میں رکھا ہے۔ اور ہاشمی گھرانے کے کردار کو منظر عام پر آنے نہیں دیا اور جب کہ رسول اکرمؐ اور مولائے کائنات کی زندگی کے اہم واقعات کو دامن تاریخ میں جکڑ نہ مل سکی۔ کہ کر بلا جیسے عظیم الشان واقعہ کو تاریخ اپنے سینے سے نہ لگا سکی۔ تو حضرت عباسؑ کی زندگی کے بارے میں کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

تفصیل سے واقعہ بیان کرتے تو یہ اندازہ کیا جاتا کہ ۴۱ھ سے ۵۵ھ تک۔ اسال کے عرصہ میں حضرت عباسؑ کا طرز عمل کیا رہا اور انھوں نے امام حسینؑ کی اطاعت میں کس طرح زندگی گزاری ہے۔

اجمالی روایات میں دو تین مقامات پر تذکرے ضرور ملتے ہیں۔ لیکن ان سے پورے کردار کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ عباسؑ نے زندگی کے کسی موڑ پر اور حالات کی کبھی نازک ترین منزل میں بھی امامت کی اطاعت سے انحراف نہیں کیا اور اپنے کردار کو بندگی کے سانچے میں ڈھالے رہے جس سے بڑی عصمت کردار کی تکمیل کوئی مارتخ پیش کر سکتی ہے اور نہ کوئی کتاب سیرت۔

منزلِ سوم

سیرتِ حیات کی دوسری منزل میں قمر بنی ہاشم کا کردار زیادہ اجاگر نہیں ہو سکا جس کا ایک اہم سبب تو یہ ہے کہ خود امام حسنؑ کی زندگی کو کبھی بہت کچھ پردہٴ خفا میں رکھا گیا۔ اور خود تاریخ کا بھی یہ طے ہے کہ وہ خاموش خدمات کا تذکرہ کرنا نہیں جانتی۔

اس کی نگاہ میں صرف ہنگاموں کی قیمت ہوتی ہے۔ وہ صرف میدانوں کو نگاہ اعتبار سے دیکھتی ہے۔ گوشہٴ عافیت میں وہ رہ کر دین و مذہب کی خدمت تاریخ کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

تاریخ کا صحیح مزاج اس ایک مصرع سے واضح ہوتا ہے۔

ایک ہنگامہ بہ موقوف ہے گھر کی رونق

اس کے علاوہ تاریخ میں کسی واقعہ کی کوئی عظمت و اہمیت نہیں ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ مولائے کائنات نے وقت آخر جناب عباس کو امام حسین کے حوالے کر دیا تھا۔ اور روز اول سے عباس کی ضرورت امام حسین ہی کے لئے محسوس کی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ولادت کے بعد سے جستہ جستہ جن واقعات کا سراغ ملتا ہے ان میں جناب عباس امام حسین ہی کی خدمت میں رہے۔ آپ ہی نے انجذابان چٹا آپ ہی نے گودھی میں پالا۔ آپ ہی مسجد میں لے گئے۔ اور آپ ہی مکمل طور پر نگہداشت کرتے رہے۔

یقیناً جناب زینب بھی امام حسین کے اس طرز عمل میں برابر کی شریک رہی ہوں گی۔ اور جناب ام کلثوم نے بھی اس سلسلے میں اہم خدمات انجام دی ہوں گی۔ لیکن تاریخ میں ان مقالین کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

حضرت عباس کی نمایاں کردار کا سلسلہ امام حسن کی شہادت کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں سب سے پہلے آپ کا جلال امام حسن کے جنازے کے ساتھ بے ادبی کے موقع پر دکھایا گیا۔ اور اس کے بعد تاریخ کے ہر موڑ پر حضرت عباس ہی نظر آئے۔

شہدہ میں امام حسن کی شہادت واقع ہوئی اور امام حسین کی نفسی ذمہ داریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

امام حسین نے ابتدائی طور پر اپنے بھائی کی وصیتوں کا احترام کرتے ہوئے اس صلح نامہ پر باقاعدہ عمل درآمد کیا جسے ان کے مرحوم بھائی نے دین کے معارف اور مذہب کے منافع کے تحت مرتب فرمایا تھا اور اس کے بعد حالات میں اہم تبدیلی آتی ہی امام حسین کو اپنا طریقہ کار تبدیل کرنا پڑا۔

تاریخ گواہ ہے کہ اگر حالات بدستور باقی رہ جاتے تو امام حسین کے طرز عمل

کے تحت کسی جنگ و جہاد کا کوئی امکان نہ تھا۔ آپ اپنے پدر بزرگوار کی طرح خانہ نشین بھی ہو سکتے تھے۔ اور اپنے برادر بزرگ کی طرح تخت و تاج کو کھو کر بھی مار سکتے تھے لیکن سنہ ۶۱ھ میں معاویہ کے مرتبے ہی حالات نے کوڑے بیدار اور زمانہ نے پیش کیا۔ اب صلح و معاہدہ کا سلسلہ نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ مطالبہ بیعت نے لے لی تھی۔

معاویہ کے مرتبے کے بعد یزید نے پہلا اقدام یہ کیا کہ حاکم مدینہ ولید کو خبر مرگ معاویہ دیتے ہوئے ایک مختصر قعدہ یہ بھی لکھا کہ امام حسین سے بیعت طلب کرے اور اگر بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کر کے بیچ دے۔

(طبری)

ظاہر ہے کہ اس سے پہلے کسی مرحلہ پر معاویہ نے بیعت کا نام نہیں لیا تھا۔ اور شوریٰ کی منزل میں بھی ہاشمی گھرانے کے سربراہ امت کے امام حضرت علیؑ نے سیرت شیخین کا سرکشی انکار کر دیا تھا۔ جس کے بعد امام حسینؑ کے بیعت کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

لیکن یزید نے نشہ حکومت کے زیر اثر حالات کا مکمل جائزہ نہیں لیا۔ اور اپنے غیر اسلامی افعال کو اسلام کا رنگ دینے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ بائی اسلام کے حقیقی وارث سے بیعت لے کر اپنے اعمال پر اسلام کی فہر ثبت کرائی جائے۔

۲۸ رجب کی رات تھی۔ جب یزید کا پیغام ولید تک پہنچا اور ولید نے رات کو امام حسینؑ کو طلب کر لیا۔ آپ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اور آپ کے پاس عبد اللہ بن ابی مرثد بھی بیٹھے تھے۔

نادت طلب کے خطرات کو محسوس کر کے ابن زبیر نے فرار کا ارادہ کیا اور امام حسینؑ نے فیصلہ کیا کہ مجھے ولید کے دربار میں جانا ہے۔ اپنے موقف کو روز اول ہی واضح کر دینا ہزار لیت و لعل سے کہیں بہتر ہے۔

مسجد سے اٹھ کر بیت الشرف میں آئے۔ بہن کو پیغام سنایا۔ بہن نے کبھی نادقت طلبی کے خطرات کا احساس کیا اور فرمایا۔ بھئی اگر جانا ہی ہے تو اپنے ہمراہ ہاشمی جوازن کو لے کر جا بیئے۔

۳۔ ہاشمی جوازن ہمراہ ہوئے اور امام حسینؑ ولید کے دربار کی طرف روانہ ہو گئے۔ دربار کے دروازے پر پہنچ کر آپ نے ہاشمی جوازن کو روک دیا اور فرمایا کہ میں اکیلا دربار میں جا رہا ہوں۔ تم لوگ یہیں توقف کرو۔ اس کے بعد اگر میری آواز بلند ہو جائے تو بلا کسی اطلاع کے دربار میں چلے آنا۔

امام حسینؑ دربار میں تشریف لے گئے۔ ولید نے کمال احترام سے بٹھایا۔ خبر مرگ معاویہ سنائی۔ حضرت نے اسلامی قانون کے تحت کلمہ

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

زبان پر جاری کیا۔

ولید نے یزید کا پیغام بیعت سنایا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ جیسے آدمی سے نفیہ بیعت کے کیا معنی؟

بیعت کا مسئلہ نہایت درجہ اہم ہے۔ بہتر ہے کہ کل دن کے وقت دربار میں طلب کرنا۔ اس وقت یہ فیصلہ ہو گا کہ بیعت کے لئے کیا اہتمام ہونا چاہیئے۔

ولید نے اپنی مقبولیت کا ثبوت دیتے ہوئے حضرت کو جانے کی اجازت دیدی۔ لیکن مردان بول اٹھا۔

کہ اگر آج حسینؑ تیری گرفت سے نکل گئے تو خون ریزی کے بغیر ماسخ نہ آئیں گے۔ بہتر ہے کہ ان سے بیعت لے لے یا ان کا سر قلم کر دے۔

بیعت کے ساتھ قتل کا نام نہ تھا کہ حضرت کو جلال آگیا۔ آپ نے فرمایا اور زن نیکیوں چشم کے بچے اتو مجھے قتل سے ڈراتا ہے۔

حضرت کی آواز کا بلند ہونا تھا کہ ہاشمی جوازن دربار میں داخل ہو گئے۔ ولید کے ہوش و حواس اڑ گئے۔

اس نے فی الفور حالات کا احساس کرتے ہوئے جلسہ کو برخواست کر دیا۔ اور حضرت کو احترام کے ساتھ بیت الشرف تک پہنچا دیا۔

روایت کا بیان ہے کہ دربار ولید میں داخل ہوتے وقت ہاشمی جوازن کے سربراہ حضرت عباسؑ ہی تھے۔ اور آپ ہی کی حلات و ہیبت نے قلب ولید پر یہ اثر کیا کہ اس نے اپنے طرز عمل میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔

امام حسینؑ دربار سے واپس آ گئے۔ بیعت کا مطالبہ وقتی طور پر ٹل گیا۔

لیکن تاریخ کے طالب علم کے دل میں یہ خلش رہ گئی کہ یزید نے چار ہی آدمیوں سے مطالبہ بیعت کیوں کیا اور اس کا مطالبہ اس شدت سے انکار امام حسینؑ ہی نے کیوں کیا۔

حالات کا بغور مطالعہ اس بات کا گواہ ہے کہ عام اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کو مذہبی رنگ دینے کے لئے چند ہی افراد کی توثیق کافی ہو سکتی تھی۔ اور اس کے لئے کوئی عظیم منصب دار یا اس کا وارث ہی ہو سکتا تھا۔

چنانچہ یزید نے چار بڑی شخصیتوں کو منتخب کیا جن میں تین خلافت کے حامل تھے۔ اور ایک اسید و ار خلافت بلکہ خلیفہ گر۔ اور یہ طے کیا کہ انھیں کی ادلا دے بیعت کا مطالبہ کیا جائے۔

مطالبہ بیعت میں مطلوب چاروں شخصیتیں عمومی نقطہ نظر سے عظیم اہمیت کی حامل تھیں۔ ایک خلیفہ اول کا بیٹا۔ ایک خلیفہ دوم کا بیٹا۔ ایک صحابی رسول زبیر کا بیٹا۔ اور ایک خلیفہ تیسرے کے بیٹے۔

مسلمانوں میں کون ایسا تھا جو ان چاروں کی اسلامی حیثیت سے باخبر نہ ہو اور ان کی حکومتی غفلت کو نہ پہچانتا ہو۔ یزید نے سوچا کہ ان کی بیعت میری حکومت کو مکمل طور پر اسلامی بنادے گی۔ اور محمد بن حنفیہ کے نام پر ہر خرام و طلال کا موقع مل جائے گا۔

یزید کا انتخاب دلیل ہے کہ ساڑھے بارہ لاکھ مربع میل پر حکومت کرنے والے یزید کی نگاہ میں اسلامی شخصیتیں صرف چار تھیں۔ جنہیں یزید نے عمل اعتبار قرار دیا تھا اور باقی افراد کو نگاہ اعتبار سے ساقط کر دیا تھا۔

ان چاروں کا انجام بھی مختلف رہا۔ ابن زبیر راتوں رات بھاگ گئے۔ ابن عمر اور ابن ابی نجر نے ہر طور پر یزید کی بیعت کر لی۔ اب صرف امام حسینؑ ہیں جو اپنے موقف پر قائم ہیں اور کسی طرح یزید کی بیعت نہیں کرنا چاہتے۔

سوال یہ ہے کہ اب امام حسینؑ سے مطالبہ بیعت کیوں ہے؟

حکومت کی توثیق کیلئے دو خلیفہ زادے اور ایک صحابی زادہ موجود ہے۔ ایک امام حسینؑ بیعت نہیں کرتے تو نہ کریں۔ ان کے انکار بیعت سے حکومت کے اسلامی ہونے پر کیا اثر پڑے گا؟ ایک آدمی کو اس کے مال پر چھوڑ دیا جائے اور باقی سے استفادہ کر لیا جائے۔

لیکن یزید کا انداز فکر یہ نہیں ہے۔ وہ ہر ایک کی الگ الگ حیثیت سے باخبر ہے اور جانتا ہے کہ امام حسینؑ کے بغیر سب کی بیعت بے کار ہے۔ گویا یزید کی نگاہ میں ۱۰ لاکھ مربع میل میں صرف چار آدمی قابل اعتبار تھے۔ اور ان میں سے صرف امام حسینؑ کا قتل تھا جس نے نہ اپنے کو تباہ ہونے دیا اور نہ تو م کی موت کے گھاٹ اتارنے دیا۔

تاریخ اسلام کا یہ بھی عجیب المیہ ہے کہ اتنی بڑی اسلامی مملکت میں چار سے زیادہ غیرت دار نہ مل سکے اور چار میں سے بھی ایک کے علاوہ دوسرا جبری اور ہمت والا

نہ پیدا ہوا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا بھر میں دوسرے غیرت دار مسلمان نہ تھے یا ان کی مذہبی حمیت مردہ ہو چکی تھی۔

بلکہ یہ ان افراد کا تذکرہ ہے جو یزید کی نگاہ میں مذہب کی توثیق کے سلسلے میں مستند تھے اور ان کی ہر تصدیق حکومت کو خلافت کا نام دے سکتی تھی۔ ورنہ امام حسینؑ کے اصحاب و انصار ہی غیرت مذہب کے سلسلے میں کیا کم اہمیت رکھتے تھے۔ یزید کے خاموش اعتراف اور تاریخ کے تلخ تجربات نے واضح کر دیا کہ اسلام کی بخت آزمائی کھڑیوں میں نہ کوئی صحابی زادہ کام آئے گا خلیفہ زادہ۔ تنہا ایک فرزند رسولؐ لائق تھا جس نے سرتن کی بازی لگا کر اسلام کی عزت کو بچا لیا اور عزت مذہب کو موت کے گھاٹ نہیں اتارنے دیا۔

اب اگر مرسل اعظمؐ کا اسلام باقی ہے اور شراب و کلب، رقص و رنگ، زنا و عیاشی جزد مذہب نہیں ہیں تو یہ صرف ایک حسینؑ بن علیؑ کا احسان ہے اس میں نہ کسی صحابی زادہ کا حق ہے نہ خلیفہ زادہ کا۔

یزید کا انتخاب بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اسے خطرہ صحابیت یا خلافت ہی سے تھا۔

یہ اور بات ہے کہ بعد کے تجربات نے واضح کر دیا کہ سکون و اطمینان کے حالات میں دین کی حمایت کا دم بھرنے والا ہے اور آزمائش کے لمحات میں سینہ سپر ہو جانا مشکل ہے۔

یہ ایک علیؑ کے لال کا کلیجہ تھا جس نے ایک دو پہر میں بھرے گھر کو قربان کر دیا اور چہرہ کی بشاشت میں فرق نہیں آیا۔ امام حسینؑ کے لئے کربلا کا کوئی لمحہ مشکل اور دشوار نہیں تھا۔ آپؑ آہلی نمائندگی کے حامل اور حیدر کرار کے وارث تھے۔ آپ کے

دل میں پیغمبر اکرم کا علم، علی مرتضیٰ کا غم اور حق مجتبیٰ کا صبر تھا۔
 آپ کی رگوں میں فاطمہ زہرا کا شیر لہو بن کر دوڑ رہا تھا۔ جس نے تنہا پوری حکومت
 سے مقابلہ کیا اور بھرے دربار میں باطل کا بھرم کھول دیا تھا۔
 آپ کی عظمت سے قطع نظر کہ بلا کا ایک ایک آزمائشی لمحہ دوسرے انسانوں
 کے لئے محالات کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ امامت کا حسن انتخاب تھا یا آفتابِ عظمت کی
 شعاعوں کا اثر۔ کہ ایک سانچے میں بہتر انسان ڈھل گئے۔ اور ایک حسین تہتر "حسین"
 میں تبدیل ہو گئے۔

ایک انسان کے لئے اپنے آبائی وطن کو چھوڑنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔
 وطن جہاں اس کے بزرگوں کی قبریں ہوں۔ بچپن کی یادیں وابستہ ہوں، انفرادی
 احباب کا اجتماع ہو اور پھر ایک بچی کو بھی چھوڑے جا رہا ہو۔
 لیکن امام حسینؑ نے مذہب کی راہ میں یہ سب برداشت کر لیا۔ ایک بچی کو مدینہ
 میں چھوڑا اور نانا کے شہر سے رخصت ہو گئے۔

رخصتِ امام حسینؑ

امام حسینؑ کا مدینہ رسول چھوڑنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ نفسیاتی اعتبار سے
 امام کے دل پر اس کا جو اثر تھا وہ نوٹھا ہی۔ خود اہل مدینہ بھی
 کچھ کم مضطرب نہیں تھے۔

حسینؑ مدینہ کے ایک باشندے نہیں تھے۔
 وہ دارتِ مدینہ، صاحبِ مدینہ، جانِ مدینہ، اور روحِ روانِ اہل مدینہ تھے۔
 مدینہ ان کے نانا کا دارِ الحجرت تھا۔ مدینہ ان کی مادرِ گرامی اور ان کے برادرِ گرامی
 کا مقررہ تھا۔ مدینہ ان کی پرورش گاہ اور ان کے خاندان کا
 مسکن تھا۔

مدینہ سے امام حسینؑ کو اور امام حسینؑ سے مدینہ کو جس قدر انس و الفت
 ہونا چاہیے اس کا اندازہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ۲۸ رجب کو امام حسینؑ نے مدینہ سے سفر کا غم کیا
 تو سارے مدینہ میں کہرام برپا ہو گیا۔ جسے دیکھو اس کا چہرہ اترا ہوا، حالِ تباہ،
 بال پریشان، ایک یاس کا عالم، دردِ یواہر پر رستی ہوئی حسرت۔
 کوچہ و بازار میں اڑتی ہوئی خاکِ وحشت اور امامِ مظلوم کا غمِ رخصت۔

عبداللہ بن سنان کوئی رادی ہے کہ میں اسی دن دارِ مدینہ ہوا جس
 دن جانِ مدینہ۔ مدینہ چھوڑ رہا تھا۔ میں نے اہل مدینہ کے
 چہروں پر عجیب یاس و حسرت کے آثار دیکھے۔ اور گہرا کر پوچھا۔ بھائیو! کیا آج
 کوئی تمازہ مصیبت آگئی ہے۔

لوگوں نے کہا۔ آج جانِ مدینہ وطن سے رخصت ہو رہا ہے
 محمدؐ کا نواسا، علیؑ کا نورِ نظر اور فاطمہؑ کا لختِ جگر مدینہ چھوڑ رہا ہے۔
 حالاتِ زمانہ حسینؑ کو ان کے نانا کے وطن میں رہنے نہیں دیتے۔ اور مجبوراً اپنی کے
 لال کو وطنِ عزیز چھوڑنا پڑ رہا ہے۔

عبداللہ کہتا ہے کہ مجھے اس منظر کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ جب
 دارتِ رسولؐ اپنے وطنِ عزیز کو۔ اور اہل مدینہ آنسوؤں کی چھاؤں میں

اپنے حبیث کو رخصت کر رہے ہوں۔

یہ سوچ کر میں خلیجہ ابنی ہاشم میں آیا اور دور کھڑا سواری کا منتظر دیکھتا رہا۔
سیدائیاں بیت الشرف سے برآمد ہوتی رہیں اور ایک ایک کر کے ناٹوں پر سوار
ہوتی رہیں۔

ایک جوان ہمہ تن استہام سفر میں مصروف اور ہر آن انتظامات پر نظر رکھے
ہوئے تھا۔

میں نے کسی سے پوچھا۔ یہ کون جوان ہے جو اس قدر مصروف اور مہتمم
ہے۔ لوگوں نے کہا۔ یہ علی کا لال عباسی علمدار ہے جس نے اپنی پوری زندگی
امام حسینؑ کی خدمت میں گزار دی ہے۔ اور اپنے کو مولا کا غلام ہی سمجھتا رہا
ہے!

قافلہ روانہ ہوا۔ پیچھے پیچھے سیدانیوں کے ناٹے اور آگے
آگے ہاتھ میں پرچم اسلام لئے ہوئے حمزہ و جعفر کا وارث۔ علی کا شیر۔ عباسی
اس پورے قافلہ میں عباسی کی انفرادیت دلیل ہے کہ مولائے کائنات نے اپنے
اس فرزند کو جس قربانی کے لئے جیسا کیا تھا۔ اس کی راہ میں یہ فرزند کس قدر مستعد
ہے۔ اور قربانی گاہ کی طرف جانے کا مکمل اہتمام اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔

منازلِ راہ

قافلہ مدینہ سے روانہ ہو کر تیسری شعبان کو مکہ معظمہ پہنچا۔ اور چند
ماہ تک وہیں قیام رہا۔ اس کے بعد اہل کوفہ کے اصرار پر امام حسینؑ نے
مسلم بن عقیل کو اپنا سفیر بنا کر کوفہ بھیجا۔ اور لباس احرام میں پیچھے ہوئے خنجر کو دیکھ
کر حرمت کعبہ کے پیش نظر، رذی الحجہ کو مکہ معظمہ چھوڑ دیا۔

حج کا موقع۔ ایک دن کا وقفہ۔ سارا عالم اسلام کھنکھ کر
مکہ کی طرف آ رہا ہے اور وارث حرم حج کو عمرہ سے تبدیل کر کے اپنی منزل آخر کی
طرف جا رہا ہے۔ ہر ذہن میں ایک سوال ہے۔ ہر دماغ میں ایک جستجو۔
حسینؑ کیوں جا رہے ہیں؟

حسینؑ کا قافلہ بیک وقت سوال بھی بنا رہا ہے اور جواب بھی۔
ردانگی ایک سوال کا پیش خمیہ ہے اور حج کو عمرہ سے تبدیل کر دینا جواب کی تمہید۔
یقیناً ایسے ہی حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ فرزند رسولؐ حج نہیں کر سکتا۔ کچھ ایسے
دشمن سامنے آ گئے ہیں کہ حسینؑ ایک دن بھی ٹکھڑا مناسب نہیں سمجھتے۔

قافلہ دوبارہ مکہ سے گرم سفر ہوا اور صحراؤں اور بیابانوں سے گزرتا ہوا منزل
شرف پر پہنچا۔ اصحاب نے آبادی کا اندازہ کرتے کمبکسر کی آواز بلند کی امام حسینؑ نے کمبکسر
کا سبب دریافت کیا۔

اصحاب نے عرض کیا ہم ایک نخلستان کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ جہاں درختوں کا سایہ اور آبادی کا سلسلہ مل جائے گا۔

حضرت نے فرمایا۔ درخت نہیں ہیں یہ ایک لشکر ہے جس کے پرچم بلند ہیں اور گھوڑوں کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ اصحاب نے بغور دیکھا اور بڑھ کر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ عمر کا رسالہ ہے جو ابن زیاد کے حکم سے امام حسینؑ کا راستہ روکنے آیا ہے۔ قافلہ قریب پہنچا اور عمر نے راستہ روکنا چاہا مگر کاباھ حضرت کے لجام فرس تک پہنچ گیا۔ آپ نے فرمایا۔

”شَكَكْتُ اُمَّتِيَا حُرًّا“

اے عمر تیری ماں تیرے صفِ ماتم میں بیٹھے! یہ کیا بے ادبی ہے۔
جور نے گھبرا کر ہاتھ پکھنچ لیا اور کہا۔

فرزند رسول! افسوس کہ میں آپ کو ایسا جواب نہیں دے سکتا۔ اگر آپ کی مادر گرامی فاطمہؑ زہراؑ نہ ہوتیں تو میں بھی ایسا ہی جملہ کہتا۔ لیکن بنت رسولؐ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کر سکتا۔

ضمیر اور مصلحت کی جنگ کا اس سے بہتر نقشہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ عمر ضمیر کے اعتبار سے بڑی حد تک پاک و پاکیزہ تھا۔ لیکن مصلحت و ریاست نے ضمیر کی آواز کو روک دیا تھا۔ امام حسینؑ سے بہتر اس حقیقت کا نشان کون ہو سکتا تھا؟

آپ نے عمر کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے ایک ایسا فقرہ فرمایا جس نے عمر کے ذہن کو امام مظلومؑ کی مادر گرامی کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور اب عمر مسلسل اسی خیال میں پیچ و تاب کھاتا رہا ہے کہ جس سے مقابلہ کر رہا ہے، جس کا راستہ روک رہا ہے، جس کا غریب الوطنی پر عبور کر رہا ہے وہ فاطمہؑ زہراؑ کا فرزند اور رسول اکرمؐ کا نواسہ ہے۔

اسی خیال نے شب عاشورِ حر کے موقف میں تبدیلی پیدا کی اور حریریت کو ٹھکرا کر امام حسینؑ کی خدمت میں آگیا۔

ظاہر میں نگاہ والے امام حسینؑ کے جملہ کو خلاف اخلاق تصور کرتے ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ صاحبِ خلقِ عظیم کے فرزند کو ایسا فقرہ نہیں کہنا چاہیے تھا جو عربی تہذیب میں انتہائی سخت فقرہ شمار کیا جاتا ہے۔

لیکن بعد کے حالات نے واضح کر دیا کہ عمر کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں تھا اور امام حسینؑ نے اس جملہ کو تبلیغی ذمہ داریوں کے تحت استعمال فرمایا تھا۔

اگر کل امام حسینؑ نے یہ فقرہ استعمال نہ کیا ہوتا تو آج حرفِ فاطمہؑ زہراؑ کی دعا اور معصومین کے سلام کا حقدار نہ ہوتا۔

یہ اسی ایک جملہ کا اثر تھا جس نے عمر کے دل و دماغ میں انقلاب برپا کر دیا۔ اور عمر کو اس وقت تک قرار نہیں ملا۔ جب تک وہ فرزند رسولؐ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو گیا۔

عمر کرنے کی بات ہے کہ جس وقت عمر کے ہاتھ حضرت کے لجام فرس کی طرف بڑھ رہے تھے اس وقت آپ کے پہلو میں حضرت عباسؑ بھی تھے۔ خدا گواہ ہے کہ امامت کا ادب مانع نہ ہوتا تو ایک وار میں عمر کے درازوں ہاتھ قلم ہر جاتے۔ لیکن عرفانِ امامت کے پیکر عباسؑ نے اس منظر کو کبھی برداشت کر لیا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔

عباسؑ اپنی آنکھوں سے وہ منظر بھی دیکھ چکے تھے جب باپ کا قاتل رنہ لہتہ سامنے کھڑا تھا۔ اور پدرِ بزرگوار اس کے لئے شربت کا حکم نافذ فرما رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس کا باپ اپنے قاتل کو شربت پلا سکتا ہے۔ وہ بیٹا جذبات سے متاثر

ہو کر ایک گستاخی پر ہاتھ کیونکہ قلم کر سکتا ہے۔

عباسؑ کو فطری طور پر وہی کرنا چاہیے تھا جو ان کے پدر بزرگوار نے کیا۔ چنانچہ جیسے ہی لشکر کی حالت دیکھ کر امام مظلوم نے اسے سیراب کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عباسؑ فوراً آمادہ ہو گئے اور دشمن کے لشکر کے ایک ایک سپاہی بلکہ جانور تک کو سیراب کر دیا۔

علی بن طعان حماد بنی کا بیان ہے کہ میں حر کے رسالہ کا آخری سپاہی تھا اور میری یہ حالت تھی کہ پیاس سے زبان منہ کے باہر آگئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ لشکر میں میری باری آتے آتے میں اس دنیا کو چھوڑ چکا ہوں گا۔

لیکن اللہ رے ساتی کوثر کے لال کا کرم۔۔۔۔۔ کہ فرزند رسول اقلین خود اپنی جگہ سے اٹھے اور مشکیزہ لے کر قریب آئے۔ آپ نے اپنے دست کر کے مجھے سیراب کیا اور میری زندگی کا تحفظ کیا۔

راہ عراق میں یہ عظیم موقع تھا جہاں عباسؑ کے کردار کا ایک پر تو نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ساتی کوثر کے لال نے امام حسینؑ کی اطاعت و فرمانبرداری میں کس طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔

اسی راستہ میں ایک مرتبہ حضرت عباسؑ کا کردار وہاں دیکھنے میں آیا جہاں حضرت مسلم کے انتقال کی خبر ملی اور راہ گروں نے اطلاع دی کہ ہمارے سامنے مسلم کی لاش کو کوفہ کی گلیوں میں کھینچا جا رہا تھا۔

امام حسینؑ یہ خبر سن کر خمیہ کے اندر آئے۔ بہن کو خبر سنائی اور تمیمیہ مسلم کو بلا کر اس کے سر پر دست شفقت پھیرنا شروع کیا۔۔۔۔۔ بنی ہاشم کی بچی تھی سمجھ گئی اور کہنے لگی چچا۔۔۔۔۔! یہ انداز کرم تو یمیںوں جیسا کہ کیا میرا بابا اس دنیا میں نہیں رہا۔۔۔۔۔؟

امام حسینؑ نے شکین دی افر فرمایا نہیں تیرا باپ حسینؑ زندہ ہے۔۔۔۔۔ شدہ، شدہ یہ خبر بیوہ مسلم تک پہنچی۔ اور انھوں نے زاد و قطار روزنا شروع کیا۔۔۔۔۔ زوہرؑ مسلم حضرت عباسؑ کی بہن تھیں۔۔۔۔۔ شیرزد و الجلال کے لال نے یہ منظر دیکھا تو تڑپ کر بہن کے پاس آیا۔۔۔۔۔ فرمایا بہن صبر کرو۔۔۔۔۔ شیردوں کی بہنیں اس طرح نہیں رویا کرتیں۔۔۔۔۔ تمہارا شیر زندہ ہے صبر و ضبط سے کام لو اور راہ خدا میں قربانی کا حوصلہ پیدا کرو۔

جناب مسلمؑ کی شہادت پر زوہرؑ مسلم کا کیا عالم ہوا۔۔۔۔۔ اسے تاریخ کا زبان سے مت نیٹے۔۔۔۔۔ تاریخ جذبات و احساسات کی دنیا میں بالکل گونگی ہے۔ اس کے دہن پر قفل لگے ہوئے ہیں۔ ان کی ترجمانی انسانی ضمیر اور بشری قلب در مانع ہی کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ تاہم یہ کہنا ممکن ہے کہ جب حادثہ کی شہادت کی خبر سن کر زوہرؑ مسلم بیتاب ہو گئیں تو جب اپنے دونوں فرزندوں کی قربانی کا حال سنا ہو گا تو دل پر کیا گزری ہوگی اور کس طرح صبر کیا ہوگا؟

راہ خدا میں قربانی پیش کرنا اور قربانی پر صبر کر لینا ان کے گھر کا قدیم ترین تاریخی شعار ہے۔ اس میں خانوادہ رسالت کی ہر فرد ایک ممتاز حیثیت کی مالک ہے۔ وہ مسلم ہوں یا زوہرؑ مسلم۔۔۔۔۔ مولائے کائنات ہوں یا ام البنین۔ سب کے کردار میں ایک انداز نظر آتا ہے اور سب کا ایک سطح نظر ہے کہ مقصد کی راہ میں ہر عظیم قربانی کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے۔

یہ شہادت کہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

ایک موازنہ

مکہ معظمہ سے روانگی کے موقع پر تاریخ نے جو واقعات محفوظ کئے ہیں۔ انکے مطالعہ سے حضرت عباسؓ کی عظمت و شجاعت کا ایک نیا نشان بھی ملتا ہے۔

پہلا منظر یہ ہے کہ قافلہ حسینی تیار ہو چکا ہے۔ سیدانیاں ناقوں پر سوار ہو چکی ہیں۔ قافلہ آگے بڑھنا چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ علیؓ کا عزیز و شاگرد ابن عباسؓ سامنے آگیا اور آکر پوچھا۔ فرزند رسولؐ۔ کہاں کا امدادہ ہے؟ امام حسینؓ نے فرمایا ابن عباس عراق جا رہا ہوں۔

ابن عباسؓ نے عرض کی مولا! آپ تو عراق کے حالات سے باخبر ہیں اس علاقہ نے آپ کے پدر بزرگوار اور آپ کے برادر نامدار سے وفائیں کی تو آپ اس سے کیا اسیر رکھتے ہیں؟

فرمایا! ابن عباس! میں راہ خدا میں قربانی پیش کرنے جا رہا ہوں۔ مجھے مدینہ میں میرے ناننانے تاکید کی ہے کہ حسین! میرا دین بچانا ہے تو عراق جاؤ اور راہ خدا میں قربانی دو۔

ابن عباسؓ نے یہ سنا تو گھبرا کر عرض کی!

فَمَا مَعْنَى حَمَلِكَ هَذِهِ النِّسْوَةَ

مولا! جب آپ سرکٹانے جا رہے ہیں تو ان عورتوں کو بے جانے کا کیا مقصد ہے! آپ نے فرمایا! ابن عباسؓ "مَشَاءَ اللّٰهُ اِنْ يُّرَا هُنَّ سَيَايَا"

مشیت الہی یہی ہے کہ یہ قیدی بنیں۔۔۔۔۔۔ میری شہادت کے بغیر
یہ سرخرو نہیں ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور ان کی قربانی کے بغیر دین الہی کو ظالموں
نے آزادی نہیں مل سکتی۔

ابن عباسؓ مولائے کائنات کے تربیت یافتہ اندام آپؐ کے فرزند نامدار ہیں۔

ست اسلامیہ انھیں جبرامت اور مفسر اعظم کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔۔۔۔۔۔
لیکن ابن عباسؓ کا طرز عمل یہ ہے کہ پہلا اضطراب قربانی کے نام سے پیدا ہوا۔۔۔۔۔۔
دو دوسرا اضطراب سیدانوں کی روانگی سے پیدا ہوا۔

اس کے بالمقابل حضرت عباسؓ کا کردار ہے جو مدینہ سے شہادت کا مکمل
ترم کر کے چلے ہیں۔ اور سیدانوں کو اپنے ہمراہ لے کر چلے ہیں۔ آپؓ نے مدینہ سے
روانگی کے وقت یہ نہیں کہا کہ مولا انھیں نہ لے جائیے۔ بلکہ اپنے زیر
ہتمام سیدانوں کو ناقوں پر سوار کیا اور اپنی نگرانی میں پورے قافلے کو لے کر چلے۔

دوسرا منظر یہ ہے کہ قافلہ منزل سے آگے بڑھ چکا ہے۔ حضرت عبداللہ
بن جعفر مکہ میں رہ گئے ہیں۔ امامت کی مصلحت نے انھیں اپنے ہمراہ نہیں لیا ہے۔

چند قدم چلنے کے بعد ایک مرتبہ قافلہ رکا۔۔۔۔۔۔ معلوم ہوا کہ عبداللہ بن
جعفر کے دو فرزند عون و محمد نیز قدم بڑھاتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ قریب آنے
پر معلوم ہوا کہ ابن جعفر نے ان کے درلیہ حاکم وقت کا امان نامہ بھیجا ہے۔۔۔۔۔۔
اور یہ کہلایا ہے کہ حضور کے لئے امان ہے۔ اب آپؓ یہیں قیام
فرما رہے ہیں۔

امام وقتؑ نے شریعت کا لحاظ کرتے ہوئے امان نامہ کو قبول نہیں کیا اور
قافلے کو آگے بڑھا دیا۔ حضرت عبداللہؓ نے اپنے دونوں فرزندوں کو ساتھ کر دیا کہ
اگر امام مظلوم پر کوئی وقت پڑ جائے تو یہ بچے کبھی امام پر قربان ہو جائیں۔

حضرت عبداللہ کی عظمت و جلالت میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔
وہ جعفر زلیار کے فرزند۔ حیدر کرار کے بیٹے اور ثانی ذہیرا کے شریک
زندگانی ہیں۔

ان کی بلندی و برتری کے لئے یہ بہت کافی ہے کہ مولائے کائنات ان سے
بہت محبت فرماتے تھے۔ اور اس حد تک محبت فرماتے تھے کہ ان کے ساتھ اپنی غزوہ
ترین صاحبزادی کا عقد فرما دیا ہے۔

لیکن اس کے بعد بھویر بانزا بڑے بڑے کہ اس جینہ عباسی علمدار نہیں تھے۔
ابن جعفر نے امان نامہ کو سفر عراق پر مقدم کیا اور چاہا کہ فرزند رسول مصائب دلا
سے بچ جائے اور ذہیرا کا گھرا جڑنے نہ پائے۔ ان کی نظر میں قربانی ایک معصیت
تھی اور شہادت ایک الم انگیز مرحلہ۔

لیکن عباسی علمدار کے غم و استقلال کا یہ عالم تھا کہ جب شمر ملعون امان نامہ لکھ
آیا تو آپ نے نہایت ہی سختی کے ساتھ امان نامہ کو رد کر دیا اور فرمایا کہ مجھے اس قسم کا
کوئی امان نامہ درکار نہیں ہے۔ ایسے امان نامہ پر لعنت اور اس کے لکھنے والے پر
لعنت

امان نامہ کو وجہ سکون قرار دینا عبداللہ بن جعفر کا کردار ہے۔ اور امان نامہ
کو ملعون قرار دے کر شمر اور عباسی علمدار کا طرز عمل ڈولوں اندازہ نظر میں جو فرق
لقوڑ کیا جاسکتا ہے وہی عباسی اور ابن جعفر کے کردار کا فرق ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ عباس کو اپنے ہمراہ لے چلے اور ابن جعفر کو
منزل پر چھوڑ دیا۔ کہ بلا کو عباسی کی سروریت ہے ابن جعفر کی نہیں۔ ابن جعفر کا کردار
وطن کے شایان ہے اور عباسی علمدار کا کردار کہ بلا کے لئے سزاوار ہے۔

ساحل مقصود

اس سے آگے جو بڑھا قافلہ بطحا
دفعتا زیر قدم سرحد مقصود آئی
شیں ہیں و جس جہ در سر پتہ ہیں
کشتی نوح غرباں سر حاصل پہنچی

(جیل منٹھری)

حرم کی دوسری تاریخ تھی جب حسینی کارواں اپنی آخری منزل پر پہنچ گیا
”اور چلتے چلتے رک گیا گھوڑا حسین کا“

امام عالی مقام نے گھوڑے کو بھیڑ کیا لیکن اس نے قدم آگے نہیں بڑھائے
آپ گھوڑے سے اتر پڑے اور آپ نے قریب کے لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ اس زمین
کا کیا نام ہے؟

لوگوں نے کہا: امارہ۔ فرمایا کیا اس کا کوئی اور بھی نام ہے؟ لوگوں
نے کہا: نہیں! پھر آپ نے یہی سوال کیا۔ لوگوں نے کہا: غاصریہ۔ آخر میں
کسی کی زبان سے نکل گیا ”کہ بلا“ آپ نے فرمایا
”هذه أرض كرب و بلاء“

یہ کرب و بلاء کی سرزمین ہے۔ یہیں ہمارا قیام ہو گا۔
یہیں ہمارے خون بہیں گے۔ یہیں ہمارے اہل حرم قیدی بنائے جائیں گے۔
یہ کہہ کر قافلہ کو روک دیا اور سامان سفر اترنے لگا۔

گھوڑے کا یکبارگی رک جانا۔۔۔۔۔ سات گھوڑوں کے تبدیل کرنے کے بعد کسی بھی گھوڑے کا قدم آگے نہ بڑھنا۔۔۔۔۔ خود ایک مستقل علامت تھی چہ جائیکہ خود اہام منظوم نے مستقبل کے واقعات پر مکمل طور پر روشنی کبھی ڈال دی اس کے بعد تو ہر ساقی اور ہرنچک کی یہ تمنا ہو نا چاہئے تھی کہ مولتا نلے کو آگے بڑھا دیکھے یہ جگہ قیام کرنے کی نہیں ہے ۔ اس سرزمین کے بارے میں متعدد ذخیریں ہمارے کانٹوں میں پری جزئی ہیں ۔

لیکن روایات گواہ ہیں کہ اس علاقہ کے باشندوں نے اس سرزمین پر قیام کرنے سے روکا اور اس کے سابقوں سے آگاہ کیا۔ لیکن کسی بچے نے قربانی دینے میں تکلف نہیں کیا۔

اس مقام پر کبھی حضرت عباسؓ کا جذبہ قربانی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے
 بنی ہاشم کا غیرت دار جوان عورتوں اور بچوں کے قیدی بنائے جانے کی خیر سنتا ہے
 اور ان تک نہیں کہتا: حکم حاکم کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ مرضی مولا ازہمہ ادنیٰ کا اس سے
 بہتر نمونہ کیا جو سکتا ہے۔

قافلہ رکا۔———— پانی کا کنارہ دیکھ کر خیمے لگب کئے گئے۔
صحرا میں ایسا بان کا معاملہ بچوں کا ساتھ ———— لو، دھوپ کا عالم
ضرورت تھی کہ قافلہ کسی مناسب جگہ پر ٹھہرے اور خیمے کسی محفوظ جگہ پر نصب کئے
جائیں۔ "قریبی ہاشم" نے اپنی آخری منزل تلاش کی اور دریا سے قریب خیمے لگب
کر دیئے

نظارہ پر کچھ کو یک گونہ سکون ملا کہ غربت و مسافت ہی
صحرا و بیابان ہی۔ دُطن سے دور ہی۔ کم از کم پانی سے تو
قرب ہیں۔ لیکن ایک دن گزارا تھا کہ حرکی اطلاع پر ابن زیاد نے ابن سعد کو بھیج دیا

اور اس نے کہ بلا کی زمین پر دارد ہوتے ہی پہلا پیغام یہ سنایا کہ آپ فرات کے کنارے سے اپنے نعیم بٹالیں گے۔ یہاں لشکرِ نرید کے خیمے نصب ہوں گے۔

اصولی اعتبار سے جس نے پہلے قبضہ کر لیا تھا اس کے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں
تھا۔ پھر فرات لشکرِ یزید کی ملکیت بھی نہیں تھا۔ اس کا معنوی تعلق
امام حسینؑ کی مادر گرامی کے مہر سے تھا۔

یہاں سے خیمے ہٹائے جانے کا مطالبہ ایک جنگ کو دعوت دینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور جنگ بھی کس سے؟ ————— حیدر گڑھ کے لال سے۔ شیر بمیشہ دودا لجمال سے۔ ۹۔

مسئلہ بڑے نازک موڑ پر آگیا۔ غیرت ہاشمی کو جو دشمن آنے ہی والا تھا کہ حکم الائمہ درمیان میں آگیا اور جن ہاتھوں نے خیمے نصب کئے تھے وہی خیمے اکھاڑنے میں مصروف ہو گئے۔

منبط نفس اور صبر و تحمل کا اس سے اعلیٰ مظاہرہ تاریخ عالم میں نہ ملے گا کہ عمت
آزما بہادروں کا قافلہ اس طرح دریا کا کنارہ چھوڑ دے اور چھوٹے چھوٹے پتھروں سمیت
دریا سے در خمیہ زن ہو جائے۔

کیا علیؑ کے لال کو اتنا بھی کہنے کا حق نہیں تھا کہ میں نے صفیں کا معرکہ دیکھا ہے۔ جہاں نہر پر قبضہ کرنے کے بعد پانی بند کیا گیا اور دشمن کی فوج کو پانی سے الگ نہیں کیا گیا۔

میں نے ابھی اسی حرکت کے لشکر کو سیراب کیا ہے اور دشمنی کے باوجود ان کا پیاسا منہ برداشت نہیں کیا۔

میرا باپ سانی کوثر ہے جس سے تم سب کی عاقبت وابستہ ہے اور وہی گرمی
محشر میں کام آنے والا ہے۔

یہ حضرت عثمان کی "سادگی" یا ضدی طبیعت تھی کہ انھوں نے ان "صحیح یا غلط" مطالبات کو مسترد کر دیا اور آخرش "بندش آب" کا شکار ہو گئے۔
ان کے مخالفین کا مطالبہ غلط اور ناجائز کبھی تھا تو اس کا تعلق ان کی ذات یا ملکی سیاست سے تھا۔ اور ایسے مسائل میں اپنی رائے سے پیچھے ہٹ جانا اور حزب اختلاف کے مطالبہ کا قبول کرنا کوئی غیر شرعی امر نہیں ہے۔
کر بلا کی نوعیت اس سے بالکل مختلف تھی۔ یہاں امام حسین کے پیش نظر کوئی ذاتی یا سیاسی مطالبہ نہ تھا۔

ذاتی اور سیاسی مرحلہ پر تو حضرت برابر اعلان کر رہے تھے کہ مجھے چھوڑ دو میں یمن، روم، ہند کسی دور دراز مقام پر چلا جاؤں۔
میں تمہارے امور ملکیت میں مداخلت نہیں کرتا۔ خاموشی سے زندگی گزار رہا ہوں۔ تم نے جہان بلا کر مجھ سے دعا کی اور آج میرے قتل کے درپے ہو۔

امام حسین سے یزید کا مطالبہ تمام تر مذہبی نوعیت کا تھا۔
یعنی بیعت

بیعت کا مطلب یہ ہے کہ امام حسینؑ معاذ اللہ یزید کے ہاتھ بک جائیں اس کی حکومت کو اسلامی تسلیم کر لیں اور اس کے ہر نیک و بد کی تائید کر دیں (اگر یزید کی زندگی میں نیک کام کا تصور ہو۔

امام حسینؑ کی نوعیت ایک عام مسلمان کی نہیں تھی کہ اس کی بیعت صرف اس کے مذہب و دین پر اثر انداز ہو۔ آپ اپنے دور کے دارث شریعت اور پورے اسلامی آئین کے ذمہ دار تھے۔ آپ کی بیعت ایک متدین کی بیعت نہ تھی بلکہ اصل دین کی بیعت تھی۔ آپ کا ایک بک جانا ایک انسان کی ضمیر فردشی کے مراد

نہ تھا بلکہ رسالت و توحید کے بچ دینے کے مرادف تھا۔

اس لئے آپ نے تمام مصائب کو برداشت کر لیا اور بیعت قبول نہ کی۔
خدا جانتا ہے کہ امام حسینؑ کے پیش نظر بیعت جیسے غیر شرعی مطالبہ کے علاوہ کوئی بھی سخت سے سخت تر مطالبہ ہوتا تو آپ اسے قبول فرما لیتے اور اتنی بڑی قربانی نہ دیتے۔

لیکن مقدر یہ نہ فیصلہ کر چکا تھا کہ یزید کی شقاوت و بد بختی بیعت ہی کا مطالبہ کرے اور امام حسینؑ اس مطالبہ کو قبول کرنے سے مجبور ہو جائیں جس کے نتیجہ میں انھیں شہادت کی منزل سے ہمکنار ہونا پڑے۔

کر بلا کے مصائب میں "بندش آب" کو قبول کر لینا حفاظت خود اختیار کے بعد کی منزل تھی۔ جہاں اس سے بچنے کی کوئی شرعی وسیلہ نہ تھی اور یہی امام حسینؑ کے کردار کی اہم ترین دلیل ہے کہ آپ نے ہر ممکن مصیبت کو برداشت کر لیا اور یزید کے کسی غیر شرعی مطالبہ کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

كَأَدْرَى الْمَوْتِ الْإِسْعَادُ وَالْحَيَاةُ مَعَ الظَّالِمِينَ الْآبْرَصَا
"میں موت کو نیک سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندہ رہنے
کو بد بختی و کم نصیبی۔"

نصبِ خیم اور جنابِ زینبؓ

ادھر جناب عباسؓ خیمِ حسینی کے لقب کرنے میں مصروف تھے اور ادھر امام حسینؓ خیمہ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے بے ثباتی دنیا کا اعلان کر رہے تھے۔

يَا دَهْرُ أَتَيْتَ لَكَ مِنْ خَلِيلٍ
كَمَ لَكَ يَا لَشَرِّاقٍ وَالْأَحْيَلِ
جناب زینبؓ نے بھائی کے یہ اشعار سننے اور سنتے ہی غش کھا گئیں۔ اللہ ان اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میرا بھیا مجھ سے چھٹ جائے گا۔ یہ میرے بھائی کی قتل گاہ ہے جہاں آج زینبؓ وارد ہوئی ہے۔
امام حسینؓ نے یہ منظر دیکھا تو دوڑ کر بہن کے پاس آئے اور پانی چھڑک کر ہوش میں لائے۔

(اثارة الاحزان قلمی کتب خانہ خدابخش پٹنہ)

مقاتل سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ دوسری محرم کا ہے جب حرمِ حسینی وارد کر بلا ہوئے اور خیمِ حسینی لقب کئے گئے۔ اس لئے لفظ العین ص ۲ میں اس کے بعد کی عبارت یہ ہے۔

« ثُمَّ دَخَلَ الْخِيَامَ فَتَصَايَحُنَ وَعَلَّتْ أَصْوَاتُهُنَّ
بِالْبُكَاءِ وَالنَّحْيِ فَدَخَلَ الْخِيَامَ وَقَالَ لِهَيْتَ
صَبْرًا يَا أَهْلَ الْبَيْتِ فَقَالَتْ زَيْنَبُ لَأَصْبِرَنَّ عَلَى فَقْدِكَ وَلَا

تَطِيبُ لَنَا الْحَيَوَةَ مِنْ بَعْدِكَ كَيْفَ لَا نَبْكِي وَأَنْتَ تَقُولُ هَذَا الْكَلَامَ
وَذَلِكَ قَتِيلًا وَمَا لَكَ ذَهَبًا بَيْنَ الْعِدَى وَحَرِيمِكَ سَبِيًّا »

اس کے بعد سید انیاں داخلِ خیم ہوئیں اور نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہو گئیں
امام عالی مقام خیمہ میں داخل ہوئے اور فرمایا۔ میرے اہل بیت
صبر کرو! جناب زینبؓ نے فرمایا۔ بھیا تمہارے فراق پر کیسے صبر کروں۔ تمہارے
بعد زندگی کیسے اچھی لگے گی۔

بھیا کیسے نہ روؤں۔ آپ تو ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ جیسے آپ شہید ہوں گے
آپ کا مالِ تباہ ہو گا اور آپ کے اہل حرم قیدی بنیں گے۔

بعض ادبِ بابِ قلم نے اس مقام پر شدید اشتباہ فرمایا ہے اور ان کا خیال ہے کہ
یہ واقعہ ۹ محرم کا ہے۔ جس کے بعد وجودِ آب کی ایک پوری بحث عالم
وجود میں آگئی ہے۔ اور مخلصین ولاء اہل بیت یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ۹ محرم کو
امام حسینؓ کو پانی کہاں سے ملیں ہو گیا کہ بہن کے چہرہ پر پانی چھڑک کر انھیں ہوش
میں لے آئے۔

علامہ شہرستانی نے اس اشتباہ کی بہترین تاویل کی ہے کہ پانی چھڑکنے سے مراد
اشک افشانی ہے۔

امام حسینؓ کے پاس پانی تو نہیں تھا البتہ اشکوں کی فراوانی تھی۔ چنانچہ آپ نے
آنسو چھڑک کر بہن کو سیدار کیا اور جناب زینبؓ کو ہوش میں لے آئے۔

علامہ موصوف کو یہ ضرورت اس لئے پیش آئی کہ انھوں نے بھی واقعہ اسی وقت
کا خیال کیا ہے جب غموں میں پانی کا قحط ہو چکا تھا اور امام عالی مقام کے لئے پانی
چھڑکنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

حالانکہ یہ واقعہ ۲ محرم کا ہے جس وقت خیام میں قطعی طور پر پانی کا امکان موجود تھا اور حضرت بہن کو ہوش میں لاسکتے تھے۔ تاہم علامہ شہرستانی کا یہ انتباہ قابلِ تحسین ہے کہ انھوں نے روایت کے مفاسد پر نظر کی اور اس کی ایک تادیلی پیش کر دی۔

ان کی تادیل ان تمام اربابِ قلم کے لئے شمعِ راہ ہے جنہوں نے دوسری محرم کو نوں محرم بنا دیا۔ لیکن وجودِ آب کے مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے دو لڑکا تادیل میں لگ گئے۔

خیامِ حسینی

فرات کا کنارہ چھوڑنے کے بعد امام حسینؑ کے خیام کس مقام پر نصب ہوئے۔ یہ ایک تاریخ کا اہم مسئلہ ہے جسے اکثر مورخین نے نظر انداز کر دیا ہے۔ علامہ سفرائینی نے اس کی مقدار ایک فرسخ کے قریب بتائی ہے۔ یہ فاصلہ اگرچہ باری النظر میں قرین قیاس نہیں ہے لیکن ظلمِ یزید کے پیش نظر اور دشمن کے اپنی فوجوں کی رہائش گاہ کے انتظامات کے لحاظ سے زیادہ بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔ دشمن کا تمام تردد عاید تھا کہ ہماری ساری فوج دریائے قریب رہے اور امام حسینؑ کا کوئی سپاہی دریا کے قریب نہ آئے پائے۔

سہ ترجمہ فارسی تاریخ اعظم کوئی ص ۳۶۶

دشمن کی فوج بھی کوئی معمولی فوج نہ تھی۔ کم سے کم تعداد تیس ہزار کی بتائی جاتی ہے۔

پانچ یا چھ ہزار فوج تو دروازوں ہی ابنِ سعد لے کر نازل ہوا تھا۔ اس کے بعد ۲ ہزار شمر لایا۔ ۲ ہزار یزید ابنِ رکاب۔ ۲ ہزار حصین بن نمیر۔ ۳ ہزار مضارب بن ربیعہ۔ ۲ ہزار نصر ابنِ خربشہ۔ ۲ ہزار عمرو بن قیس۔ ۲ ہزار سنان بن انس۔ ۱ ہزار محمد بن اسعث۔ ۱ ہزار عبداللہ الحصین۔ ۳ ہزار شیبث ابنِ ربیع لے کر آیا تھا۔

اور صاحبِ دمعہ ساکبہ کی روایت یہ ہے کہ یزید شکر میں ۸ ہزار اور صرف کوفے سے آئے تھے۔ جن میں کوئی شامی یا حجازی نہ تھا (دمعہ ساکبہ ص ۳۲۲)

اس کے علاوہ کوفہ میں ابنِ زیاد کا اعلان عام تھا کہ کوفہ بالکل خالی کر دیا جائے اور تمام لوگ کربلا قتلِ حسینؑ کے ارادہ سے روانہ ہو جائیں۔ حد ہو گئی کہ ایک شخص شام سے اپنا قرض وصول کرنے آیا تھا تو اسے بھی اس جرم میں قتل کر دیا گیا کہ کربلا کیوں نہیں گیا۔

(الصار: السین علامہ ساد ص ۱۸)

ایسے حالات میں فوجیوں کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ابنِ زیاد کے امکان میں جتنے سپاہی بھی تھے سب کربلا پہنچ دیئے گئے تھے۔

اتنی بڑی فوج کی ضرورت کیا تھی؟ اس کی بہت سی توجیہات ہیں۔ بعض اربابِ قلم کا اندازہ ہے کہ ابنِ زیاد لشکروں کی کثرت سے امام حسینؑ کو مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ ابنِ زیاد خود اس قدر مرعوب تھا

کہ لشکر پر لشکر بھیجے جا رہے تھے۔ اور یہ بات بڑی حد تک قرین قیاس بھی ہے۔

لہذا یاد کا ایک تلخ تجربہ یہ بھی تھا کہ اس نے حضرت مسلم جیسے غریب الدیارتہنا انسان کے لئے جس قدر فوج بھیجی تھی وہ ناکافی ہو گئی۔ اور اب تو بہت سے بہادر یکجا ہو گئے ہیں جن میں صفین کا کسب مجاہد عیاش بھی ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ ابن زیاد جیسے جبری کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا ہو — وہ تو خود ہی اس قدر مرعوب تھا کہ اتنی فوج کے باوجود میدان کربلا تک آنے کی ہمت تک نہ کر سکا تھا۔

اس کے سامنے مولائے کائنات کا یہ فقرہ بھی رہا ہو گا کہ جب شام کے حاکم معاویہ نے مولائے کائنات کے سفیر حضرت... طراح بن عدی سے کہا تھا کہ میں نے علی کے لئے رائی کے دانوں جیسا لشکر ہبیا کیا ہے — تو طراح نے جواب دیا تھا کہ علی نے ایک مرغ پال رکھا ہے جو سارے دانوں کو ایک دفعہ میں سہم کر جائے گا۔

ظاہر ہے کہ جس علی کا تربیت کردہ مالک اشتراک بنا اور سواد و سادت ہو کہ ایک لاکھ کا تنہا مقابلہ کرے — اس کا عباس کس قدر شجاع اور بہادر ہو گا۔

آفریں آفریں اے منتظم لشکر شاہ
واہ لاکھوں سے بہتر کو لڑانے والے

فلسفہ جہاد اور زمین کربلا

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین نے فرات کا کنارہ چھوڑنے کے بعد کربلا کے باشندوں کو طلب کیا اور ان سے اس علاقہ کی زمینوں کی خریداری کے بارے میں دریافت فرمایا۔

جب وہ لوگ تیار ہو گئے تو آپ نے ہر مرلج میل زمین ۶۰ ہزار درہم میں خرید فرمائی۔ (کشکول بہائی)

زمین مکہ خریداری کے بعد آپ ان زمینداروں کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ نے فرمایا کہ میں یہ زمین تم لوگوں کے نام ہیہ کر دیتا ہوں — لیکن اس کی چند شرائط بھی ہیں۔

ہماری قبروں پر کاشت نہ کرنا۔ ہمارے زائرین کو نشان قبر بتاتے رہنا۔ ہر زائر کو اپنا جہان بنانا اور تین روز تک یہاں نوازی کرنا وغیرہ۔

اس مقام پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں

(۱) اس عالم غربت و مساقفت میں امام حسین نے زمین کو کیوں خرید فرمائی۔

(۲) خریداری کے بعد اسے ہیہ کیوں کر دیا۔

(۳) ہیہ کو مشروط کیوں قرار دیا۔

پہلے سوال کا حل اسلام کے فلسفہ جہاد میں تلاش کیا جاسکتا ہے

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دین اسلام نے ابتدائی تبلیغی جہاد کو بھی رد رکھا ہے اور صاحب امر کو اجازت دی ہے کہ وہ تبلیغی امام حجت کے بعد جنگ کا آغاز کرے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ اسلام نے اس قسم کا کوئی اقدام کیا ہو ————— جہاد کے لئے ہمیشہ اس امر کا التزام رکھا گیا ہے کہ دشمن کی طرف سے پہل ہر جائے تو اس کے بعد کوئی جوابی کارروائی کی جائے۔

یعنی اسلام نے جہاد کو ہمیشہ دفاعی رنگ دیا ہے ابتدائی کایہ دائی نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ صدر اسلام کی تمام جنگوں کا محل وقوع بلاد اسلام سے قریب تر اور اڑانی کفر سے دور تر تھا۔ کفر حملہ آور ہوا کرتا تھا تو اسلام اس کے دفاع کے لئے میدان میں اترتا تھا۔

میدان جنگ نہ اسلامی علاقہ ہو اگر تاقتا اور نہ کفر کا علاقہ ————— لیکن
اسلامی علاقہ سے قریب تر مزدور تھا جو اس بات کی دلیل تھا کہ جارج اور حملہ آور کفر ہے
اسلام نہیں ہے۔

تاریخ میں ایک ہی موقع آیا تھا جہاں اسلام پر جارحیت کا الزام آ سکتا تھا
لیکن حضور سرور کائنات کے کمال تدبیر نے اس موقع کو نہایت خوش اسلوبی سے طام
دیا اور حدیبیہ کی فتنہ پر جنگ کے بجائے صلح فرمائی۔
فتح مکہ میں بھی رسول اعظم نے تلوار سے کام نہیں لیا۔ کہ کفر والوں کو اسلام پر جارحیت
کا الزام لگانے کا موقع نہ ملے۔

مرسل اعظم کے بعد جبل و صغیر و نہر زان کے معرکے بھی اسی نوعیت کے ہیں مولائے کائنات پوری مملکت اسلامی کے سربراہ تھے۔ آپ کو حکومت کرنے کا خدائے اور جمہوری دلائل قسم کا حق حاصل تھا۔

اب جو بھی جنگ ہوگی وہ آپ ہی کے علاقہ میں ہوگی۔ لیکن

اس کے باوجود آپ نے کمالِ اہتمام یہ فرمایا کہ دشمن کے ناپاک غرائم کو اس وقت تک برداشت کیا جب تک دشمن آپ کے علاقہ میں نہ آگیا۔

”بغاوت“ کے اصولوں سے معاویہ کو شام کا واکم تسلیم بھی کر لیا گیا تو عراق کسی قیمت پر معاویہ کے زیرِ اقتدار نہیں تھا۔

مولا نے کائنات کے کمال کی بات کا شام کا دیکھا کہ آپ نے صغیر کی لڑائی
شام کے علاقہ میں نہیں ہونے دی۔ بلکہ دشمن کی پیش قدمی بھی برداشت
کرتے رہے یہاں تک کہ دشمن آپ کے حدود مملکت میں آگیا تو آپ نے جوان کاروان
کے لئے قدم اٹھا لیا۔

جبل کا واقعہ اس سے کہیں زیادہ واضح ہے۔ ام المومنین عائشہؓ نہ حاکم تھیں نہ بوسرورہٗ منکث۔ انھیں کسی کے علاقہ میں نہ صف آرائی کرنے کا حق تھا اور نہ جہاد کا۔ عورت ہرنے کے اعتبار سے کبھی ان سے جہاد ساقط تھا۔ . . . لیکن اس کے باوجود جب انھوں نے اقدام کیا تو امیر المومنینؓ نے اس وقت تک سکوت اختیار فرمایا جب تک ان کی فوجوں کی مکمل زیادتی سامنے نہ آگئی۔

نہروان کی جنگ باغیوں کی سرکوبی کی جنگ ہے اور یہ جنگ ہمیشہ حکومت کی سر زمین پر واقع ہوتی ہے۔ اس میں علاقائی سالمیت جیسی کسی چیز کا نام نہیں لیا جاتا اور حملہ آور طے کیا جاتا ہے۔ باقی بہر حال حملہ آور ہر تباہی چاہے اپنے گھر کے اندر ہی کیوں نہ بیٹھا رہے۔ حقیقی طور پر مسلم المذہب حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا تسلل اور فوج کشی سے کم نہیں ہے۔

رسول اسلام اور امیر المومنین نے ایک طرف دشمن کے حملہ کا انتظار کر کے اپنے مجاہدات کو دفاع کا رنگ دیا اور دوسری طرف یہ کبھی واضح کر دیا کہ اسلام کسی کے علاقہ پر حاکم اور نہیں ہوتا۔

آج کی جنگ اور کل کے جہاد کا ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ آج کے مالک دشمن کو یہ چیلنج دیتے ہیں کہ لڑائی تمہاری زمین پر ہوگی اور اسی کو اپنی فتح و کامرانی کا شاہکار سمجھتے ہیں۔

اسلام نے ہمیشہ اس بات کا انتظار کیا کہ لڑائی ہمارے علاقہ میں ہو تا کہ ہمارے ادب و جارحیت کا الزام نہ آنے پائے۔

مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں مسلسل مصائب جھیلنے کے بعد بھی رسول اعظم کا تلوار نہ اٹھانا۔ اور مدینہ پہنچتے ہی جہاد کا اعلان کر دینا۔ حالات کی نشاندہی کے ساتھ اسلامی جہاد کی بھی وضاحت کرتا ہے۔

مکہ معظمہ حرم الہی ہونے کے علاوہ کفر و اسلام کی مشترک بستی تھا۔ یہاں ہونے والی جنگ کو خانہ جنگی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ رسول اعظم نے اس امر کا انتظار کیا کہ میں مشترک بستی سے نکل کر کسی ایسی جگہ پر چلا جاؤں جو میرا مخصوص علاقہ ہو اور وہاں کفر کا کوئی ادعا ملے ملکیت نہ ہو۔

مدینہ کی سرزمین اس مقصد کے لئے بہترین سرزمین تھی۔ وہاں کے لوگوں نے حضور کو جہان کیا تھا۔ آپ کو پناہ دی تھی۔ اور آپ کا دارالہجرہ بنا دیا تھا۔ یہاں کفار قریش کا کوئی دخل نہیں تھا۔

سرکارِ دو عالم کو اطمینان تھا کہ اس سرزمین پر ہونے والی ہر جنگ دفاعی جنگ بنے گی اور مجھ پر جارحیت کا الزام نہ آسکے گا۔ اس لئے آپ نے جہاد کا حکم دے دیا اور برابر غزوات کا سلسلہ قائم رہا۔

۶ھ میں اس کی نوعیت بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ اور حضور بار آورہ حج بیت اللہ مکہ معظمہ کی طرف گئے تھے۔

مکہ معظمہ آپ کا وطن تھا لیکن ہجرت کے بعد کفر کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا اور

اور اب اسے کفر کا علاقہ شمار کیا جاتا تھا۔

ایسی حالت میں کوئی ایک قطرہ خون بھی بہہ جاتا تو اسلام کا پاک و پاکیزہ دامن جارحیت کے داغ سے داغدار ہو جاتا اور اس کی پیشانی پر ایک بڑنا دھبہ لگ جاتا۔ رسول اعظم نے حالات کی نزاکت کا مکمل اندازہ کر لیا اور حکم الہی کے تحت صلح فرمائی۔

تاریخ کے اور اق گواہ ہیں کہ اس موقع پر بھی بعض مسلمانوں نے اپنی افتاد و طبع کے مطابق سکوت نہیں کیا بلکہ اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ بعض نے تو حضور کی رسالت ہی کو مشکوک بنا دیا۔

لیکن حضور نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے ارادہ پر قائم رہے امیر المؤمنین نے صلح نامہ لکھا اور آپ حج کو ترک کر کے واپس تشریف لے گئے۔

رسول اعظم کا غم و استغفال اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا موقف اس بات کا گواہ ہے کہ رسول اکرم جس روح اسلام سے آشنا ہیں۔ آپ جہاد کی جو اسپرٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں میں نہیں ہے۔ یہ صرف تلوار چلانا جانتے ہیں۔ انھیں لڑنے مرنے سے کام ہے۔ ان کے حصے میں جاہلیت کی غارت گری ہے اسلام کا جہاد نہیں ہے۔

انھیں یہ خبر بھی نہیں ہے کہ حضور اکرم کے اس عظیم کردار کی مصلحت کیا ہے اور آپ موقع سے فائدہ اٹھا کر حملہ کیوں نہیں کرتے؟

رسول اکرم کے بعد آپ کی ذریت نے اسلامی جہاد کی شان کو مکمل طور پر برقرار رکھا اور کسی محل پر بھی جہاد کے فلسفہ کو بدنام نہیں ہونے دیا۔

امام حسینؑ یحییٰؑ پاک میں آخری فرد تھے جن کے حصہ میں جہاد کا میدان آیا تھا۔ آپ ظالموں کے ظلم سے غریب الوطن ہو چکے تھے۔

مدینہ آپ سے چھٹ چکا تھا۔ ارض حرم میں آپ کو پناہ نہ مل سکی تھی۔ لشکر خرمے آپ کا راستہ روک لیا تھا۔ اور بالآخر آپ کو بلا کی سرزمین پر پہنچ گئے تھے۔ جو بعد میں محاذ جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

ظالم تارخ کے نمک خوار مورخین اپنے سلاطین کی خوشامد کے لئے حقائق کو مسخ کرتے تو مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے حالات پر پردہ ڈال کر دنیا کے اسلام کو یہی بادور کراتے کہ یزید پوری اسلامی مملکت کا مالک تھا اور امام حسینؑ اپنے وطن سے اس کے خلاف "بغاد" کے لئے نکلے تھے۔

آپ کا اقدام معاذ اللہ ایک خرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے لئے آپ کے ساتھ وہی برتاؤ ہونا چاہیے تھا جو حکومت یزید نے کیا اور جو دنیا کی ہر حکومت اپنے "باغی" کے ساتھ کیا کرتی ہے۔

لیکن امام حسینؑ نے ایک مختصر اقدام سے ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا اور ظلم کی حسرت دل کی دھند میں رہ گئی۔

مکہ یا مدینہ میں معرکہ کارزار گرم ہو جاتا تو ہر الزام ممکن تھا۔ آپ نے کمال تدبیر اور علم امامت سے کام لے کر پہلے اپنے کو اس منزل تک پہنچایا جہاں آپ کی شہادت مقدور تھی۔ اس کے بعد وہاں بھی یزیدیت کا قبضہ دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ یورا میدان جنگ اپنے قبضے میں لے لیا جائے تاکہ اس سرزمین پر جو کبھی معرکہ آرائی ہو وہ میری ذاتی ملکیت پر یزید کے علاقہ میں نہ ہو۔

فلسفہ جہاد کا یہ تحفظ مقصود نہ ہوتا تو دس بیس گز زمین بہت کافی تھی چھوٹا سا لشکر شہادت کے بعد دفن ہو جاتا۔ یا خود وہاں کے زمیندار لاشوں کے دفن کی اجازت دے دیتے۔ چار میل زمین خریدنا دفن کی مصلحت سے بالاتر ایک مصلحت کی نشاندہی کر رہا ہے اور وہ یہی ہے کہ یہ آخری جہاد بھی اپنے دفاعی انداز کو محفوظ رکھے اور اس پر کسی

جارحیت کا الزام نہ آنے پائے۔

اس مقام پر ایک بنیادی سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے دوسری قوموں سے الگ نظام جہاد کیوں مقرر کیا ہے اور اس کے یہاں دشمن کے علاقہ پر جنگ لڑنا کیوں محدود نہیں ہے؟

دنیا کی دوسری قوموں میں یہ اقدام ناحق نہ کہا جاتا ہے تو کیا اسلام جنگ میں فتح کے علاوہ کچھ اور چاہتا ہے اور کیا اس کی لڑائیوں کا مقصد شکست ہی شکست ہوتا ہے؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام دنیا کے دوسرے نظاموں کی طرح فتح و کامرانی ہی چاہتا ہے اور دفاعی جنگ میں بھی اس وقت تک میدان میں نہیں آتا جب تک فتح و کامرانی کے امکانات قوی نہیں ہوتے۔

لیکن اس کا معیار فتح دیگر اقوام عالم سے کچھ مختلف ہے اور وہ اسے بھی فتح سمجھتا ہے۔ جسے دوسری قومیں شکست تصور کرتی ہیں اور اسے بھی شکست کا نام دیتا ہے جس پر دوسری قومیں ناز کرتی ہیں۔

اس کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ فتح و کامرانی مقصد کے اعتبار سے ہے جو فریق اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ فاتح کہا جاتا ہے اور جسے مقصد کے حصول میں ناکامی ہوتی ہے وہ مغضوب اور شکست خوردہ کہا جاتا ہے۔

مقصد کی فتح اقوام کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے اور یہیں دیکھنا پڑتا ہے کہ کون سی قوم کس مقصد کے لئے لڑ رہی ہے۔ اقتدار کے لئے لڑنے والے اقتدار یا کوفت کہے جاتے ہیں۔ علاقہ کے لئے جنگ لڑنے والے علاقہ نمالی کرا لینے کے بعد فاتح تصور کئے جاتے ہیں۔ اور معنوی مقاصد کے لئے میدان جنگ میں اتارنے والے اس وقت تک فاتح نہیں کہے جاتے جب تک مقاصد کی تفصیل کا مکمل سامان نہ ہو جائے چاہے سارا علاقہ اپنے قبضہ میں آجائے اور سارا تخت اقتدار زیر قدم ہو جائے۔

اسلام کی جنگ اور اقوام عالم کی لڑائی کا ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ دنیا کی قومیں عام طور پر زن۔ زر۔ زمین کے لئے جنگ کیا کرتی ہیں۔ اور اسی لئے ان پر قبضہ کر لینے کے بعد جنگ بھی ختم کر دیتی ہیں۔ اور اپنے فاتح ہونے کا اعلان بھی کر دیتی ہیں۔ لیکن اسلام کا مقصد جہاد اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ قیام دین اور مفاد مذہب کے لئے جہاد کرتا ہے اور اس وقت تک سلسلہ جہاد متوقف نہیں کرتا جب تک قیام دین کے جملہ وسائل فراہم نہ ہو جائیں۔

اسلام کے پیش نظر دور حاضر کی تباہی و بربادی اور عصر حاضر میں آئین شریعت کی پامالی بھی ہے۔ اس نے ابھی ایک جہاد بچا کر رکھا ہے جس کے بعد دین کا مکمل قیام ہوگا اور لادینیت تباہ و برباد ہو جائے گی۔

قیام دین کے مقصد تک اعلان امام حسینؑ نے حضرت محمد مصطفیٰ کے خط میں کیا تھا جس میں اس امر کی سراحت تھی کہ امام قیام حق کا ذمہ دار ہوتا ہے اور میں امام برحق ہوں اس لئے میرا فرض ہے کہ دین کو قائم کر دوں چاہے اس راہ میں کسی قدر قربانیوں کیوں نہ دنیا پڑیں۔

امام حسینؑ کے اسی مقصد کا اعلان ان لفظوں میں کیا گیا ہے

إِنْ كَانَ دِينُ مُحَمَّدٍ لَمْ يَسْتَقِمْ
إِلَّا بِقَتْلِي يَأْتِيكَ خُذْ بِي

”اگر محمدؐ کا دین میرے قتل کے بغیر مستحکم نہیں ہوتا تو آؤ سوارو۔“

آؤ یہ حسینؑ کی گردن حاضر ہے اسے لے لو۔“

امام حسینؑ کے زمینوں کی خریداری کے بعد بیہ گردینے کی ایک مصلحت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مجھے کوئی علاقائی جنگ نہیں لڑنا ہے۔ مجھے زمینوں پر قبضہ کرنے کا شوق نہیں ہے میں نے خود اپنی مملکت کو زمین بھی اس کے مالکوں کے ہاتھ بہہ کر دی ہے

مجھ پر تو وسیع پسندی کا الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا۔

میرا جہاد ایک عظیم مقصد کے لئے ہے جس کی ایک دفعہ طرز عمل بھی ہے جس کا تم مشاہدہ کر رہے ہو۔ اسلام کے مقدس آئین میں یہ اخلاقی برتاؤ اور یہ داد و بخش کا انداز بھی ہے جس کا آج میں نے مظاہرہ کیا ہے۔

تو وسیع پسندی کے لئے جنگ کرنے والے اور ہوتے ہیں۔ اور قیام حق کے لئے جہاد کرنے والے اور۔

توسیع پسند افراد اسلحہ فراہم کرتے ہیں۔ فوجیں بڑھاتے ہیں، بڑی طاقتوں کا سہارا لیتے ہیں۔

فوجوں سے غلط بیانات کرتے ہیں۔ فتح کو فتح اور شکست کو شکست نہیں کہتے اور قیام حق کے لئے جہاد کرنے والوں کے واسطے ہی سب باتیں قطرہ امتیاز ہیں۔ یہ لوگ اسلحہ اور سہتیا ر سے جنگ نہیں کرتے۔

ان کے یہاں فوج کبھی تاریکی میں نہیں رہتی۔ ایمان کی طاقت سے جہاد کرتے ہیں اور ہر شخص کو اسکی شہادت سے باخبر کر دیتے ہیں۔

فلسفہ جہاد کے تحفظ کے بعد امام مظلوم نے قبروں کا اہتمام شروع کیا اور زمین کو اہل کوفہ کے نام بہہ کر دیا۔ تاکہ یہ لوگ مظلومین کی قبریں تیار کر دیں اور سیدوں کی لاشوں کے دھن میں سہولت ہو جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قبروں کے لئے بہہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لئے صرف وصیت کافی تھی۔ اہل قریہ کو جہانوں کی جلالت قدر اور ان کی مظلومیت کا اندازہ ہوگا تو خود ہی دین کا اہتمام کریں گے۔

لیکن اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ امام پیغمبرؐ اپنے آخری اسکانات تک کسی نذر یا جماعت کا احسان نہیں لیتا۔

زمین کر ملا کو اپنی ملکیت پر باقی رکھنے کے بعد دفن کی وصیت فرماتے اور وہ لوگ دفن کا اہتمام و انتظام کر دیتے تو معقول کی گردنوں پر ایک قسم کا احسان ہو جاتا اور امام کسی بھی قیمت پر یہ احسان برداشت نہیں کر سکتا۔

روایات میں مرسل اعظم کی یہ دعا موجود ہے کہ "پروردگار مجھ پر کسی اذی اور غیر کا احسان نہ رکھنا۔"

علی طور پر بھی مرسل اعظم نے برابر اس حقیقت کا اعلان کیا ہے۔ ہجرت کی رات جب ہم سفر ابو بکر نے آپ کی خدمت میں اپنا نادر سوار ہی کے لئے پیش کیا تو آپ نے پہلا سوال یہ فرمایا کہ اس کی قیمت کیا ہے۔

انھوں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا تو آپ نے فرمایا کہ "نہی کسی کا شرم نہ احسان نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد قیمت دے کر نادر حاصل کیا اور اس پر سوار ہو کر مدینہ کی طرف تشریف لے گئے۔

روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مزاج نبوت و امامت کسی کے احسان کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ تاریخ میں صرف حضرت ابوطالب اور جناب خدیجہ کا امتیاز تھا کہ مرسل اعظم نے زندگی کے ہر موڑ پر ان دو شخصیتوں کا احسان قبول فرمایا اور کسی منزل پر ان کے احسانات کو رد نہیں کیا۔

یہاں تک کہ جناب ابوطالب کے انتقال کے بعد جب آپ جنازہ کے پیچھے چلے میں تو برابر کہتے جا رہے تھے۔ "چچا! خدا آپ کو جزائے خیر دے آپ نے مجھے احسانا کئے ہیں۔"

جناب خدیجہ کے بارے میں بھی تاریخ میں ایسے ہی فقرے ملتے ہیں کہ آپ خدیجہ کے بعد بھی بیت الشرف میں برابر ان کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ اور ایک مرتبہ جب حضرت

عائشہ نے عاجز بنا کر فرمایا کہ آپ کب تک اس ضعیف کو یاد کرتے رہیں گے۔ شکر خدا کیجئے کہ اس نے آپ کو ایسی اچھی اچھی خواتین عطا کی ہیں بھلا اب خدیجہ کے ذکر کا کیا عمل ہے۔

تو جبین نبوت پر شکن آگئی اور آپ نے فرمایا۔ "خبردار! تمہیں کیا معلوم خدیجہ کیا ہیں۔ خدیجہ اس وقت ایمان لائیں جب لوگ میری نبوت کا انکار کر رہے تھے۔

انھوں نے اس وقت مالی سہار دی کی جب کوئی سہار نہ تھا۔ اور انھوں نے اس وقت مجھے صاحب اولاد بنایا جب لوگ ابر کے طعنے دے رہے تھے۔

واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نبوت نے ان دونوں حضرات کے احسانات قبول فرمائے ہیں۔ اور انھیں تا عمر یاد رکھا ہے۔ اس کے علاوہ نبوت کسی کی شرمندہ احسان نہیں ہوتی۔

امامت بھی نبوت ہی کے مزاج کے امتداد کا نام ہے اور امام بھی امت میں کسی فرد کا شرمندہ احسان نہیں ہوتا۔ امام حسین نے چاہا کہ زمین کو بہہ کر کے ان سے مطالبات کئے جائیں تاکہ ان کا احسان ہماری گردن پر نہ ہونے پائے اور انھیں کی گردن پر ہمارا احسان رہے۔

اس کے بعد آپ نے چاہنے والوں کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا کہ تم سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ ہمارے زائرین کو ہماری قبروں کا نشان بتا دینا اور ان کی ضیافت کا انتظام کرنا۔ بندہ پروردی اور..... غلام لڑائی کی ایسی مثال تاریخ میں آئی محمد کے علاوہ کہیں اور نظر نہ آئے گی۔

ضرورت تھی کہ اسی منزل پر اس نکتہ کی بھی وضاحت ہو جاتی کہ اس وصیت کا منہموم کیا تھا۔ اور حضرت کس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن عمل و موقع کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے صرف اجمالی اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

امام حسین نے کھلی ہوئی لفظوں میں وصیت فرمائی جس کا صاف ساما مطلب یہ ہے کہ

امام کے پیش نظر وہ تمام افراد تھے جو آج تک زیارت کے شرف سے محروم رہے ہیں۔
اور جن کی ضیافت کے لئے حضرت نے اتنا بڑا علاقہ ہیہ کر دیا تھا۔

تین دن کی قید بھی اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ زائرین کا زیادہ قیام بھی مناسب نہیں ہے۔ اس طرح احترام میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور عبرت گاہ عالم جلوہ گاہ بن جاتی روایات میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ

زیارت کرو اور واپس جاؤ۔ ہمارے مشاہد کو جائے قیام نہ بناؤ۔ ہمارے زائرین کو برابر آنے دو اور ان کی زیارت میں خلل نہ پیدا کرو۔

اس مقام پر ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب دشمن نے امام علیہ السلام کے خیمہ کو فرات سے ہٹانے کی دعوت دی اور انھیں دروازہ مقامات پر خیمے نصب کرنے پر مجبور کیا تو حضرت عباس کو حلال آگیا۔ اور آپ ایک خط پہنچ کر ٹھہر گئے۔ فرمایا: خبردار اس خط کے آگے قدم نہ بڑھانا ورنہ کوئی سردوش پر نظر نہ آئے گا۔

مکن ہے کہ یہ خط اسی علاقہ کی تحدید جو جسے امام حسینؑ نے حاصل فرمایا تھا اور جس کو محاذ جنگ بنانے کے بعد اسلام کے مقصد جہاد کا مکمل طور پر تحفظ ہو سکتا تھا۔ روایت کسی مستند اور معتبر ناخذ میں میری نظر میں نہیں گزری لیکن اگر صحیح ہے تو اسے علاقائی حد بندی کے علاوہ دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔

سقائی

کربلا کی تاریخ میں حضرت عباسؑ کے کارہائے نمایاں میں سب سے اہم کارنامہ سقائی کا ہے بلکہ بعض حضرات علماء کی نظر میں یہی آپ کا واحد کارنامہ ہے جس میں آپ کو مکمل انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ اور کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں ہے۔ سقائیت کی تحقیق کے لئے ان تمام روایات کا جائزہ لینا پڑے گا جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ اور ان میں کسی نہ کسی پہلو سے سقائی کا ذکر کیا گیا ہے۔

خطیب اعظم مولانا سید غلام عسکری صاحب شاہ قیصر نے اپنی کتاب ”پریاس“ میں نہایت درجہ تفصیلی بحث کی ہے جس کے بعد کسی تفصیل کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔ موصوف کے بعض استنتاجات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس دیدہ ریزی سے آپ نے روایات کو ملاحظہ کیا ہے اور جس اخلاص کے ساتھ تاریخی مندرجات پر بحث کی ہے، کم از کم موضوع ”آب و عطش“ پر کسی اور نے یہ زحمت نہیں کی ہے اور آپ کا کارنامہ صرف اردو زبان والوں کے لئے نہیں بلکہ دیگر زبانوں کے مصنفین و مؤلفین کے لئے بھی شمع راہ ہے۔

ان روایات میں چند باتیں قابل لحاظ ہیں۔

- (۱) سقائی کی ضرورت۔
- (۲) سقائی کی حقیقت۔
- (۳) سقائی کے اسباب۔
- (۴) سقائی کی اہمیت۔
- (۵) سقائی کی تاریخ۔

سقائی کی ضرورت

یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تاریخ کسی بات کی شہرت اس کے غیر معمولی حالات و اسباب کی بنا پر دیا کرتی ہے۔ مطابق معمول حالات بات کی اہمیت کو کم کر دیا کرتے ہیں اور غیر معمولی حالات مسئلہ کی اہمیت کو دو چندان کر دیا کرتے ہیں۔

تاریخ کر بلا میں حضرت عباسؓ کی سقائی کی اہمیت اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد عمومی حالات میں پانی لا کر بچوں کو پلا دینا نہیں ہے جیسا کہ امام حسینؓ کے بے پناہ قومی اور سماجی احسانات میں تاریخ نے لشکرِ حر کو سیراب کرنے کا تذکرہ نہایت ہی شد و مد سے کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جن حالات اور جن مصالحوں کے تحت آپؑ نے یہ احسان فرمایا ہے وہ ایک غیر معمولی امر ہے اور ایسے حالات میں دنیا کا کوئی دوسرا انسان اپنے مخالف کے ساتھ ایسا احسان نہیں کر سکتا۔

اسی طرح حضرت عباسؓ کی سقائی کا امتیاز یہ بھی ہے کہ آپؑ نے صرف دریا سے پانی لا کر یا مشکیزہ کا دھانہ کھول کر بچوں کو سیراب نہیں کر دیا ہے بلکہ اس راہ میں غیر معمولی طور پر بے پناہ زحمات و مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ اب یہ مشکلات نتیجہ خیر ثابت ہوئیں یا نہیں۔ یہ تصویر کا دوسرا رخ ہے۔

اور یہی وہ رخ ہے جہاں سقائی کا سلسلہ بندش آب سے مل جاتا ہے۔ اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کر بلا میں بندش آب کا کیا ماحول تھا اور حضرت عباسؓ نے کن حالات میں یہ اقدام کیا تھا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ امام حسینؓ جس قدر پانی اپنے ہمراہ سفر میں لئے ہوئے تھے اس کا بیشتر حصہ حر کے سیراب کرنے میں صرف کر چکے تھے۔ اور فرزات پر قبضہ کرنے کے بعد کوئی وجہ نہیں تھی کہ "ظاہری حالات" کے تحت اصحابِ امام حسینؓ جمع آب پر کوئی زور دیتے۔

فرزات کے کنارے سے خیمے بھی کسی مصالحت و مفاہمت کی بنا پر نہیں ہٹائے گئے کہ پانی کا مکمل انتظام کر لیا جاتا۔

بلکہ نیریدی لشکر نے اپنے امیر کے حکم کا احترام کرتے ہوئے "بجبر" خیموں کو ہٹایا اور امام حسینؓ نے اصلاح امر کی آخری کوشش و جاری رکھنے کے لئے اس جبر کو برداشت کر لیا۔

جس کے بعد اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ امام مظلوم اپنے ہمراہ پانی کا کافی ذخیرہ لے کر دریا کا کنارہ چھوڑتے اور جو پانی کی مقدار ایک ہزار کے رسالہ کو سیراب کر سکتی تھی۔ وہ درجہ دار دن کے لئے اپنے ساتھیوں کے واسطے بھی کافی ہو جاتی۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ حر نے بھی خیمِ حسینیؑ کو عام جنگی تدابیر کے تحت نہیں ٹھہرایا کہ وہ جگہ میدانِ کارزار بننے کے لئے زیادہ مناسب اور سازگار ہو

بلکہ اس کے پیچھے بھی ابن زیاد کا یہ ابتدائی فرمان تھا۔
 ”لَا تَزِلُّهُ إِلَّا بِالْعَرَاءِ فِي غَيْرِ خُصْمٍ وَعَلَى غَيْرِ مَاءٍ“

طبری، کامل۔ ابو الفداء الاخبار الطوال وغیرہ۔

جس کے بعد اس کا بھی کوئی امکان نہیں رہ جاتا کہ حر کا لشکر اصحاب امام کو پانی لے کر دریا کا کنارہ چھوڑنے کا اختیار دیدے۔

اس کی تمام تر کوشش بھی ہوگی امام حسینؑ بے آب و گیاہ منزل پر رہیں اور انکے پہلو پانی بھی نہ رہنے پائے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابن زیاد نے اپنے فرمان میں یہ فقرہ ”میدان جنگ“ کی تعیین کے لئے نہیں استعمال کیا تھا بلکہ اس کا مقصد بھی روزِ ازل سے امام حسینؑ اور انکے بچوں کو پیاس کی مصیبت میں مبتلا کرنا تھا۔

اس کا سبب قتل عثمان کا انتقام ہو گیا کہ بعض مورخین نے نقل کیا ہے یا جنگی حالات میں اپنے حریف کو پیاس سے ہلاک کر دینا ہو گیا کہ دیگر مورخین نے نقل کیا ہے اور خطیب اعظم نے ثابت کیا ہے۔

یہ بہر حال مسلم ہے کہ ابن زیاد کے پیش نظر روزِ ازل سے امام حسینؑ کو پیاسا رکھنا تھا۔

اس کے بعد یہ احتمال ناممکن ہے کہ حر نے آب و گیاہ صحرا میں قیام کرنے پر مجبور کرنے کے باوجود یہ اجازت دیدے کہ آب و گیاہ مقام پر رہیں لیکن آب کے خیم میں پانی برابر جاتا رہے۔ یہ تصور تاریخ سے انتہائی غفلت اور حالات کے سلسلے میں کمالِ بصیرتی کا نتیجہ ہے۔

ابن زیاد کے ابتدائی فرمان کے بعد بندش آب کی تاریخ کا متعین کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

حیرت ان مورخین پر ہے جو ابن زیاد کے اس فقرہ کو نقل کرنے کے بعد بھی یہ سوچتے ہیں کہ پانی آسانی یا بدشواری خیم حسینؑ تک آتا رہا۔

جنگی حالات سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے بھی یہ جانتے ہیں کہ کوئی دشمن اپنے حریف کو مقصد کے خلاف ادنیٰ سہولت دینے پر راضی نہیں ہو سکتا۔ اور حکم ابن زیاد سے اتنا بڑا اقدام کرنے والا حر کسی بھی قیمت پر اس بات پر راضی نہیں ہو گا کہ خیم حسینؑ تک پانی پہنچتا رہے اور امام حسینؑ کے بچے سیراب ہوتے رہیں۔

ایسے حالات میں تو ”بندش آب“ کا ابن سعد کی طرف منسوب کرنا بھی ایک سادہ کا نتیجہ ہے۔

ورنہ حقیقت امر یہی ہے کہ یہ فرض سب سے پہلے اپنے امکان بھر کرنے انجام دیا ہے۔ اس کے بعد جب نیچے فرات سے ہٹ گئے تو مقصد کی حفاظت فوج نے مسئلہ کو اور بھی دشوار سمجھا دیا اور پانی مکمل طور پر روک دیا گیا۔

ابن سعد کا حکم مکمل طور سے پانی پر پابندی عائد کرنا تھا اور یہ کام اس نے میری حرم کو کر بلا میں وارد ہوتے ہی انجام دیدیا۔

دینا کا عام دستور ہے کہ محافظت کا اہتمام کی بلندی اور اس کی اہمیت کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے۔

ابن سعد کی نظر میں ”بندش آب“ کا مسئلہ صرف جنگی مسئلہ ہوتا تو شاید معالجت کی گفتگو کے باقی رہنے تک پانی پر پابندی عائد نہ کی جاتی۔ لیکن یہاں ایک طرف امیر کی مرضی ہے اور دوسری طرف قتل عثمان کا انتقام، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں اسباب کسی جنگ و جدل کے تابع نہیں ہیں۔ ان کے لئے ہر اسکا فی سختی ضروری ہے چاہے لڑائی کے حبلہ امکانات ختم ہو جائیں۔

مسئلہ بیعت اس سے ماسوا ہے کہ بیعت کے طلب گار کی آخری کوشش یہ تھی کہ

امام حسین کو ایسے حالات میں مبتلا کر دیا جائے کہ یہ مصائب سے گھبرا کر بیعت پر آمادہ ہو جائیں اور اس اہم مقصد کے لئے جتنے سخت مشکلات ممکن ہوں ان کے پیدا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

حاکم کی رضا مندی۔ قتل عثمان کا انتقام۔ بیعت کی طلب۔ اور اس پر جنگی تدابیر کا اضافہ۔ وہ متعدد محرمات میں جن کے بعد فوج دشمن کی طرف سے کسی سہولت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور ہر اس کافی سختی کا تصور مطابق حقیقت ہے چاہے اس کا کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہ بھی کیا جاسکے۔

جنگ کے دشوار ترین حالات کو پیش نظر رکھنے کے بعد خولی اور ابن زیاد کے خطوط میں اس لفظ کا تجزیہ کرنا ضروری ہے کہ خولی نے ابن سعد کے طرز عمل کے جنگی اعتبار سے نرمی کا احساس کر کے ابن زیاد کو اطلاع دی۔

”أَمَّا بَعْدُ أَيُّهَا الْأَمِيرُ إِنَّ عُمَرَ بْنَ سَعْدٍ يَخْرُجُ كُلَّ لَيْلَةٍ وَيَسْطُرُ بِسَاطًا وَيَدْعُو الْحُسَيْنَ وَيَتَحَدَّثُ ثَانٍ حَتَّى يَمُضِيَ مِنَ اللَّيْلِ شَطْرَهُ وَتَدَا أَدْمَاكُهُ عَلَى الْحُسَيْنِ الرَّحْمَةُ وَالرَّاقَةُ فَأَمْرُهُ أَنْ يَنْزِلَ عَنْ حُكْمِكَ..... وَأَنَا أَلْفَيْكَ أَمْرًا“

”امیر! عمر بن سعد ہر شب باہر نکل کر دیر دیر تک حسین سے باتیں کرتا رہتا ہے اور اس کا طرز عمل حسین کے بارے میں نرمی اور ہربانی کا بہتر ہے کہ تو اسے معزول کر کے مجھے سردار بنا دے۔ میں تیرے حکم کی مکمل اطاعت کروں گا اور حسین کے سلسلے کو صاف کر دوں گا۔“

ابن زیاد نے اس کے جواب میں ابن سعد کو یہ تنبیہ خط لکھا :-

”أَمَّا بَعْدُ يَا بَنَ سَعْدٍ قَدْ بَلَغَنِي أَنَّكَ تَخْرُجُ فِي كُلِّ لَيْلَةٍ وَتَسْطُرُ بِسَاطٍ تَدْعُو الْحُسَيْنَ وَتَتَحَدَّثُ مَعَهُ“

حَتَّى يَمْضِيَ مِنَ اللَّيْلِ شَطْرَهُ لَا تَسَادِ أَهْرَافَ كِمَارٍ فَإِنَّهُ أَنْ يَنْزِلَ عَلَى حُكْمِي فَإِنْ أَطَاعَ وَالْأَمْنَةُ مِنْ شَرْبِ الْمَاءِ فَإِنِّي حَلَلْتُهُ عَلَى الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى وَحَرَّمْتُهُ عَلَيْهِ وَعَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ فَحُلَّ بَيْنَ الْحُسَيْنِ وَأَصْحَابِهِ وَبَيْنَ الْمَاءِ أَنْ يَدُوقُوا مِنْهُ قُصْرًا كَمَا صُنِعَ بِالتَّقَى النَّقَى عُثْمَانَ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ الْمُظْلُوم“۔ الطبری۔ الايضار الطوال اسخ التوارخ وغیرہ۔

”ابن سعد مجھے خبر ملی ہے کہ تو ہر شب میں امام حسین کے ساتھ دیر دیر تک باتیں کرتا ہے۔ لہذا امیر احاطہ پڑھتے ہی ان سے کہہ دے کہ میرا حکم مان لیں اور اگر میری اطاعت نہ کریں تو انھیں پانی سے روک دے۔ میں نے اس بات کو یہود و نصاریٰ تک کے لئے حلال کر دیا ہے اور حسین اور ان کے گھروالوں پر حرام کر دیا ہے۔ حسین اور ان کے اصحاب اور پانی کے درمیان حائل ہو جا۔ اور وہ اسی طرح پانی کا ایک قطرہ نہ پینے پائیں جس طرح عثمان کو پانی نہیں دیا گیا ہے۔“

قتل عثمان کے انتقام کی تحریک شامی پر دینگڈے کی آخری کڑی ہے کہ ایک مرتبہ پھر حضرت علی پر خون عثمان لگا دیا جائے اور یہ ثابت کر دیا جائے کہ عثمان کے لئے بندش آب میں حضرت علی ہی کا ہاتھ تھا جب کہ تاریخ کا صاف اعتراف ہے کہ عاصیہ کے اور ان عثمان کے لئے امیر المؤمنین ہی نے پانی فراہم کیا تھا۔ اور سیلہ امام حسن اور امام حسین ہی کو بنایا تھا۔

لیکن پر دینگڈے کو حق اور باطل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادیں راست

گوئی اور راست بازی پر نہیں ہوتیں۔ اس کے لئے جھوٹ پہلی شرط ہے۔ اور جھوٹ کے بغیر سیاسی پروپیگنڈے کامیاب نہیں ہو سکتے۔

حیرت موزن طبری پر ہے کہ اسے واقعات کی حقیقت معلوم ہے اور اس نے اس مقام پر کوئی تبصرو نہیں کیا۔

مورخ صرف واقعہ نگار نہیں ہوتا اور تاریخ کی کتاب کوئی روزنامہ یا اخبار نہیں ہوتی کہ واقعات جوں کے توں نقل کر دیئے جائیں اور ان پر کوئی رائے بھی نہ دی جائے۔

تاریخ واقعات کے تسلسل کا نام ہے۔ اور مورخ کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نہایت درجہ دیانت داری کے ساتھ کڑیوں کو ملا سار ہے۔ طبری کا فرض تھا کہ وہ طالب علم کے ذہن کے اس نکتہ کی طرف متوجہ کر دیتا کہ امام حسین پر یہ الزام سراسر غلط تھا اور حضرت کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس طرح بہت سے واقعات مرتب کرنے میں سہولت ہوتی اور بے شمار غلط فہمیاں ذرا مل ہو جاتیں..... لیکن نقیب اور نمک خورای ان راہوں میں حائل ہو جایا کرتی ہے۔

تاریخی مسائل سے قطع نظر یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ خولی نے ابن زیاد کے خط میں لفظ "کل لیلۃ" استعمال کیا ہے اور ابن زیاد نے بھی اپنے جواب میں اس لفظ کی تکرار کی ہے۔

عربی اور اردو دونوں کے محاورات کے اعتبار سے "کل لیلۃ" اور ہر شب کا استعمال ایسے ہی مقامات پر ہوتا ہے جہاں واقعہ دس بیس دن تک برابر پیش آتا رہتا ہے۔ دو چار چھ دن تک پیش آنے والے واقعہ کے لئے اتنی شدت سے ہر شب کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خولی نے یہ خط عاشورہ محرم کے بعد لکھا ہے۔ اور ابن زیاد کا یہ جواب ۱۲-۱۵ محرم کو آیا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔

پھر خولی نے ان حالات کا جائزہ کب لیا۔ اور کتنی راتوں میں ابن سعد اور امام حسین کی باتوں کا مشاہدہ کیا کہ اسے اتنی شدید شکایت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اب ابن سعد کا درخواست ہو جانا ہی ضروری ہے؟

اس سوال کا تجزیہ کرنے کے لئے چند نکات کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ کربلا کے حالات دنیا کے دوسرے جنگی حالات کی طرح پُر سکون حالات سے قطعی مختلف تھے۔ اطمینانی حالات میں دو چار دس دن کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور جنگی حالات میں دو چار لمحے بھی فیصلہ کن ثابت ہو جایا کرتے ہیں۔ چہ جائیکہ ایک دو دن یا ایک دو راتیں۔

حالات کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ دوسری محرم کو امام حسین سرزمین کربلا پر وارد ہوئے۔ اور اسی دن حزنے ابن زیاد کو اطلاع دیدی۔ شب میں ابن سعد نے اپنے انجام کار کے بارے میں فیصلہ کر لیا۔ اور صبح ہوتے ہوتے کوفہ سے کربلا کے لئے روانہ ہو گیا۔

کربلا پہنچنے کے بعد بھی کسی مزید گفتگو کے بغیر خیموں کے بٹانے کا سوال اٹھا دیا گیا۔ اور فوجوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شمر کربلا آیا۔ اور کوفہ والیں بھی گیا۔ فوجی انتظامات کا جائزہ بھی لیا۔ اور دوبارہ والیں بھی آیا۔ اور دسویں محرم تک یہ سارا واقعہ تمام بھی ہو گیا۔

آٹھ دن کے اندر متعدد بار نامہ دپیام کا آنا جانا۔ نامہ بردی کی روڈ مصوب، لشکر دن کی مسلسل آمد، اس بات کا ثبوت ہے کہ جنگی حالات عام حالات سے قطعی مختلف تھے اور کام انتہائی تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ خولی خود بھی ابن سعد کا غلط نہیں تھا۔ وہ اپنے کھردری لشکر کا اہل سمجھنے کی بنا پر قطعی طور پر اس کا تریف تھا۔ صرف حالات کی مجبوری نے ایک لشکر کی سرداری پر قناعت کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

ورنہ اس کا قطعی خیال یہی تھا کہ میں پوری فوج کی کمان سنبھالنے کا اہل ہوں اور امیر وقت کی مرضی کی تکمیل کے لئے جس قدر میں سزا دار ہوں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ایسے حالات میں ایک رات کے بعد دوسری رات کا آجانا اور اس کا بھی گفتگو میں گزر جانا خولی کے لئے سال در سال سے کسی طرح کم نہ تھا۔

شوق ریاست ایک ایک لمحہ کو برسوں میں تبدیل کر دیتا ہے اور جذبہ حکومت ہر لحظہ کو نہ ٹلنے والا زمانہ بنایا کرتا ہے۔

یہ تصور انتہائی غلط ہے کہ یہ واقعہ متعدد دنوں میں پیش آیا۔ اس کے لئے تو ایک دردن کا گزر جانا بھی بہت ہے۔

جس کا ایک تاریخی ثبوت یہ بھی ہے کہ شمر کہ بلا میں در مرتبہ وارد ہوا — ایک مرتبہ کہ بلا آیا — اور پھر کوفہ واپس گیا اور ہر محرم کو دوبارہ دلا سرزمین کہ بلا ہو گیا۔

میاںسی بصیرت اور جنگی حالات پر گہری نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ خولی کی طرح شمر کے دل میں بھی جذبہ ریاست و حکومت کو ڈیس بدل رہا تھا۔ اس نے حالات کو نمایاں گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ ابن سعد کو بزخواست کرانے کے لئے خط و کتابت کافی نہیں ہے۔

یہ خولی نادان ہے کہ اتنے بڑے اقدام کے لئے خط و کتابت کرنا ہے — اس کے لئے بہترین طریقہ عاکم سے براہ راست ملاقات اور اسے حالات کی نزاکت کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

اور عجب نہیں کہ خولی کے پیغام کی اطلاع ہی شمر کے لئے محرک واقع ہوئی ہو اور اس نے یہ طے کیا ہو کہ اگر خولی کی شکایت کام کر گئی اور ابن زیاد اس کے ہنگامے میں آگیا۔ تو ریاست ابن سعد سے کل کر خولی کی طرف منتقل ہو جائے گا اور میں سردار لشکر ہی رہ جاؤں گا۔

چنانچہ اس نے حالات کا جائزہ لیتے ہی فوراً کوفہ کا رزح کیا اور ابن زیاد کو اس انداز سے حالات سمجھائے کہ خولی کے کلام کی تائید بھی ہو گئی اور وہ ابن زیاد جس نے خولی کے خواب میں صرف سختی کا ذکر کیا تھا۔ شمر کے خواب میں ابن سعد کو یہ پیغام بھی بھیج دیا کہ اگر ایسا برتاؤ نہیں کر سکتا تو ریاست لشکر سے الگ ہو جاؤ اور فوج کی کمان شمر کے حوالے کر دے۔

. . . . ایسے دولہ انگیز ماحول میں جہاں چاروں طرف ریاست و قیادت کیلئے درادش ہر رہی ہو۔

ہر بڑا "سردار لشکر" فوجی کمانڈر بننے کے خواب دیکھ رہا ہو۔ حالات کی تسیر و قیادی کا اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اور ہر سردار لشکر کے لئے عظیم اسکان ہے کہ عاکم وقت کی نگاہ میں محبوب بننے کے لئے حالات کو بدر سے بدر تر بنا دے اور جس قدر سختی ممکن ہو امام حسین اور ان کے اصحاب کے ساتھ درار کھے۔

اس کے بعد طبری کی یہ روایت قابل توجہ ہے

"فَبَقِعْتُ عُمَرُ بْنُ سَعْدٍ عُمَرَ بْنَ الْحَبَّاجِ عَلَى خُسَيْبَةَ قَارِسٍ فَتَزَلُّوا عَلَى الشَّرِيعَةِ وَحَالُوا ابْنَيْنِ الْحُسَيْنِ وَاصْطَحَابَهُ وَالْهَاءِ أَنْ يَسْتَقْوَامَهُ قَطْرَةً وَذَلِكَ قَبْلَ مَقْتَلِ الْحُسَيْنِ ثِيَلَاتٍ" — طبری مقتل ابو مخنف۔

”ابن سعد نے عمر بن خطاب کو پانچ سو سواروں کے ساتھ دریا پر بھیج دیا کہ امام حسینؑ، ان کے اصحاب اور پانی کے درمیان مائل ہو جائیں اور ان لوگوں کو ایک قطرہ پانی نہ پینے دیں۔“ یہ واقعہ شہادت سے تین دن پہلے کا ہے۔

حالات کی تیز رفتاری کے پیش نظر اگر ابن زیاد کا دوسرا خط پانچویں محرم کو بھی آیا ہے تو عمر بن الخطاب کے پہرے کی تاریخ بھی وہی ہے۔ اور طبری کا یہ ”اجتہاد“ کہ یہ واقعہ شہادت سے تین دن پہلے یعنی ساتویں یا آٹھویں محرم کا ہے — قطعاً اشتباہ ہے۔

طبری نے حالات کا اندازہ تو کیا ہے کہ تیسری محرم کو ابن سعد وارد ہوا — تین دن مسلسل امام حسینؑ سے گفتگو کرتا رہا — چوتھے دن خولی نے شکایت نامہ لکھا — پانچویں دن جواب آیا اور ابن سعد نے فرات پر پہرے بٹھا دیئے۔

حالات کا یہ اندازہ قطعاً بعید از قیاس ہے۔ جب حکومت کی مشینری اتنی تیزی سے کام کر رہی ہو کہ بقول مورخین — دوسری محرم کو امام حسینؑ کے وارد ہونے کے بعد تیسری محرم تک خط بھی آگیا ہو — اور کوفہ میں اجتماع بھی ہو گیا ہو۔ اور ابن سعد کو روانہ بھی کر دیا ہو۔

تو یہ بات کتنی عجیب ہے کہ حکومت حالات سے غافل ہو کر چار دن تک خولی کے شکایت نامہ کا انتظار کرے اور اس کے بعد کوئی دوسرا قدم اٹھائے۔

یہ بات عام حالات میں بھی درست نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ایسے شدید حالات میں جہاں ہر شخص پر جذبہ ریاست کے ساتھ معمول الخام کا بھوت سوار ہوا کسی آدمی کی نگرانی سمجھدگی اور ضمیر میں زندگی باقی نہ رہ گئی ہو۔

سقائی کی حقیقت

حالات کے تجزیہ نے صاف واضح کر دیا ہے کہ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کر دینے کا حکم ابتدائی طور پر حرہی کو دیا گیا ہے اور ابن سعد نے کہ بلا پہنچ کر اس مقصد کی تکمیل کر دی ہے۔

دو ایک روز کے بعد فرات پر باقاعدہ پہرے بٹھا دیئے گئے۔ اور یہ واقعہ کسی قیمت پر بھی سات محرم تک نہیں مل سکا۔

اس سے بالاتر مسئلہ یہ ہے کہ مکمل پہرے سے پہلے بھی خیام حسینی میں پانی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ابن زیاد کا ابتدائی فرمان موجود تھا۔ انتقام خون عثمان کے جذبات تازہ ہو چکے تھے۔ فرات سے غیصے ٹہلے جا چکے تھے۔ اور پانی کی کوئی بھی سبیل یا دریا کی طرف کوئی بھی قدم ایک جدید اختلاف کو دعوت دینا تھا۔ اور یہ نامکن تھا کہ خیام حسینی میں خونخیزی کے بغیر پانی کا کوئی قطرہ پہنچ جائے۔

فرق صرف یہ تھا کہ نہر پر پہرے کے بعد مقابلہ یا مضابطہ طور پر دریا کے نگہبانوں سے ہوتا اور اس کے پہلے پوری فوج سے مقابلہ یا گزیر تھا۔

فرات پر پہرہ کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب ابن سعد نے یہ غوسہ کر لیا کہ اب خیام حسینی میں پانی نہیں رہ گیا ہے۔ راتے کا پانی یقیناً ختم ہو چکا ہے۔ اور دریا سے پانی کا کوئی قطرہ گیا نہیں ہے۔ اب خیام حسینی میں پیاس کی شدت ہوگی اور اصحاب حسینؑ دریا کا رخ کرنے پر مجبور ہوں گے۔

بہتر ہے کہ کسی بھی ایسے اقدام سے پہلے دریا پر پہرہ بٹھادیے جائیں تاکہ اصحابِ اہلِ اس طرف آنے کا ارادہ نہ کریں۔ اس طرح جنگ کی نوبت بھی نہ آئے گی اور پیاس کی شدت بھی باقی رہ جائے گی۔

امام مظلوم کسی بھی قیمت پر جنگ کی ابتدا نہ کر سکتے تھے۔ آپ روزِ ازل سے ان تمام امکانات کی سہی فرما رہے تھے جن سے جنگ کا خطرہ نہ ٹل سکے۔ تو کم از کم رسول کے وارث پر پہل کرنے کا الزام بھی نہ آئے۔ اس لئے آپ کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ دریا کے علاوہ کسی اور جہت سے پانی کا انتظام فرمائیں۔

بعض تاریخ و مقاتل میں امام حسین کے باعجاز چشمہ جاری کرنے کا ذکر انھیں استبا میں شمار کیا جاسکتا ہے جن کے ذریعہ امام مظلوم دریا کے بغیر بچوں کے لئے پانی کا انتظام کرنا چاہتے تھے۔ اور دشمن کو باخبر کر دینا چاہتے تھے کہ دریا پر قبضہ ہماری بے کسی اور بے چارگی کی دلیل نہیں ہے۔ ہماری ٹھکانہ میں اتنی طاقت موجود ہے کہ ایک اشارہ پر چشمہ جاری ہو سکتا ہے۔

قوتِ اعجاز کا مظاہرہ امتحان کے مراحل پر اثر انداز نہیں ہو سکتا

امام وقت کی ذمہ داریاں دونوں باتوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ اس کی ایک ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ منزلِ ابتلاء و امتحان میں آخری وقت تک صبر کرتا رہے۔

اور دوسری ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ درمیان میں ایسے حالات بھی پیش کرنا رہے جس سے امامتِ شریعہ نہ ہو اور دشمن کو سبکی کا الزام لگانے کا موقع نہ ملے۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ شمعون یہودی کے دروازے پر قرض لینے والے علیؑ ہی نے مٹی کی دیوار کو سونے کی بنا دیا تھا۔ اور علیؑ کا یہ کردار آواز دے رہا تھا کہ منزلِ اتحالی بشریت میں قرض لینا لازم ہے۔

لیکن منزلِ انہارِ کمالِ امامت میں دیوار کو سونے میں تبدیل کر دینا بھی ضروری ہے۔

امام حسینؑ کو بلا میں انھیں دونوں منزلوں سے گزر رہے تھے۔ آپ ایک طرف اپنی قوتِ اعجاز کا مظاہرہ کر رہے تھے اور دوسری طرف عبیدیت کا امتحان گاہ میں صبر و ثبات کا اظہار فرما رہے تھے۔

ابتدائی منزلوں میں چشمہ کے جاری کرنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ امام حسینؑ اپنے اصحاب کے ساتھ اپنے دشمنوں کو بھی باخبر کر دینا چاہتے تھے کہ کم از کم امام وقت، وارثِ رسولؐ اور جانشینِ حیدرؑ ہیں۔ ہماری انگلیوں پر زور و شوقِ افریقہ اور ہمارے اشاروں میں قوتِ روشنی ہے۔

ہم منزلِ امتحان میں ان طاقتوں کا اظہار نہیں کرتے۔ یہ چشمہ آج ضرور جاری ہو گیا ہے، لیکن آج کے بعد یہ نظر نہیں آئے گا۔

چشمہ کا برآمد ہونا پانی کے پینے، پلانے یا امتحان کو ٹالنے کے لئے ہوتا تو یہ عاشورِ ملکہ عاشور کے بعد تک رہ جاتا۔ جس طرح چشمہ (منزلِ آج تک باقی ہے۔

لیکن یہ اقدام صرف امامت کی قوتِ اعجاز کے مظاہرہ کے لئے کیا تھا۔ اسکے بعد اس کا نام و نشان تک نظر نہیں آئے گا۔

چشمہ جاری ہونے کی تاریخ کیا ہے۔ اس کی نشاندہی تاریخ کے بیانات سے مشکل ہے۔ اور مسئلہ تاریخی استنتاج سے متعلق ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق "بندشِ آب" سے نہیں ہے۔ یہ شدتِ عطش کا نتیجہ ہے۔ اور شدتِ عطش کا کوئی ربط "بندشِ آب" سے نہیں ہے۔

نازک سے نازک ترین حالات میں اتنی کوششوں کا جاری رکھنا حضرت عباسؓ جیسے وفادار کے علاوہ کس کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ صرف ساتی کوثر کے لال کا کلیجہ تھا کہ اپنے آخری اسکان تک بچوں کی تشنگی کو رفع کرنے کا خیال اپنے سینے سے لگائے رہے اور ایک لمحہ کے لئے اس ذمہ داری سے غافل نہ ہو سکے۔

”چون شب نهم محرم بپایان رسید و سفید صبح برآمد و در معرکه حسین آب تنگیاب بود، اہل بیت و اصحاب سخت تشنگان شدند و شکایت بکفرت حسین آوردند۔ ابو عبد اللہؑ برادر خود عباس را طلب

کرد۔ فرمود با چند تن اصحاب چاہے حضر کنید کہ بے بر آوردید۔
دریں کرت برقتند و چند گہ کاوش کردند آب نیا نقتند۔
ناسخ التواریخ ۶ ص ۲۲۵

مقتل ابو مخنف میں یہ واقعہ ان الفاظ میں درج ہوا ہے۔

”وَأَشَدَّ الْعَطَشُ بِالْحُسَيْنِ وَأَصْحَابِهِ وَأَوْلَادِهِ
فَشَكُّوا أَذْلَكَ إِلَى الْحُسَيْنِ فَدَعَى بِأَخِيهِ الْعَبَّاسِ
وَقَالَ يَا أَخِي اجْمَعْ أَهْلَ بَيْتِكَ وَأَخِيكَ وَأَخِيكَ دَاخِلًا
فَفَعَلُوا ذَلِكَ فَلَمْ يَجِدُوا فِيهَا مَاءً أَفْطَمُواَهَا۔“

مقتل ابو مخنف ص ۲۷

”جب امام حسینؑ اور ان کے اصحاب و اولاد پر پیاس کا غلبہ
ہوا اور ان لوگوں نے امام حسینؑ سے شکایت کی تو آپ نے اپنے بھائی
عباس کو بلا کر فرمایا کہ اپنے گھروالوں کو ساتھ لیکر کنواں کھودو۔ ان
لوگوں نے کنواں کھودا لیکن پانی نہ ملا تو بند کر دیا۔“

ناسخ اور ابو مخنف کی عبارتوں کا واضح فرق یہ ہے کہ ناخن نے اصحاب اور اہل بیت
دروازوں کا ذکر کیا ہے اور ابو مخنف کی عبارت میں صرف اہل بیت کا ذکر ہے۔ اس کے
علاوہ کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے۔

جزئی فرق یہ ہے کہ ابو مخنف نے کنوئیں کا انجام بھی درج کیا ہے اور ناخن نے اسے
نظر انداز کر دیا ہے۔

بعض کتابوں میں ایک سے زیادہ کنوئیں کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ
حضرت نے چار کنوئیں کھودے لیکن کسی ایک سے بھی پانی فراہم نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ
جب کبھی کوئی کنواں تیار ہوتا تھا تو لشکر ابن سعد اسے آکر بند کر دیا کرتے تھے۔

یہ بات شدت مصائب کی تصویر کشی کے لئے تو بہت اہم ہے۔ لیکن حالات
کے پیش نظر کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے۔
اور لاکسی ایسی جگہ پر کنواں کھودنا جہاں تک فوج دشمن کی رسائی کا امکان
ہو خلاف مصلحت ہے۔

ثانیاً ایک مرتبہ ایسی سعی کے ناکام ہو جانے کے بعد دربارہ پھر کسی فطرہ کی
جگہ پر رحمت کرنا قرین قیاس نہیں ہے۔
ثالثاً سمرائے بے آب و گیاہ میں چار چار کنوئیں کھودنا کوئی آسان کام نہیں ہے جو
چند ساعتوں میں انجام پاسکے۔

دوسری عبارت بھی ناخن ہی کی ہے جس میں ابن زیاد کا وہ خط درج کیا گیا
ہے جو اس نے ابن سعد کے نام لکھا ہے :-

”أَمَّا بَعْدُ بَلَّغْنِي أَنَّ الْحُسَيْنَ يَحْضِرُ الْآبَارَ وَيَصِيبُ فَيَشْرِبُ
هُوَ وَأَصْحَابُهُ فَإِنَّا نَنْظُرُ إِذَا دَرَدَ عَلَيْكَ كِتَابِي فَأَمْنَعُهُمْ مِنْ حَضْرَةِ الْآبَارِ
مَا اسْتَطَعْتُ وَصَيِّقٌ عَلَيْهِمْ وَلَا تَدْعُهُمْ يَدُّ دِقْوِ الْمَاءِ وَأَفْعَلُ
بِهِمْ كَمَا أَفْعَلُوا بِالذِّكْرِ عِثْمَانَ۔“

ناسخ ص ۲۳

”مجھے یہ خبر ملی ہے کہ حسینؑ برابر کنوئیں کھود رہے ہیں اور اپنے
اصحاب سمیت پانی پی رہے ہیں۔ لہذا میرا خط پاتے ہی انھیں کنوئیں
کھودنے سے روک دے اور ان پر سختی کر۔۔۔۔۔ انھیں اتنا
موقع نہ ملے کہ پانی کا مزہ چکھ سکیں۔ ان کے ساتھ وہ بتاؤ کہ جو
عثمان کے ساتھ کیا گیا تھا۔“

ابن زیاد کے اس خط سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں :-

۱۔ اس فرمان کا تعلق غیبی چشمہ سے نہیں ہے بلکہ کنواں کھودنے سے ہے۔
... بعض ارباب کتب نے پانی پینے کا ذکر دیکھ کر اسے غیبی چشمہ پر منطبق کر دیا ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی تعلق اس چشمہ سے نہیں ہے اور نہ اس سے منع کرنے کا کوئی امکان ہے۔

۲۔ اس خط میں کنویں کھودنے کے ساتھ پانی پینے کا بھی ذکر ہے جس سے مان ظاہر ہوتا ہے کہ کنویں ایسے حالات میں کھودے گئے ہیں جہاں پانی بھی فراہم ہوا ہے۔

۳۔ اس خط کا تعلق کسی ایک کنویں سے نہیں ہے بلکہ ابن زیاد کی خبریں متعدد کنوؤں کے بارے میں اطلاع دی گئی ہے۔

۴۔ فوج دشمن کے کنوؤں کو بند کر دینے کی روایت قطعاً قرین قیاس نہیں ہے ایسا ہوتا تو ابن زیاد کے خط کا موضوع ہی نہ پیدا ہوتا۔

ناسخ جیسے مورخین نے ان تمام زحمات کو آٹھویں اور نویں محرم سے متعلق کیا ہے اور ان کا بیان ہے کہ یہ کنویں آٹھویں محرم کو کھودے گئے ہیں یا نویں محرم کو۔ لیکن حالات کی روش بتا رہی ہے کہ یہ اندازے واقعہ کے مطابقت نہیں ہیں۔

ابو مخنف کی روایت یہ ضرور اشارہ کر رہی ہے کہ یہ واقعہ شدت عطش کے بعد پیش آیا ہے لیکن سابق میں واضح کیا جا چکا ہے کہ شدت عطش بندش آب کے علاوہ ایک شے ہے۔

”بندش آب“ کا ایک وقت معین ہے لیکن شدت عطش کا سلسلہ درود و کربلا کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔

ابن زیاد کے خط میں پانی پینے کا ذکر بھی واضح کر رہا ہے کہ یہ واقعہ ابتدائی تدبیر و سے متعلق ہے جہاں چشمہ بھی برآمد ہوا ہے اور کنویں بھی کھودے گئے ہیں۔ اس کے بعد جب فوج دشمن نے اس پر بھی پابندی عائد کر دی تو یہ سلسلہ بھی روک دیا گیا ہے اور مزید کوئی تدبیر نہیں کی گئی۔

ان قرآن کے بعد خطیب اعظم مولانا سید غلام عسکری کا یہ دعویٰ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ پانی ملنے کی جملہ روایات کا تعلق ساتویں محرم کے قبل سے ہے ساتویں محرم کے بعد پانی کا کوئی قطرہ کسی راہ سے دستیاب نہیں ہو سکا۔

دوسری لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام حسینؑ نے ”ظاہری امکانات“ کی بنا پر کوئی تدبیر نظر انداز نہیں کی اور جیسے جیسے ان تدابیر پر پابندی عائد ہوتی گئی۔ آپ ان طریقوں کو ترک فرماتے گئے اور آخر کار خیمہ حسینی میں ”شدت عطش“ کے سوا کچھ نہ رہ گیا۔

فلسفہ کے خاتمہ سے پہلے ابن زیاد کی اس بدحواسی کی طرف متوجہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ وہ جب بھی پانی کے سلسلے میں کوئی حکم بھیجتا تھا تو اس میں عثمان کے حالات کا حوالہ ضرور دیتا تھا۔

اس کے ذہن میں اب بھی یہ بات کھٹک رہی تھی کہ امام حسینؑ کی مطلوبیت کو دیکھ کر فوج میں بغاوت پیدا ہو سکتی ہے اور یہ حالات ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے فوجوں کو ”قصہ یارینہ“ سنایا جاتا رہے اور ان کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی جائے کہ قتل عثمان کی ذمہ داری امام حسینؑ اور ان کے بزرگوں پر ہے۔

ہمارا مقصد ان سے انکس واقعات کا انتقام لینا ہے۔ اب جسے جسے خون عثمان

سے دلچسپی ہو وہ امام حسینؑ پر سختی کو رد کر کے۔
 دشمن کے ذہن میں یہ کھٹک اس کے احساس شکست کا نتیجہ ہے اور دشمن کا
 احساس شکست حزب مقابل کے فاتح ہونے کی عظیم ترین دلیل ہے۔
 سقائی کا دوسرا وسیلہ نہر ہے پانی لانا ہے۔ جس کا ذکر مورخین نے ان الفاظ
 میں کیا ہے:-

”ولما اشتد بالحسين واصحابه العطش امر
 اخاه العباس بن علي كانت امه من بني عامر بن صعصعه
 ان يمضي في ثلاثين فارسا وعشرين راجلا مع كل
 رجل قربة حتى ياتوا بالماء وحاربوا من حال
 بينهم وبينه فمضى العباس نحو الماء واما مهمهم هلال
 بن نافع حتى دلوا من الشريعة فمعههم عمرو بن
 الحجاج فجاء لهم العباس على الشريعة بهم معه
 حتى ازالوا هم عنها واقامهم رجالا الحسين الماء
 فملئوا قربةهم ووقف العباس في اصحابه يذبون عنهم حتى
 اوصلوا الماء الى عسكر الحسين —
 الاخبار الطوال ۲۵۲

”جب امام حسینؑ اور ان کے اصحاب پر پیاس کی شدت ہوئی تو
 آپ نے اپنے بھائی حضرت عباسؑ کو جن کی والدہ بنی عامر سے تھیں
 حکم دیا کہ تیس سوار اور بیس پیادے لے کر بچاس مشکوں کے بھرا
 نہر تک جائیں اور یہود اردوں سے جنگ کر کے پانی لے آئیں غناب
 عباسؑ پانی کی طرف چلے آگے آگے ہلال بن نافع تھے۔ دریا کے تیز

پہنچ تو وہ بنی عامر کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے بچاؤ کیا۔
 کو بٹا دیا۔

اصحاب امام حسینؑ کے پیادے پانی میں داخل ہو گئے اور مشکیں بھر لیں
 حضرت عباسؑ دشمنوں کے دفاع میں مصروف رہے
 یہاں تک کہ پانی لشکر حسینؑ تک پہنچ گیا۔“

اس روایت کو دیوڑی کے علاوہ طبری اور ابن اثیر نے بھی درج کیا ہے لیکن
 اس میں چند باتیں قابل توجہ ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس میں بھی واقعہ کا اصل موضوع شدت عطش ہے۔ ”بندیش
 آب“ نہیں ہے۔ جس کے بعد مورخین کے اس خیال کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی کہ واقعہ
 کا صحیح وقت کیا ہے اور واقعہ کس تاریخ کو پیش آیا ہے۔

صاحب ”ذکر العباس“ نے اس واقعہ کو شب ہشتم میں درج کیا ہے اور قرینہ
 کے طور پر علامہ ہر دی کی عبارت بھی نقل فرمائی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ان خیالات کا کوئی تاریخی
 ثبوت نہیں ہے۔

اباب مفضل نے بھی شدت عطش کا حساب کر کے شب ہشتم کی تعیین کی ہے جس
 کے بعد پانی کے وجود کا احتمال سہ روزہ تشنگی کے منافی ہے اور سہ روزہ تشنگی تاریخی و
 روایات کے مسلمات میں ہے۔

شدت عطش کا سلسلہ تیسری محرم کے بعد سے شروع ہو گیا تھا اور چوتھی محرم
 آتے آتے رنگستانی علاقہ میں عطش کی شدت ناقابل اندازہ تھی۔

اس کے علاوہ اس روایت میں بچاس مشکوں کا ذکر ہے جس میں ۳ سواروں کے
 پاس تھیں اور بیس پیادوں کے پاس۔ اور اصحاب کتب صرف ۲۰ مشک پانی کا ذکر کرتے

کرتے ہیں۔

شاید ان حضرات کی نظر میں ”مع کل رجل قریتہ“ سے مراد صرف پیادے ہیں جو کسی حد تک قرین قیاس بھی ہے در نہ ظاہر روایت کی بناء پر تو ۵۰ مشکلیں ہونی چاہئیں تھیں۔ جن میں سے ۲۰ کے بھرنے کی نوبت آئی تھی اور ۳۰ افراد دریا تک پہنچ ہی نہ سکے تھے۔ یہ صرف لشکر کے دفاع میں مصروف رہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس روایت کی صحت کی بنا پر حضرت عباسؓ کے سقاء کچے جانے کی وجہ کیا ہے؟

یہ کام تنہا حضرت عباسؓ نے انجام نہیں دیا آپ کے ساتھ پچاس آدمی اور شریک تھے اور ان پچاس میں بھی آپ نے خود کوئی زحمت نہیں فرمائی۔ بلکہ آپ صرف مصروف دفاع رہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ پانی بھرنے کا کام دوسرے اصحاب انجام دیں اور سقاء کا لقب آپ کو دیدیا جائے۔

اکثر ارباب کتب نے آپ کو اس واقعہ کی بناء پر سقاء تسلیم کیا ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ آپ نے پانی خیماء حسینی تک پہنچا دیا اس لئے آپ کو سقاء کہا جاتا ہے یہ بات انتہائی حیرت انگیز ہے جبکہ روایت میں اس پانی کے انجام کا ذکر بھی نہیں ہے صرف بعد کے مؤلفین نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت نے خود پانی نوش فرمایا اور اصحاب کو بھی پلایا۔ لیکن اس کا کیا اعتبار ہے۔

بعض محققین نے روایت کے سلسلے میں رجال روایت سے بھی بحث کی ہے اور انتہائی کادش کے ساتھ روایت کو ضعیف اور جعل قرار دیا ہے لیکن میری نگاہ میں ان تمام زحمات کی ضرورت نہیں ہے۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے نہ واقعہ کا شبہ شتم میں ہونا ثابت ہے

اور نہ اس واقعہ کی بناء پر سقاء کا لقب قرین قیاس ہے۔

سقاء کا لقب ان زحمات کا نتیجہ ہے جو آپ نے مختلف اوقات میں برداشت فرمائیں اور جن کے نتیجے میں بے حد مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑے۔ علامہ مقرر کا یہ ارشاد بڑی حد تک قرین قیاس ہے کہ آپ کو مسلسل زحمات کے نتیجے میں سقاء کے لقب سے یاد کیا گیا ہے در نہ ان زحمات کا کامیاب ہونا کسی جہت سے بھی ثابت نہیں ہے۔

اس مقام پر یہ مسئلہ باقی رہ جاتا ہے کہ ابتدائی بندش آب کے بعد سے تحصیل آب کے تین وسائل میں دریا کو سب سے آخر میں کیوں رکھا گیا ہے کہ سب سے پہلے چشمہ جاری کیا گیا۔ اس کے بعد کنوئیں کھودے گئے اور اس کے بعد دریا کی طرف رخ کیا گیا۔

لیکن اس کا واضح ساعل یہ ہے کہ فوج دشمن نے دریا سے خیماء بٹانے کے بعد یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ امام حسین بے دست دیا نہ ہو گئے ہوتے تو کبھی دریا نہ چھوڑتے۔ اور اب اصحاب حسین کے پیاس سے ہلاک ہو جانے میں کوئی گھر باقی نہیں ہے۔

امام مظلوم نے تمام محبت کے لئے پہلے چشمہ جاری فرمایا اور دشمن پر یہ واضح کر دیا کہ ہم سبکیں دے جس نہیں ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ اپنی ذات کے لئے تلوار نہیں اٹھاتے ہمیں پیاسا رہنا گوارا ہے لیکن پانی کے لئے جنگ کا آغاز کرنا گوارا نہیں ہے۔

اس کے بعد آپ نے سلسلہ اعجاز کو روک کر عالم اسباب کے قوانین کی طرف توجہ فرمائی اور کنوئیں کے ذریعہ پانی فراہم کرنے کی سبیل کی۔

اس کے خلاف فوج دشمن نے دوسرا قدم اٹھایا اور حسب امکان اس کو شش

پر بھی پہرے بٹھادیئے۔

امام مظلوم نے اس مرحلہ پر بھی کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے تلوار نہیں اٹھائی ہے۔

لیکن ایک مرحلہ آگیا جب نہر پر پورہ داروں کے مقرر ہونے کے بعد عمرو بن الحجاج نے یہ طعنہ دینا شروع کر دیا کہ :-

”یا حسین ہذا الماء قلع فیہ الکلاب وتثوب
منہ خنازیر اهل السواد والحمر والذئاب ولا تذوق
والله منه قطرة حتی تذوق الحمیم فی نار جحیم“
ماخ ۶ ۲۳۷

”اے حسین! یہ پانی ہے۔ اس سے جانور ان صحرائی سیراب ہو رہے ہیں۔ لیکن تمہیں ایک قطرہ بھی نہیں ملے گا یہاں تک کہ (معاذ اللہ) جہنم کے مارحمیم کا مزہ چکھو۔

سردار جو انانہ جنت کی شان میں یہ گستاخی صرف ایک نبے ادبی نہیں ہے بلکہ اپنے کفر کا کھلا ہوا اعلان ہے جس کے بعد اصحاب امام کو یوں بھی حملہ کرنے کا جواز پیدا ہو گیا تھا اور اسے کسی تائون میں بھی جنگ کی ابتدا نہیں کہا جاسکتا تھا۔۔۔ لیکن اصحاب نے کمال صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے مرضی امام کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

امام حسین نے کمال ضبط کے باوجود یہ ضروری سمجھا کہ دشمن کو اس کے پہرے کی حقیقت سے باخبر کر دیا جائے اور یہ بتا دیا جائے کہ ہم بے کس و بے بس نہیں ہیں۔

ہماری نظر میں اس پہرے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہمارا سکوت صرف اس لئے تھا کہ ہم جنگ کی ابتدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب ہماری طاقت و قوت کو آواز دی گئی ہے تو ہمارا سردار لشکر جا رہا ہے۔ اب جسے روکنا ہو روکے۔ دیکھو! یہ پانی لاتا ہے یا نہیں۔

حیدر گڑا کا شیر بڑھا۔ دریا پر قبضہ کیا۔ اور پانی لے کر چلا آیا
کتنا حسین موقع تھا کہ دریا تک پہنچ جانے کے بعد وہیں قبضہ جما دیا ہوتا اور جو بھی جنگ ہوتی وہ دریا کنارے ہی ہوتی۔ اس کے بعد شہادت تو بہر حال مقدر تھی۔

لیکن حضرت عباسؓ کے کردار کی بلندی آواز دی رہی تھی کہ مقصد نہر پر قبضہ کرنا یا دریا کی ترائی میں جنگ کرنا نہیں ہے۔ مقصد اس گستاخی اور غرور کا جواب دینا ہے جس میں عمرو بن الحجاج مبتلا ہو گیا ہے۔

اور جب یہ جواب ہو گیا تو اب پانی کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ پانی پئیں گے تو اسی وقت پئیں گے جب دشمن اپنی بندشوں کو ہٹا کر عام حالات میں پانی کی اجازت دے گا۔ اس کے علاوہ دوسرے حالات میں صرف صبر و ضبط کا مظاہرہ کریں گے اور مظلومیت کے ساتھ دنیا سے گزر جائیں گے۔

ہم صبر و ضبط سے کام نہ لیں۔ اور ہمیشہ اپنی قوت و ہمت کا مظاہرہ کریں گے تو ہماری تاریخ میں مظلومیت کا نام کب آئے گا۔
کس میں ہمت ہے جو اظہار قوت کے مواقع پر ہم ظلم کر سکے یا ہمیں کسی تعدی کا شکار بنا سکے۔

ہماری مظلومیت ہمارے صبر ہی کا نتیجہ ہے مگر نہ ہوتا تو ہماری مظلومیت کا امکان ہی نہ پیدا ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی حضرت عباسؓ نے قوت و ہمت کا مظاہرہ کرنا چاہا تو فوجیں راستہ روکنے سے قاصر رہیں۔

ابھی تو صرف عمر و بن الحجاج کے رسالہ کا پہرہ ہے اور غازی کے ہاتھ میں تلوار بھی ہے۔ اور پشت پر بجاس افراد کا لشکر بھی ہے۔

اس جرأت و استقلال کا اس وقت اندازہ ہو گا جب مجاہد تنہا ہو گا۔
اور مشک و عِلْم کی ذمہ داری ہوگی۔ جنگ کی اجازت
بھی نہ ہوگی۔ تلوار کی جگہ نیزہ نے لے لی ہوگی۔ اور جنگ کی جگہ متانی
کو مل گئی ہوگی۔

ظاہر ہے کہ ایسے نازک حالات میں چار ہزار کا لشکر کچھ نہ بگاڑ سکا اور
حضرت عباسؓ فرات تک پہنچ گئے تو اتنے بڑے لشکر کے ساتھ کس کی حوال
تھی کہ راستہ روک لیتا۔

یہ صرف مقصد کا تحفظ تھا کہ عباسؓ نے دریا سے سردکار نہیں رکھا اور
اپنی ہمت و وفاداری کا پرچم نصب کر کے واپس چلے آئے۔

سقائی کی اہمیت

کھلی ہوئی بات ہے کہ دنیا کے ہر واقعہ کی اہمیت اس کے حالات، ماحول اور
گرد و پیش کے کیفیات سے معین کی جاتی ہے۔ سقائی بظاہر کوئی اہم کام نہیں ہے
پانی پلانا ایک ثواب کا کام ہے اس سے کسی کردار کی تعمیر نہیں ہوتی۔

لیکن اگر یہ سقائی حالات کی نزاکت کا شکار ہو جائے۔ اور دشوار
ترین ماحول میں یہ ذمہ داری سنبھال لی جائے تو اس کا نام پانی پلانا یا سیراب کرنا نہیں
ہو گا بلکہ اسے صحیح معنوں میں زندگی دینے سے تعبیر کیا جائے گا۔

گزشتہ صفحات میں سقایت کی عظمت پر زرد شنی ڈالی جا چکی ہے۔ یہاں صرف یہ
واضح کرنا ہے کہ کربلا کے ماحول میں سقائی کا کام کتنا اہم تھا اور حضرت عباسؓ نے اس
ذمہ داری کو سنبھالنے کے بعد کس قدر مشکلات کا سامنا کیا ہے۔

حالات کا یہ عالم تھا کہ گرمی کا زمانہ۔ بے آب و گیاہ صحرا۔
عرب کا رنگیزا۔ دھوپ کی مدت اور آفتاب کی تمازت کی شدت تھی۔
دریا کا کنادہ جھوٹ چکا تھا۔ پانی کی لہریں پیاس کی شدت میں اٹھانہ
کر رہی تھیں۔ ”بندش آب“ کا احساس عطش کی شدت کو بڑھا رہا تھا۔
خیام کے گرد و پیش آگ جل رہی تھی۔ آگ کے شعلے ماحول کو جھلسائے
دے رہے تھے۔ چہروں کی تازگی کا کیا ذکر دل سر جھائے جا رہے تھے
دخاڑوں کے جھلسنے کا کیا تذکرہ جگر بھی خشک ہو گئے تھے۔

ایسے عالم میں ایک سپاہی تھا جو اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ اس کیلئے
ہر مصیبت قابل برداشت تھی اور ہر دشواری لائق تحمل۔ شرط یہ تھی کہ امام اور ان کے
بچوں کو پانی مل جائے۔

سقائی کے اس جذبہ کی اہمیت کا اندازہ سقادی کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔
اور سقادی کی نگاہ میں سقایت کی اتنی ہی اہمیت ہے کہ جب مشک
کا پانی بہہ جاتا ہے تو خیام کی طرف بڑھنے کے بجائے لایا کا رخ کر لیتا ہے اور پلٹ
کر پھر اسی ترائی میں آ جاتا ہے جس سے فوجوں کو ہٹا کر پانی حاصل کیا تھا۔
فوجوں کو موقع مل جاتا ہے۔ اور چاروں طرف سے محاصرہ ہو جاتا ہے۔ جسم

زنجی ہوتا ہے۔۔۔۔۔ شانے قلم ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ مرشکافہ ہوتا ہے لیکن تھائی
کی اہمیت اپنے مقام پر محفوظ ہے۔۔۔۔۔ اس میں ذرہ برابر کمی نہیں
واقع ہوتی۔

اور آخر میں دلی جذبات الفاظ کے سانچہ میں ڈھل جاتے ہیں۔۔۔۔۔
”مولامیری لاش خیمے میں نہ لے جائے گا۔۔۔۔۔ مجھے سکینہ سے شرم آتا
ہے۔“

مجھے اپنا خون گوارا ہے لیکن دغا کا خون گوارا نہیں ہے۔۔۔۔۔ اپنی
تنہائی گوارہ ہے۔ لیکن بھتیجی کی بایوسی سے گوارہ نہیں ہے۔

ایک قابل لحاظ بحث

علامہ گفتوری طاب ثراہ نے اس مقام پر ایک نہایت ہی دلچسپ بحث یہ کی ہے
کہ امام حسیثی نے اصحاب و انصار کے ہوتے ہوئے اپنے گھر والوں کو کنوئی کھودنے پر
کیوں مامور کیا۔؟

اور اس کے بعد اس کے معتقد اسباب بیان فرمائے ہیں۔ یہ اسباب اپنے
مقام پر مقبول ادب و ادراش ہیں۔

لیکن ایک وجہ انتہائی عجیب و غریب بھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس طرح محمدؐ
عصمت کو کبھی ”جاہ کنی“ میں شرکت کا موقع مل جائے گا اور وہ بھی اس ثواب سے
محروم نہ رہیں گے۔

ظاہر ہے کہ یہ بات ایک نکتہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ شرف و کرامت اور
اجر و ثواب اپنی جگہ پر ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر شرف میں خواتین و مخدرات کو بھی
شریک کر لیا جائے۔ ایسا ہوتا تو خندق کھودنے میں بھی ان کی شرکت ہوتی۔۔۔۔۔
مقدمات جنگ کی تربیت میں بھی انھیں شریک کیا جاتا۔۔۔۔۔ اور ثواب
کی منزل میں انھیں نظر انداز نہ کیا جاتا۔ جب کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور انھیں اکثر
مراحل پر الگ رکھا گیا ہے۔

علامہ موصوف کا یہ استنباط غالباً لفظ ”اہل بیت“ کی پیداوار ہے جسے امام حسیثی
نے ”حضر ر“ کے حکم کے ساتھ استعمال فرمایا ہے۔

حالانکہ اس کا استعمال ان مجاہدوں کے لئے ہوا ہے جو خاندانہ ہاشمی سے تعلق
رکھتے تھے۔ اور اس عظیم خدمت میں حصہ لے سکتے تھے۔

اس کے علاوہ دوسرے حکم میں خود اصحاب و انصار کا ذکر بھی موجود ہے۔۔۔۔۔
جس کے بعد اس بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

اہل بیت کی شرافت و عظمت اپنے مقام پر ہے اس سے کسی ذی ہوش کو
انکار نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ لیکن اصحاب کی شرافت بھی کچھ کم اہمیت
نہیں رکھتی۔

یہ خاندانہ ہاشمی کی جلالت اور قسربنی ہاشم کی عظمت ہی تھی جس نے اس خدمت
کی سربراہی حضرت عباسؓ کے حوالے کر دی تھی۔

سقائی کی تاریخ

سابقہ بیانات کی روشنی میں یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عباس کی سقائی کا تعلق عشرہ محرم کی کن تاریخوں سے ہے۔ اور آپ کے خدمات سقایت کب انجام پائے!

عام طور سے ان خدمات کی تاریخ کے بارے میں آٹھ، نو محرم کا نام لیا جاتا ہے۔ اور ترتیب کے اعتبار سے پہلے دریا سے پانی لانے کا ذکر کیا جاتا ہے اس کے بعد کنوئیں کھودنے کا ذکر آتا ہے۔ اور یہ سلسلہ نوین محرم تک پہنچ جاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرات پر مکئی پہرہ کے بعد شب ہشتم پانی لائے۔ اور روز ہشتم جب وہ پانی ختم ہو گیا تو پہلا کنوئیں کھودا۔ اس کے بعد آخری کنواں روز نہم کھودا گیا۔

لیکن یہ سب باتیں بڑی حد تک بعید از قیاس ہیں۔ عرب کے ریگ زار میں کنواں کھودنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ کہ ہر لمحہ ایک نیا کنواں تیار کر دیا جائے۔

نوین محرم کے حالات۔ دشمن کی شدید نگرانی اور اس میں کنوئیں کھودنے کا ذکر بالکل عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

قرین قیاس یہی ہے کہ یہ سب معاملات ابتدائی بندش آب سے متعلق ہیں

جن میں امام حسین نے جنگ کی ابتداء کرنے کے خیال سے کوئی اقدام نہیں کیا۔ اور جب بسہولت پانی کا امکان ذرہ گیا تو کنوئیں کھودنے کا حکم دیا۔

دشمن نے اس سلسلے پر بھی پابندی عاید کر دی اور اس کی شدید نگرانی ہونے لگی۔ تو آپ نے کنوئیں کھودنے کا کام بھی رکھ دیا۔

اب دشمن نے طعنہ زنی شروع کر دی کہ اب پانی ملنے کا راستہ کیا ہو گا۔ تو آپ نے بچوں کی تشنگی اور اپنے اقتدار کی اظہار کے لئے حضرت عباس کو بھیج دیا جو بطور حجت دریا سے پانی لے آئے۔ وہ دریا سے پانی لانا ہی ہوتا تو عاشورہ کی جنگ دوسری محرم کو ہی ہو جاتی۔

دشمن کو اپنی کمزوری کا احساس ہو گیا اور اسے معلوم ہو گیا کہ ایک پہرہ فرات کا پانی نہیں روک سکتا۔ اس نے فوراً پہرہ دار فوج کی تعداد میں اضافہ کر دیا اور اب ساتویں محرم سے مکئی "بندش آب" ہو گئی۔ اس بندش آب کا تعلق صرف فرات کے پانی سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بعد پانی کے حملہ ظاہری امکانات ختم ہو چکے ہیں نہ دریا سے پانی آ سکتا ہے۔

۳۶۰ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں

اس سلسلے کے تاریخی معادروں موجود تھے اور جمع بھی کر لئے گئے تھے۔ لیکن خطیب اعظم طالب شاہ کی کتاب "پیاس" کے دیکھنے کے بعد تفصیلات کی کوئی فرد محسوس نہیں ہوئی۔ ناظرین کرام مفصل بحث میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں اس مقام پر صرف ان مزید وجوہ و دلائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کی تفصیل اس کتاب میں نہ تھی۔

نہ کنویں کھودے جاسکتے ہیں۔ اور نہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔
اب خیام حسینی ہیں اور شدتِ عطش۔ اطفالِ حسین ہیں اور
مدائے العطش۔

زاں تشنگاں ہنوز بہ عیوق می رسد
آوازِ العطش زبیا بان کر بلا

فیصلہ کن لمحہ

شمر کو ذرے دوبارہ آچکا ہے۔ ابنِ سعد کو مغزولی کا مشرط پینا
مل چکا ہے۔ اور وہ زندگی کے ایک دور اسے پرکھ رہا ہے۔ قتلِ حسین
میں تاخیر کرتا ہے تو قیادتِ لشکر اسے جاتی ہے۔ اور شمر ایک سوالیہ
نشان بنا ہوا ہے۔

قتلِ حسین کا اقدام کرتا ہے تو دین، مذہب، سبقت، شفاعت ساری
باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ابنِ سعد ایک لمحہ تک فکر میں ڈوبا ہوا اور اب
جو سراٹھایا تو اس کبر و نخوت کے ساتھ قتلِ حسین جتنی ہرچکا تھا۔ اور سر پر غرور
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جھک چکا تھا۔

منیر کی موت کا یہ عالم تھا کہ امام حسین برابر سمجھا رہے تھے کہ مجھے دے
کا گہیوں نصیب نہ ہو گا۔ اور وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا کہ اپنے لئے جو ہی کافی
ہے۔ (جلاء العیون ص ۱۹۸)

ابنِ سعد کی اس آمادگی نے شمر کی اسیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اور

اس کی حسرتوں پر اداس پڑ گئی۔

اس کا تمام تر خیال یہی تھا کہ ابن سعد میری طرح سنگدل اور سخت گیر نہیں ہے اس کا طرز عمل صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ وہ صلح کی باتیں کرتا ہے گا اور جنگ کے ہر امکان کو ٹالنے کی کوشش کرے گا۔

اسی امید میں اس نے کوفہ تک دوڑ لگائی۔ اور ابن زیاد کو سمجھا بھیجا کہ فرمان بھی لکھو لیا۔ لیکن خدا برا کرے ”بد بختی“ کا۔ کہ وہ کسی کی میراث نہیں ہے۔ ہر وقت ہر شخص کے شامل حال ہو سکتی ہے۔

چنانچہ ابن سعد جنگ پر آمادہ ہو گیا۔ اور شمر کو مرعوب کرنے کے لئے اس طرح آمادہ ہوا کہ عاشورہ کی رات آنے سے پہلے ہی اس نے حملہ کا حکم دیدیا۔

امام حسینؑ نے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیا۔ اور فوراً حضرت عباسؑ کو حکم دیا:۔
”ارکب نبفسی انت“

علامہ عبدالرزاق مقرر طالب ثراہ نے اپنی کتاب ”قمر بنی ہاشم“ میں امام حسینؑ کے اس فقرہ کی بلاغت پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ یہ فقرہ حضرت عباسؑ کی اس قدر جلالت اور عظمت مرثیت کی نشاندہی کرتا ہے جس کی شہدائے کربلا میں بھی کوئی نظیر نہیں ہے۔

زیادت دارثہ کے ذیل میں سائر شہداء کربلا کے بارے میں معصوم کا یہ فقرہ ضرور ہے کہ ”بانی انتم و احی“ میرے ماں باپ تم پر قربان“ لیکن اسکا (بقیہ صفحہ ۳۶۵ پر)

”بھیا تم پر میری جان قربان! جاؤ اور جا کر دیکھو کہ معاملہ کیا ہے؟“

(بقیہ ماشیہ ص ۳۶۲ سے آگے)

کوئی تعلق معصوم کے قربان ہونے سے نہیں ہے۔ یہ صرف امت کو تعلیم دی گئی ہے کہ تم جب زیارت شہدائے کربلا کے لئے جاؤ تو یہ جملہ زبان پر رکھو۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ مقام تعلیم مقام تقدیر سے بالکل مختلف ہے۔

مقام تعلیم میں مخاطب کے خدا ہونے کا ذکر ہوتا ہے اور مقام تقدیر میں خود امام معصوم کے خدا ہونے کا تذکرہ ہوتا ہے۔

شہدائے کربلا کی عظمت و جلالت اپنے مقام پر ہے۔ لیکن یہ منزل وہ نہیں ہے جہاں امام معصوم اپنی جان یا اپنے ماں باپ کی جان کو قربان کر سکے۔ یہ شرف صرف حضرت عباسؑ کے لئے ہے کہ امام حسینؑ نے مقام تعلیم میں نہیں بلکہ مقام تقدیر میں اپنی جان قربان کرنے کا ذکر کر کے قمر بنی ہاشم کی عظمت و جلالت میں جا چاند لگا دیئے ہیں۔

علامہ موصون کے اس عظیم افادہ کے علاوہ ایک بات یہ بھی قابل توجہ ہے کہ امام حسینؑ نے اپنی موجودگی میں جنگ کے ملتوی کرنے کی تحریک کے لئے حضرت عباسؑ کو بھیجا اور خود سامنے نہیں آئے۔

جب کہ تاریخ کربلا گواہ ہے کہ امام حسینؑ متعدد بار اتمام حجت کے لئے فوج دشمن کے سامنے آئے۔ اور مختلف وسائل سے انھیں سمجھاتے رہے۔ کبھی ابن سعد سے براہ راست گفتگو فرمائی۔ کبھی دشمنوں کے سامنے

حضرت عباسؓ میں انفراد کو لے کر فوج دشمن کے سامنے گئے اور پوچھا آخر یہ معاملہ کیا ہے؟
جواب ملا کہ اب صلح و صفائی کی تدبیریں ختم ہو چکی ہیں۔ حسیٹ سے کہہ دو کہ بیعت کریں یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔

(بقیہ حاشیہ ۳۶۵ سے آگے)

آگے اپنا تقارن کرایا۔ اپنا نسب شریف سمجھایا اور انھیں اپنا خون بہانے سے روکا۔
لیکن پہلی منزل میں جب دشمن نے حملہ کا ارادہ کیا تو آپؐ نفس نفیس سامنے نہیں آئے۔ بلکہ آپؐ نے اس کام کے لئے اپنے سردار لشکر قمر بنی ہاشم کا انتخاب فرمایا تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اب عباسؓ کا اقدام حسیٹ کا اقدام ہو گا۔ امدان کی گفتگو امام حسینؓ کی گفتگو تصور کی جائے گی۔

یہ ادبیات ہے کہ عباسؓ امامؐ کے حکم سے سٹ کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ تاریخ میں یہ عظمت سب سے پہلے جنابؐ مسلم کو عطا کی گئی ہے۔ جہاں آپؐ کو مستقل طور پر کوفہ کا سفیر بنا کر بھیجا گیا اور ساتھ ساتھ یہ سند دی گئی کہ میں اپنے ثقہ و معتمد علیہ بھائیؐ کو بھیج رہا ہوں۔ میرے آئندہ اقدامات کبھی انھیں کے بیانات کی روشنی میں طے ہوں گے۔
اور آج یہ شرف حضرت عباسؓ کو دیا جا رہا ہے۔

فرق یہ ہے کہ حضرت مسلمؓ نے یہ فرالغ امامؐ کی عدم موجودگی میں انجام دیئے اور دہاں انجام دیئے جہاں امامؐ کا جانا معلومت کے خلاف تھا اور حضرت مسلمؓ (بقیہ ص ۳۶۷ پر)

حضرت عباسؓ کی غیرت و حمیت کے لئے یہ نقرہ ناقابلِ برداشت تھا لیکن سفارتی ذمہ داریوں کا خیال رکھتے ہوئے دایس بولا کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ دشمن بیعت یا جنگ کے سوال پر مصر ہے۔

(بقیہ حاشیہ ۳۶۶ سے آگے)

کی حیثیت ایک تمہید اور مقدمہ کی تھی۔

اور حضرت عباسؓ نے اس خدمت کو امامؐ مظلوم کی موجودگی میں انجام دیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امامؐ کی موجودگی میں مسائلِ حرب و صلح کا طے کرنا عباسؓ کا کام ہے۔

سفارت اور نمایندگی کے اشتراک ہی کا یہ اثر ہے کہ معصومین نے دونوں کی زیارت کا بھی ایک ہی مبدا انداز رکھا ہے۔ اور جن الفاظ میں حضرت عباسؓ کو یاد کیا ہے تقریباً انہیں الفاظ میں جنابؐ مسلم کا بھی ذکر ہے۔

یہ ادبیات ہے کہ قربانی کی منزل میں حضرت عباسؓ کی منزل جنابؐ مسلم سے کہیں زیادہ بلند تھی۔ جس کا اندازہ کر بلا کے واقعات سے کیا جاسکتا ہے۔ حضرت مسلمؓ فوج دشمن کے لئے حضرت عباسؓ کی جرأت و بہمت کا نمونہ تھے ان کی عمر ۲۸ سال تھی اور حضرت عباسؓ کی عمر ۳۳ سال۔ وہ عقیل کے فرزند تھے اور یہ حیثیت کہ اس کے شیر۔

دشمن نے کوفہ ہی میں اندازہ کر لیا تھا کہ جب ۲۸ سال کے جوان کے مقابلے میں ۵۰ کی فوج کا کام ہو رہا ہے تو ۳۳ سال کے شیر اور ان کے ہمراہ جمع ہونے والے جوانانِ بنی ہاشم کی جرأت و بہمت کا کیا عالم ہو گا؟
(بقیہ ص ۳۶۷ پر)

اب حضور کا حکم کیا ہے ؟

آپ نے فرمایا کہ _____ بیعت کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے _____
اب جنگ ہی ہوگی _____ لیکن دشمن سے کہہ دو کہ ممکن ہو تو ایک شب کے لئے
جنگ کو ٹال دے تاکہ ہم لوگ یہ رات ذکر الہی میں بسر کر سکیں ۔
دن کا ایک ایک لمحہ بڑی نزاکت کے ساتھ گزر رہا تھا _____ امام حسین
اور ابن سعد میں ایک معنوی جنگ جاری ہے ۔
ابن سعد کو معلوم ہے کہ حسین اور ان کے بزرگوں نے عاشورہ کے دن شہادت

کی خبر دی ہے

اب اگر یہ واقعہ ایک لمحہ پہلے بھی پیش آجائے تو ان کے بزرگوں کی صداقت
جرح ہو جائے گی۔ اور اس طرح حاکم کی معنوی فتح ضرور ہو جائے گی۔
امام حسین ان ناپاک عزائم پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھے۔ آپ ہر اس کانی کوشش
سے اس موقع کو ٹالنے کی فکر میں تھے۔ کہ جنگ کا آغاز نہ ہونے پائے دشمن کا موقف
سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔ اور امام حسین کے صبر و تحمل میں اضافہ ہوتا جا رہا
تھا۔ _____

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶۸ سے آگے)

ابن زیاد کہ بلا میں صرف امام حسین کو مرعوب کرنے سے لئے فوج نہیں جمع
کر رہا تھا۔ بلکہ اس کے سامنے کوئی کائنات بھی تھا۔ وہ فوج کے ہر اضافہ
کے بعد غیر مطمئن تھا کہ کہیں ہاشمی جوانوں کو حلال نہ آجائے اور فتح و کامرانی
کا بننا بنایا منسوب بہ خاک میں مل جائے۔

(جو آدمی)

نتیجہ میں امام حسین نے شب عاشورہ کی حق و صداقت کی جنگ فتح کر لی اور ایک
شب کی مہلت مل گئی۔

اس ایک شب کی مہلت لینے میں عبادت ذکر الہی کا تذکرہ کبھی کسی معنویت
سے خالی نہیں ہے۔

امام حسین دشمن کو متوجہ کر رہے ہیں کہ آخری وقت میں کبھی طریقین کے عزائم
سامنے آجائیں اور واضح ہو جائے کہ تمہارے سامنے صرف جنگ ہے اور ہمارے
سامنے جنگ سے بالاتر ذکر خدا کا خیال ہے۔

مہلت کے اس سوال پر ابن سعد نے زعماء لشکر کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور
یہ طے ہونے لگا کہ حسین اور ان کے اصحاب کو مہلت دی جائے یا نہیں ؟ شمر کے لئے
یہ کبھی ایک حسین موقع تھا۔ اس کا منشاء یہی تھا کہ کسی طرح جنگ چھڑ جائے اور اس کے پھڑپھڑے
کا سہرا میرے ہی سر باندھ دیا جائے۔

اس طرح مجھے تین قسم کے فوائد حاصل ہوں گے۔

۱۔ حسین کے بزرگوں کی صداقت جرح ہو جائے گی۔

۲۔ ابن سعد سے قیادت لشکر چھین جائے گی۔

۳۔ میں حاکم وقت کی بارگاہ میں سرخرو ہو جاؤں گا۔

ابن سعد وقت کی نزاکت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور اس کی قوت مفصلہ نے

جواب دیدیا۔ "حالات یا مزاج"؟ حالات جنگ چاہتے ہیں اور مزاج جنگ پر
آمادہ نہیں۔

اتفاقاً عمرو بن العجاج بول پڑا۔ _____ اور ابن سعد کی عزت

بچ گئی۔ _____ اس نے کہا کہ حسین تو حسین ہیں اگر ترک درلیم کے غلام کبھی ایک

شب کی مہلت مانگتے تو ہم مہلت دیدیتے۔

ابن سعد نے موقع پاتے ہی اس کی رائے کی محنت پر زور دیا۔
اور شمر اپنے اس مشن میں کئی کامیاب ہو گیا۔ فوجوں میں چاروں طرف منادی کرا دی
گئی کہ آج کی رات جنگ ملتوی رہے گی۔ اور کل صبح کو آخروی
فیصلہ ہو گا۔

جنگ کے التواء کا اعلان تو ہو گیا۔ لیکن شمر کی ریشہ دوانیوں کا
سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس نے اپنے مقام پر یہ فیصلہ کیا کہ اب فوجی کمان میرے مقدر میں
نہیں ہے اور مجھے صرف سردار لشکر ہی رہنا پڑے گا۔

بہتر ہے کہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دوں جو مجھے حاکم کے سامنے سرخرو بنائے
اور ابن سعد کے مقابلہ میں زیادہ مدد بردار مخلص ثابت کر سکے۔ چنانچہ
یہی خیال تھا جس نے شمر کو امان نامہ پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ ورنہ التواء جنگ کی تحریک
میں شمر کی تقریر اسکے بالکل برعکس تھی۔

”امان نامہ“ کی تحریک سے اکثر ارباب قلم کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ شمر کو شتہ دلا
کا خیال آگیا اور اس نے حضرت عباس اور ان کے بھائیوں کو جنگ کی آگ سے بچالینا چاہا
”جہے ناموں کا رشتہ رحم و کرم کی علامت کرتا ہے۔“

حالانکہ یہ خیال انتہائی جہل ہے۔ شمر جنگی تدابیر میں ابن سعد سے کہیں زیادہ
ہوشیار تھا وہ کوفہ سے ہر طرح سے مسلح ہو کر آیا تھا اور اس کے پیش نظر مسئلہ کے تمام
جہات تھے۔

اس نے ابن زیاد سے بیک وقت دو پروانے حاصل کئے تھے۔
ایک ابن سعد کے نام کہ جنگ چھیڑ دی جائے اور ایک امان نامہ کی شکل میں حضرت
عباس اور ان کے بھائیوں کے نام کہ تمہارے لئے اب بھی امان کے امکانات ہیں
تاکہ جب بھی موقع آجائے میری برتری بہر حال سلامت رہے۔

امان نامہ کی مستقل کوئی حیثیت برقی توجہ وقت آغاز جنگ کے بعد حضرت عباس
امام حسین کا پیغام لے کر گئے تھے۔ شمر فوراً کہہ دیتا کہ تم سے کیسا
مطلب ہے۔ تمہارے لئے تو مستقل طور پر امان ہے۔ تم حسین کا ساتھ چھوڑ دو۔ ہم
ان کے بارے میں اپنا فیصلہ کر لیں گے۔

لیکن عصرِ نہم۔ امان نامہ کا ذکر نہ کرنا۔ اور شب عاشور
امان نامہ لے کر آنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شمر حالات کی رفتار کے ساتھ
اپنے اقدامات میں تبدیلی کر رہا تھا اور ابن سعد کو بدنام کر کے فوجی کمان سنبھالنے کی
فکر میں پریشان تھا۔

اور جب اسے اس منصوبہ میں کئی نا کامیابی ہو گئی تو اب امام حسین کی فوجی طاقت کو
کمزور کرنے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شمر کی نگاہ میں اس کے خاندان سے زیادہ کوئی بہادر خاندان نہ تھا۔
اور حضرت عباسؓ اس خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس نے سوچا کہ
انہیں لشکر حسین سے الگ کر لیا جائے تو لشکر کی کمزوری ٹوٹ جائے گی اور انہیں
قتل کر دینے میں کوئی زحمت نہ ہوگی۔

حضرت عباسؓ کی ”شمر“ کی ”پست فطرت“ سے بخوبی باخبر تھے۔
وہ جانتے تھے کہ یہ عیار دسکار کوئی مخلصانہ اقدام نہیں کر سکتا
اس لئے آپ نے اس کی آواز پر لبیک بھی نہیں کہی اور اسے کسیر نظر انداز کر دیا

لیکن جب امام حسینؓ نے فرمایا:۔
”اَجِيسُواہِ ذٰلِکَ اِنْ کَانَ فَاَسَقًا۔“

اگرچہ شمر فاسق ہے لیکن دیکھو کیا کہہ رہا ہے : تو مجبوراً اطاعتِ امام کے اقرار میں شمر کے پاس چلے گئے۔

شمر نے امان نامہ پیش کر دیا اور اپنی طرف آجانے کی دعوت دیدی غیرت ہاشمی کے لئے یہ آخری فیصلہ کن لمحہ تھا۔

جناب عباس نے شمر سے فرمایا : ”خدا تیرے امان نامہ پر لعنت کرے تیرا مقصد یہ ہے کہ ہم امام حسینؑ کو چھوڑ کر ملاعین اور ملاعین کی اولاد کی اطاعت میں داخل

۱ علامہ کنزوری کا بیان ہے کہ امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کے بجائے ان کے بھائیوں سے کہا تھا کہ تم شمر کو جواب دو اور اس سے گفتگو کرنا کہ حضرت عباسؑ کا احترام محفوظ رہے۔ ان کی نظر میں تاریخ کے صحیح الفاظ یہ ہیں۔

”فَقَالَ الْحُسَيْنُ لَا خَوْفَ أَجَبِيؤُا“

امام حسینؑ نے ان کے بھائیوں سے کہا کہ شمر کی بات سنو۔

حالانکہ ان دونوں عبارتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شمر نے تمام بھائیوں کو آواز دی تھی اور امام حسینؑ کو بھی تمام بھائیوں کو مامور کرنا تھا

”اَجَبِيؤُا وَ اِنْ كَانَ فَاَسْقَا“

کا خطاب اسی جماعت کے لئے ہے۔ صرف حضرت عباسؑ کے لئے نہیں ہے۔

۲ خومنتس۔۔۔۔۔ میں کبھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ صرف حضرت عباسؑ کے بھائی مراد ہوں۔ اور وہ خود اس خطاب سے باہر ہوں۔ بلکہ یہ کبھی ممکن ہے کہ خود اپنے ہی بھائی مراد ہوں۔ اسلئے کہ جناب عباسؑ کے بھائیوں کے علاوہ کربلا میں امام حسینؑ کا واقعی بھائی کون تھا جو اس طرح اپنی جان نثار کرتا اور جسکی اسے آڑے وقت میں ضرورت پڑتی۔

(جوادی)

ہو جائیں گے۔

غضبِ خدا کا ہمارے لئے امان ہے اور فرزندِ رسولؐ کے لئے امان نہیں ہے۔

ناخ التواريخ ۶ ۲۲۳، اعثم کوئی ص ۲۶۷

جناب عباسؑ کا جواب معرفت و جرات سے بھرپور تھا۔ آپ نے ایک طرف وفاداری اور معرفت کا اعلان کیا۔ اور دوسری طرف واضح لفظوں میں یزید و ابنِ زیاد کے حالات کا اظہار فرما دیا۔

شمر اس آخری تدبیر میں بھی ناکام ہو گیا۔ اور اسے سیاسی و معنوی دونوں محاذوں پر کھلی ہوئی شکست ہو گئی۔

سیاسی اعتبار سے وہ امام حسینؑ کے لشکر میں پھوٹ ڈال کر سردار کو توڑنا چاہتا تھا اور نتیجہ میں امام مظلوم کی فوجی طاقت کو کمزور بلکہ نیست و نابود کر دینے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔

جناب عباسؑ کے جواب نے اس منصوبہ کو خاک میں ملا دیا اور یہ بتا دیا کہ میرا ساتھ صرف قرابت کی بنا پر نہیں ہے، اس کی پشت پر معرفتِ امامؑ کا جذبہ کار فرما ہے اور میری غیرت ایمانی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میں بیعتِ امامؑ کو توڑ کر اطاعتِ ملاعین میں شامل ہو جاؤں۔

حضرت عباسؑ کا یہ جواب وفاداری کی اس تاریخ کا امتداد ہے جس کا سلسلہ حضرت ابوطالبؑ سے شروع ہوا ہے۔

کل نصرت ابوطالبؑ پر یہ شبہ کیا جا رہا تھا کہ ابوطالبؑ نے رسولِ اکرمؐ کی امداد قرابت کی بنا پر کی تھی۔ اور آج جناب عباسؑ کی نصرت پر بھی الزام لگایا جاتا۔ آپ نے صحیح صورتِ حال کو فوراً واضح کر دیا کہ اور دنیا کو بتا دیا کہ میری نصرت کے پیچھے

رشتہ و قربت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ یہ خالص نصرتِ دین الہی ہے جس کا مقصد تحفظِ لائے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

معنوی اعتبار سے شمر ملعون کا مدعا مولائے کائنات کے ”مشہور مقصد“ کی تکذیب تھا کہ عباسی امام حسین پر قربان نہ ہونے پائیں۔ اور اس طرح وہ مقصد خاک میں مل جائے جس کے لئے جناب امیر نے عباسی کو فراہم کیا ہے۔

اس بات کا علم شمر سے بہتر کس کو ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔ وہ جناب ام البنین کا حقیقی بھائی نہ ہی خاندانی۔۔۔۔۔ عزیز تھا اور عرب میں ایسی خبریں پورے قبیلے میں پھیل جایا کرتی ہیں کہ نلال عقد کس نوعیت کا اور کس مقصد کے تحت انجام پا رہا ہے۔

جناب عباس نے ان نامہ کو ٹسکرا کر باپ کے مقصد کی لاج رکھ لی۔ اور یہ واضح کر دیا کہ دولت دنیا یا اقتدار مادی حقانیت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔۔۔۔۔ حق دالے حق کے ساتھ رہتے ہیں۔۔۔۔۔ انہیں بیعت باطل سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

یہ جذبہ اس وقت ابھر کر سامنے آیا جب اسی رات۔۔۔۔۔ حضرت زبیر تین نے خطاب کر کے فرمایا۔

”عباش! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے بابائے تہمیں کس دن کے لئے جیا کیا ہے؟“

اور شیر کر بلانے ایک انگڑائی لے کر فرمایا۔

”ذہیر تم آج کے دن شجاعت دلا رہے ہو۔۔۔۔۔ بس

یہ ایک رات اور باقی ہے اس کے بعد دیکھنا کہ عباسی اپنے مقصد

حیات کو کیونکر پورا کرتا ہے؟“

عباش کی انگڑائی میں کیا زور تھا۔۔۔۔۔ اور ان کے جہلوں کے پیچھے کون سا جذبہ کام کر رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کا اندازہ کرنا ایک مورخ کے بس کی بات نہیں ہے۔

مورخ حالات کا غامض تماشائی ہوتا ہے، اسے دردِ جگر اور ”سوزِ قلب“ سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔

کا فیصلہ عصر سے پہلے ہی ہو جاتا۔ لیکن پیکرِ اخلاص و دفا اور مجسمہِ عرفان عباسی مرضی انام پر نظر جمائے رہے اور ہر قدم پر خون کے نئے گھونٹ پیتے رہے۔

عباش کی جرأت و بہمت کو ظاہر ہونے کا موقع تو نہیں ملا۔ لیکن ان کی جلالت و عظمت ہر نیمروز کی طرح روشن ہو گئی۔ اب دنیا باقاعدہ طور پر یہ اندازہ کر سکتی ہے کہ جرأت و بہمت کے مظاہرے اور ہوتے ہیں اور صبر و شجاعت کے مظاہرے اور۔

مذہب و عقل پر غالب آجائے تو جرأت و بہمت ہے اور جذبات و احساسات عقل کے سانچے میں ڈھل جائیں تو شجاعت و عرفان۔

تجدیدِ عہد

عاشورہ کی رات بظاہر "طوقِ بیعت" اٹارنے کی رات تھی۔
اس رات اصحاب کو مکمل آزادی دی جا رہی تھی۔ اور انھیں بتایا جا رہا تھا
کہ یہاں "تلفِ جان" کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جس کو جانا ہو جلد ہی حدودِ مملکت سے
نکل جائے۔

لیکن حقیقتاً یہ تجدیدِ عہد کی رات تھی جب امام حسینؑ اپنے اصحاب و اعزاء کو موردِ
حال سے باخبر کر کے جانے کی مکمل آزادی دے رہے تھے۔ اور ضمناً اس
بات کی طرف متوجہ فرما رہے تھے کہ اب جسے بھی رہنا ہے وہ عہدِ وفا کی تجدید کر کے
رہے۔ اب موت و حیات کوئی مسئلہ نہیں ہے۔
اب زندگی کی بازی لگانا ہے۔ اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال
کر مسکراتا ہے۔

تجدیدِ عہد کا یہ انوکھا انداز شاید ہی کبھی دیکھنے میں آیا ہو۔
سربراہ مقصد جانے کی اجازت دے رہا ہے اور جانے والے مرنے پر کمر باندھے

ہوئے ہیں۔

"تاریخ گواہ ہے کہ امام حسینؑ نے شبِ عاشورہ اپنے خطبہ میں اپنے اصحاب و اہل بیت
کی "نما کا اعلان کرنے سے پہلے یہ واضح کر دیا تھا کہ جسے جانا ہے وہ چلا جائے اور تنہا
جانے میں شرم آتی ہے تو ہمارے اہل بیت میں سے ایک ایک شخص کی انگلی پکڑ کر
لے جائے۔"

لیکن اصحاب و انصار اور جوانانِ بنی ہاشم ضبط نہ کر سکے اور سب سے پہلے
عباس خاندان کی نمائندگی کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ عرض کی۔
"لِمَا نَفْعَلُ ذَٰلِكَ لِنَبْقِيَ بَعْدَكَ لَا أَرَأَاكَ اللَّهُ"
"کیا آپ کو چھوڑ کر اس لئے چلے جائیں کہ آپ کے بعد زندہ رہنا ہے
خدا وہ دن نہ دکھائے۔"

حضرت عباس کا یہ کہنا تھا کہ اصحاب و اہل بیت درلوں کی رگوں میں خونِ وفا
جوش مارنے لگا اور سب نے یکے بعد دیگرے سے اپنے جذبات کا اظہار شروع کر دیا
سب سے پہلے گھوڑالوں نے ان لفظوں کو دہرایا۔ مقتلِ عوالم۔
اس کے بعد مسلم بن عوسجہ، زبیر بن عیینہ، سعید بن عبد اللہ۔ ایک ایک کر کے
اٹھتے رہے اور یہ اعلان کرتے رہے کہ مولا۔۔۔ ایک مرتبہ کامرنا جینا
کیا ہے۔

اگر ستر مرتبہ یا ہزار مرتبہ بھی قتل کئے جائیں اور قتل کے بعد نذر آتش کر دیئے
جائیں۔ ہماری فاکٹر کو ہوا میں اڑا دیا جائے اور دوبارہ زندگی دیدی جائے تو آپ
کی نفرت سے کسی دقت بھی باز نہ آئیں گے۔

اس موقع پر امام حسینؑ کے وہ الفاظ بھی قابلِ توجہ ہیں جن کے جواب میں ان
جذباتِ وفا کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

امام زین العابدین کا بیان ہے کہ جب پدر بزرگوار نے شب عاشورا تقریر کا ارادہ فرمایا تو میں بحالت مرض و میرے دیرے اس مقام تک پہنچا جہاں اصحاب کو جمع کیا گیا تھا اور چاہا کہ بابا کی زبان سے صحیح حالات کا جائزہ لے سکوں اور یہ دیکھوں کہ ایسے مواقع پر آپ کیا ہدایت فرما رہے ہیں۔

آپ نے اصحاب سے خطاب کر کے فرمایا۔

”اُشْنِي عَلَى اللَّهِ أَحْسَنَ الثَّنَا وَ أَحْمَدًا عَلَى الشَّرَاءِ
وَالضَّرَاءِ اللَّهُمَّ إِنِّي أَحْمَدُكَ عَلَى أَنْ كَرَمْتَنَا بِالتَّبَوُّعِ
وَعَلَّمْتَنَا الْقُرْآنَ وَفَهَّمْتَنَا فِي الدِّينِ وَجَعَلْتَ لَنَا
أَسْمَاعًا وَأَبْصَارًا وَافْتَدَّاهُ فَجَعَلْنَا مِنَ الشَّاكِرِينَ
أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي لَا أَعْلَمُ أَصْحَابًا أَوْ فِيهِ مِنْ أَصْحَابِي
وَلَا أَهْلَ بَيْتٍ أَبْرَدَ وَأَوْصَلَ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي فَجَزَاكَ اللَّهُ
عَنِّي أَلَا وَإِنِّي لَكُمْ نَظِيرٌ يَوْمَ مَا لَنَا مِنْ هَؤُلَاءِ أَلَا وَإِنِّي قَدْ
أَذْنْتُ لَكُمْ فَأَطِيعُوا أَجْمَعِينَ فَإِنِّي لَيْسَ عَلَيْكُمْ حَرَجٌ
مِثِّي وَلَا رِمَامٌ هَذَا اللَّيْلُ قَدْ عَشَاكُمْ فَأَتَّخِذُوا
جَمَلًا وَتَقَرُّوا فِي سُورَادِ فَإِنَّ الْقَوْمَ إِنَّمَا يَطْلُبُونَ نِسِي
وَلَوْ ظَفَرُوا إِلَيَّ لَذَهَلُوا عَنْ طَلَبِ غَيْرِي“

ناسخ التواريخ ۶ ص ۲۴۲، مقتل عوامل ص ۵۸

”مالک کی بہترین ثنا۔ اور نرم گرم زمانہ میں اس کا بے حد شکر
مالک! تیرا شکر کہ تو نے ہمیں نبوت سے سرفراز کیا۔ قرآن کریم
کا علم دیا۔ دین کی بصیرت دی۔ اور مذہب میں گوش شنوا جہنم بنا

اور دل دانا عطا کیا۔ مالک ہمیں شکر گزاروں میں قرار دے۔

اما بعد۔ میرے علم میں میرے اصحاب سے زیادہ بادشاہ اصحاب
اور میرے گھر والوں سے زیادہ تنگوار اور حفظ قرابت کرنے والے
اہل بیت نہیں ہیں۔ خدا تمہیں جزائے خیر عطا کرے۔

یاد رکھو یہ دل صرف میرے لئے ہے۔ میں نے تمہیں سب
کو اجازت دیدی ہے تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو چلے جاؤ۔

تم سب پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ رات بھی
چھا چکی ہے۔ اسے ذریعہ قرار دے کر اس کی تاریکی
میں جہاں چاہو چلے جاؤ۔ یہ قوم صرف مجھے جانتی ہے
اور مجھے پالنے کے بعد پھر کسی کی طرف متوجہ نہ ہوگی۔“

دنیا کے دوسرے سربراہوں کی تاریخ میں ایسے واقعات تو مل سکتے ہیں
جہاں انھوں نے مشکلات و مصائب کے هجوم میں قوم سے بیعت اٹھالی ہو اور
انھیں آزاد کر دیا ہو۔

لیکن ان کی تقریروں کا لہجہ ہمیشہ جذباتی اور نفسیاتی ہوا کرتا ہے تاکہ
سربراہوں کا فرض ادا ہو جائے اور لشکر متفرق بھی نہ ہوتا پائے۔

امام حسین کے اس خطبہ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ آپ نے اس میں کسی
لگاؤ جذباتیت کا مظاہرہ نہیں فرمایا۔ نہ اپنے بے کسی کا اظہار
کیا۔ اور نہ اپنے سپاہیوں کے جذبات کو ابھارا۔

مان مان لفظوں میں صورت حال کو واضح کر کے ان کی ذمہ داری کو ختم کر دیا اب وہ
جہاں چاہے جاسکتے ہیں۔

لیکن اس کے بعد بھی مصائب کا یہ مجموعہ جو جذباتی حالت میں نہایت

کا انداز حساسیت سے بھرا ہوا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عرفانِ امام نے ان کے نفوس کو مخصوص جذبات کے سانچے میں ڈھال دیا ہے اور یہ امام کے بعد زندگی کو زندگی ہی نہیں سمجھتے ہیں ان کے ذہن میں حیات و کائنات سب امام کے فیوض و برکات کا صدقہ ہیں اور کسی ذرہ کائنات کو ان سے ہٹ کر باقی رہنے کا حق نہیں ہے۔

یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے جذباتِ دفا کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ ہزار بار بھی زندہ کئے جائیں تو آپ کی نصرت سے منہ نہ موڑیں گے اور اس زندگی کو آپ کا صدقہ ہی سمجھیں گے۔

ظاہر ہے کہ اس عرفان و احساس میں حضرت عباس سے بالاتر کون ہو سکتا ہے۔ آپ کا دل معرفتِ امام سے سرشار اور آپ کا مقصد وجودِ قربانی کی دعوت تھا۔ آپ نے سب سے پہلے اپنے احساسات کا اعلان کیا اور ایسے لہجہ میں کیا کہ اس کے بعد اصحابِ داہلیت میں کوئی خاموشی نہ بیٹھ سکا۔ اور ہر شخص نے حسبِ امکان اپنی دفا کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ حالات نزاکت کے اس موڑ پر آگئے تھے کہ ہر شخص اپنی تقریر کو سابق کی تقریر سے زیادہ موثر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور دل میں صرف ایک تڑپ تھی کہ مولا ہماری دفا پر اعتماد فرمائیں۔

امام حسین سے بہتر ان قلبی کیفیات کا جاننے والا کون ہو گا۔ آپ نے پہلے ہی ان نفسیات کا احساس کر کے ان کی دفا داری کا اعلان فرما دیا تھا۔ اصحاب کا ذریعہ بیان امام کے اعتماد پیدا کرنے کے لئے قطعاً نہ تھا۔ یہ دنیا نے عرفان کے لئے ایک درسِ عبرت تھا کہ صحیح عقیدہ اور صالح کردار کے بعد زندگی اور موت کے پیمانے بدل جایا کرتے ہیں کمزور عقیدہ والوں کا معیار حیات اور ہوتا ہے اور مستحکم عقیدہ والوں کا معیار زندگی اور ا

معرکہ کارزار

آفتابِ کربلا سافِ شب طے کر چکا ہے — سحر کا رعبے حجاب جلوہ افروز ہے — بندگانِ کردگارِ عبادت پروردگار میں مصروف ہیں اور روحِ نازک جامِ دسبو میں تیر رہی ہے۔

فوجِ دشمن صفِ آرائی پر آمادہ ہے — ابنِ سعد اپنے لشکر کا آفری جانزہ لے رہا ہے — چند لمحوں میں جنگ شروع ہونے والی ہے۔ اور ایسی جنگ ہونے والی ہے کہ سر راستے ہوئے نظر آئیں گے اور ہاتھ کٹ کٹ کے گرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

اور ہر امامِ مظلوم کبھی معطلانے عبادت سے اٹھ چکے ہیں — اور جہاد کی آخری تیاریوں میں مصروف ہیں — لیکن دونوں کے اہتمام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور اسی ہزار یا کم از کم ۳۰ ہزار کا لشکر ہے۔ اور مصر یا زیادہ سے زیادہ ۱۲۵۰۰۰ فلوں دفا کے پیکر ہیں۔

اور مہمینہ و مسیرہ و قلب میں ۲۰۰ ہزار کی تعداد ہے اور اور ہزار سے زیادہ

کی گنجائش نہیں ہے۔

ادھر ابن سعد نے اپنے لشکر کو مرتب کیا۔ اور میمنہ پر شمر بن ذی الجوشن کو رکھا۔ میسرہ پر غولی بن یزید اصبی کو رکھا۔ قلب لشکر کو در حصوں پر تقسیم کیا۔ سواروں کا انصر عرہ بن قیس کو مقرر کیا اور پیادوں کا سردار شہبث بن ربعی کو قرار دیا۔

ناخ التواریخ ۶ ۲۴۹

ادھر شاہ کم سپاہ کے پاس اتنی سپاہ کہاں کہ ترتیب لشکر کا کوئی اہتمام کیا جاتا رات تمام عبادت الہی میں گزر گئی ہے۔ صبح کو مجاہدین مصلے پر ہیں۔ اور تعقیبات کا سلسلہ جاری ہے۔

دفاع کے فرض۔ اور حفاظت خود اختیاری کی ذمہ داری نے ظاہری ترتیب کی دعوت دی ہے تو ایام مظلوم نے میمنہ پر زبیر۔ میسرہ پر حبیب اور قلب پر عباس علیہ السلام کو مقرر کر کے انھیں راہت لشکر دیدیا ہے۔

البصار العین ۲۹۸ ناخ ۶ ۲۴۹

یہ پہلا موقع ہے جب عباس کو اپنے مقصد حیات کی تکمیل کا وسیلہ ہاتھ آیا ہے۔ اور سرداری لشکر نے اطمینان دلایا ہے کہ لب ہرآن میدان جہاد ہی میں رہنا ہے۔ جوش شجاعت جوصلے بڑھا رہا ہے۔ اور حریت دعائیں دے رہی ہے۔ ”خدا کرے اذن جنگ مل جائے“

فکر تکمیل شہادت میں ہیں شاہ کربلا

دل لڑتا ہے کہ تیرا نام بھی محض ہے

(زادہ کرادی)

عباس علیہ السلام لشکر ہو تو فتح و ظفر میں کیا دیر ہے۔ اور کامیاب اور

کامرانی کتنی در رہے۔ بعید نہیں کہ کربلا کا تختہ الٹ جائے اور جنگ کا نقشہ بدل جائے۔

زبیر کے جواب میں یہ کہا بھی جا چکا ہے کہ آج جوش شجاعت نہ دلاؤ آج تو دنیا کو اندازہ ہو جائے گا کہ شجاعت کسے کہتے ہیں۔ اور عباس کیا شجاع ہے۔

انھیں نازک حالات میں عباس نے سرداری لشکر کا عہدہ سنبھالا۔۔۔ اور اپنے فرض کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔

تااریخ کی غفلتوں کا شکوہ بے کار ہے۔ مورخ سے جذبات کی ترجمانی کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔ فوج دشمن کا مصروف خیام حسینی۔ اور خیام کے اندر مجاہدین۔ پھر مجاہدین کے سینوں میں دل اور دل کے اندر چھپے ہوئے جذبات کو کیا بیان کرے گا۔

بعیرت آگین نگاہ اور ہوش مند دل و دماغ ہو تو اندازہ کرے کہ عباس کا ایک ایک لمحہ کس اضطراب میں گزر رہا ہے۔

مرثیہ نگار حضرات نے اس مقام پر بہت کچھ دنیا کا حق ادا کیا ہے۔۔۔ اور تلامذہ الرحمان ہونے کے ناتے حالات کی تقویر کشی کی ہے۔ لیکن مجھے ان جذبات کا تفصیلی تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ یہ باتیں کچھ نظم ہیں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ شعر و سخن کا میدان بلند ہی نہیں ہے۔ اور شرکا میدان اس سے بالکل مختلف ہے۔

یعنی سیرت نگار حضرات نے ایک ایک شہید کے سلسلے میں حضرت عباس کی گفتگو اور ان کے جذبات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ لیکن میری نظر میں ان تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت عباس کا امام حسین کی طرف سے علحدہ لشکر ہونا خود ہی ان سارے خدات کی واحد دلیل ہے۔ عباس امام حسین کے نمائندے ہیں اور ایسا انسان کسی لمحہ بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں ہو سکتا۔

مغضب تو امامت کا بھائی کو ملائیکن
عباس کے ہاتھوں میں پرچم ہے امامت کا

(زوار گردی)

تاریخ بیان کرے یا نہ کرے۔ مقاتل میں ذکر ہوا نہ ہو۔ ذمہ داری کا اقتضا یہ ہے کہ عباس ہر مجاہد کے ساتھ رہیں۔ ہر ایک کو رخصت کریں اور ضرورت پڑ جائے تو میدان میں اس کی کمک کے لئے جائیں۔ گھوڑے سے گرے تو سہارا دیں اور امام حسین میدان میں جائیں تو ان کے ہمراہ رہیں۔ جس کے حشر جستہ شواہد تاریخ میں اس انداز سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

۱۔ امام حسین کی تقریر پر خیمہ میں کہرام برپا ہوا تو حضرت عباس محذرات کو سمجھانے کے لئے گئے۔

۲۔ حمزائے توحنا عباس استقبال کے لئے گئے۔

۳۔ دسب کی رخصت کا وقت آیا تو امام حسین کے ساتھ حضرت عباس کے دل کا اضطراب بھی بڑھ گیا۔

۴۔ عمرو بن خالد صیداوی نے مدد کے لئے بلایا تو حضرت عباس میدان میں کمک کے لئے گئے۔

۵۔ دشمنوں نے خیام میں آگ لگانے کا منصوبہ بنایا تو حضرت عباس نے حملہ کر کے اسے ناکام بنادیا۔

۶۔ عون و محمد کی جنگ کا وقت آیا تو حضرت عباس حوصلہ بڑھانے کے لئے سامنے

کے لئے سامنے آگئے۔

جناب ام کلثوم پریشان ہوئیں تو عباس فدیہ بن گئے۔

سکینہ نے پانی کی شکایت کی تو عباس نے اپنے خدمات پیش کر دیئے۔

خندق کھودنے کا سوال آیا تو عباس آگے آگے رہے۔

بربر ہمدانی کو گھیر لیا گیا تو عباس نے مدد پہنچائی۔

اس کے علاوہ بے شمار شواہد ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عباس روزِ نادر ہی سے اپنے خدمات میں مصروف تھے اور کسی آن اہل بیت و اصحاب کی طرف سے غافل نہ تھے۔

سرداری لشکر اور علمبرداری کے بعد تیریہ دمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی تھیں۔

اب عباس کے خدمات میں کون انسان شک کر سکتا ہے اور کسے یہ اندازہ نہیں ہے کہ ایسا ذمہ دار انسان اپنے فرائض کو کس حد تک بخوبی کے ساتھ ادا کریگا۔

بعض موفیقین نے حضرت عباس کے خدمات میں کونوں کھودنے کا بھی ذکر کیا ہے اور اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ گویا یہ مسلمہ روزِ عاشور تک جاری رہا اور کونوں برابر کھودے جاتے رہے۔

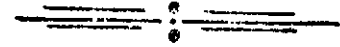
بلکہ بعض حضرات نے تو اور بھی ترقی کی ہے اور پانی کے برآمد ہو جانے کے بعد جناب سکینہ کے کوزہ لیکر آنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگرچہ یہ پانی کام نہیں آسکا اور جناب سکینہ طہاب خیمہ میں الجھ کر گر پڑیں۔

لیکن یہ سب باتیں بعید از قیاس اور خلاف عقل و منطق ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ان بیانات کا جائزہ لیا جا چکا ہے اور منطقی اعتبار سے یہ ناممکن ہے کہ فوج محاذِ جنگ پر لڑ رہی ہو۔ گھسان کارن پڑ رہا ہو۔ چوٹی سی سپاہ ہزاروں کے لشکر سے صاف آدھا ہو اور سردار لشکر خیمہ کے اندر کونوں کھودنے میں مصروف ہو۔

کا فیصلہ دیکھ کر غلاموں اور محبہ عرفان عباسی مرضی امام پر
نظر جمائے رہے اور ہر قدم پر خون کے نئے گھونٹ پیتے رہے۔

عباسی کی جرأت و سمیت کو نظر اہر بڑے کا موقع تو نہیں ملا۔ لیکن ان کی جلالت و
عظمت ہر نیر و زکی طرح روشن ہو گئی۔ اب دنیا باقاعدہ طور پر یہ اندازہ کر سکتی ہے
کہ جرأت و سمیت کے منظر اہرے اُردو ہوتے ہیں اور صبر و شجاعت کے منظر اہرے
اور۔

عبداللہ و عقیل پر غالب آجائے تو جرأت و سمیت ہے اور مجتہد اہل اصنامات
عقل کے سانچے میں ڈھل جائیں تو شجاعت و عرفان۔



گرمی بازار شہادت

ماشور کا اون وہ قیادت خیر تھا۔ جب پوری کائنات اخلاص و وفائے قربانگاہ
عبودیت پر مصیبت چڑھانے کی قسم کھائی تھی اور ہر مجاہد کی بس ایک ہی تمنا تھی کہ پہلے
ہم راہ خدا میں کام آجائیں۔

خواتین و محذرات بھی بے چین تھیں کہ پہلے ہماری گود کا پالا شہید ہو۔
پہلے ہماری کو کھ اجڑے۔ پہلے ہمارا سہاگ لٹے۔ اور پہلے ہمارا ابا باغ
تمنا نذر خزاں ہو۔

خانوادہ ہاشم کے جوان تڑپ رہے تھے کہ اصحاب و انصار سے پہلے ہماری
جانیں کام آجائیں۔ اور غیروں سے پہلے گھر والے قربان ہوں۔

شہادت کی یہ گرم بازاری اس وقت ہوئی جب ابن سعد نے خیام حسینی کی
طرف پہلا تیرہا کیا اور اس کے زیر اثر چار ہزار تیرہ اندازوں نے تیزی بوجھا شروع
کر دی

امام حسین نے بھی اپنے جانبا زوں کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اور مجاہدات
کا آغاز ہو گیا۔

حالات اس قدر پہنچ گئی تھیں کہ یہ فیصلہ بھی دشوار ہو گیا تھا کہ کون مجاہد کب میدان میں گیا۔ کب جہاد کیا اور کب کام آگیا۔

اتنا ضرور تھا کہ فوج دشمن کے سونچا س بھی کٹ جاتے تو کوئی پتہ نہیں چلتا تھا اور مجاہدین اسلام میں ایک بھی کام آجاتا تو لشکر میں نمایاں کمی ہو جاتی تھی۔

اصحاب کے درجہ شہادت پر فائز ہونے کے بعد گھروالوں کی باری آئی اولاد عقل کے ایک ایک مجاہد نے جان کی باری لگائی اور ”برداپتے“ فرزند احمد امام حسین ”علی اکبر“ نے میدان کا رخ کیا اور ہاشمی وقار کو سر بلند کیا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ حالات کا صحیح جائزہ لینے کے بعد جناب عباس نے یہ فیصلہ کیا کہ اب میرے گھر کی قربانیوں کو پیش ہونا چاہیے مسئلہ صرف یہ تھا کہ پہلے اپنی قربانی پیش کریں یا اپنے بھائیوں کو راہ خدا میں قربان کریں؟

جذباتی فیصلہ تو یہی تھا کہ جذبہ وفا کے اظہار کے لئے پہلے اپنی جان نذر کریں لیکن عباس کسی جذباتی شخصیت کا نام نہیں ہے۔ عباس ایک ذمہ دار لشکر کا نام ہے آپ کے پیش نظر فوجی ذمہ داریاں بھی ہیں اور آل ابو طالب کی عظمت و برتری بھی۔ جذبہ وفاداری بھی ہے اور قربانی کی معرفت بھی۔

آپ نے طے کیا کہ بھائیوں کی قربانی کے مقدم کرنے میں دوسرے مصالح ہیں۔ ایک طرف ان کی عاقبت کا اہتمام اور ان کی جنت کا انتظام پہلے ہو جائے گا۔ اور دوسری طرف مجھے ان کے غم میں صبر کر کے مزید اجر و ثواب کا استحقاق ہو جائے گا۔ ایک مجاہد اور سپاہی کے لئے گلا گڑا دینا کوئی کام نہیں ہے۔ حقیقی بھائیوں کی لاشیں اٹھا کر صبر کرنا بہت بڑا کام ہے اور فیصلت کے اعتبار سے کام جس قدر دشوار ہو گا اتنا ہی افضل و برتر ہو گا۔

حضرت عباس کو یہ اختیار تھا کہ پہلے اپنی قربانی پیش کر کے صرف اجر شہادت حاصل کریں۔ یا بھائیوں کی شہادت کو مقدم کر کے صبر و ضبط کا بھی اجر لیں اور شہادت کا بھی۔

ایک ”بزرگ خاندان“ ہونے کی حیثیت سے یہ سوال بھائیوں کے بارے میں نہیں اٹھایا جاسکتا۔

یہ ذمہ داری حضرت عباس کے سر تھی۔ ان کے بھائیوں کے سر نہیں تھی۔ جس طرح اصحاب و انصار کی قربانی کا سوال امام حسین سے متعلق ہو سکتا ہے امام حسین کی قربانی کا سوال اصحاب و انصار سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔

مورخین و مؤلفین نے اس مقام پر ”حسن تعلیل“ کے دریا بہائے ہیں۔ طبری کا خیال ہے کہ یہ تقدیم میراث حاصل کرنے کے لئے تھی۔ حضرت عباس کے دوسرے بھائی لادلد تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ پہلے وہ قربان ہو جائیں تاکہ انکی میراث بھی مل جائے۔

ابو الفرج نے یہی تعلیل جعفر کی شہادت کے ذیل میں درج ہے۔ علامہ برغانی کا خیال ہے کہ یہ تقدیم اس لئے کی گئی تھی کہ کہیں میرے بعد شیطان انھیں گمراہ نہ کرے اور یہ شرف شہادت سے محروم ہو جائیں اس طرح آل ابو طالب کی بدنامی ہوگی اور حضرت عباس کے خاندان پر حزن آجائے گا۔

میرے خیال میں یہ تمام ترجیحات دور از کار اور بعید از قیاس ہیں۔ طبری ابو الفرج کا خیال تو انتہائی پھل ہے۔ اسکی مساعدت نہ اسلامی قانون پر مبنی ہے اور نہ ہاشمی اخلاص و کردار۔

اسلامی قانون کے اعتبار سے میراث کا نظام طبقاتی ہے اور ہر بڑے طبقہ کے ہوتے ہوئے چھوٹے طبقہ کو کوئی حصہ میراث نہیں ملتا۔

حالات صاف صاف اعلان کر رہے تھے کہ جو جس قدر زندہ رہے گا اسی قدر مصائبِ آلام کا شکار ہوگا۔

شہادت میں مصائب دنیا سے نجات اور اجرِ آخرت کا احتمال تھا اور زندگی میں مصائب و آلام کا سوال۔

مفاد پرستی اور خود غرضی کا تقاضہ یہ تھا کہ پہلے اپنی قربانی دی جائے تاکہ مٹا کر پڑیں۔ اور اجرِ آخرت بھی جلد ہی مل جائے۔ اور ایثار و اخلاص کا مطالبہ تھا کہ دوسروں کو مقدم کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ مصائب کا مقابلہ کیا جاسکے۔ اور منزلِ اجر میں ایثار کا ثواب بھی حاصل کیا جاسکے

صبح سے یہ اہتمام امام حسینؑ کر رہے تھے کہ اصحاب و انصار کی قربانی کو گھر والوں پر مقدم کر رہے تھے اور اب یہ اہتمام جناب عباسؑ کر رہے ہیں کہ اپنے بھائیوں کو مقدم کر کے جذبہٴ ایثار کا اظہار کر رہے ہیں۔

آپ کے الفاظ اس جذبہٴ ایثار کے مکمل آئینہ دار ہیں۔
 ”لَقَدْ مَوَّاهُ بِنَفْسِي أَنْتُمْ وَهَامُوا عَنْ سَيِّدِكُمْ حَتَّى تَهْوُوا دُونَهُ“
 (الاخبار الطوال)

”لَقَدْ مَوَّاهُ حَتَّى أَرَاكُمْ قَدْ نَصَحْتُمْ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ“
 ”لَقَدْ مَوَّاهُ حَتَّى أَرَاكُمْ قَتِيلًا، وَاحْتَسِبْتُ أَنْتُمْ لَا دَلَّ لَكُمْ“

”میرے شیرو! بڑھو تم پر میری جان قربان — اپنے مولا —

کی حمایت کرو اور جان دیدو۔“

بڑھو بڑھو! تاکہ میں اپنی آنکھوں سے خدا اور رسولؐ کے بارے میں تمہارا اخلاص دیکھ لوں۔

”بھیا بڑھو! تاکہ میں تمہیں خون میں آغشته دیکھ کر صبر کر سکوں
 تمہارے کوئی اولاد نہیں ہے۔ تمہارا غم مجھی کو اٹھانا ہے۔

طبری اور ابوالفرج کے اشتباہ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ روایت میں حضرت جعفر کے لادلد ہونے کا ذکر ہے۔

ان لوگوں نے خیال کیا کہ یہ تذکرہ میراث کے لئے زیادہ سازگار ہے۔
 طبری نے لفظ کو بدلا اور ”اراکم“ کے بجائے ”ارثکم“ نقل کیا۔
 اور ابوالفرج نے باقاعدہ تفصیل دی کہ حضرت عباسؑ کا مقصد جعفر کی میراث کا جمع کرنا تھا۔

علماء، مخلصین نے دونوں موزعین کی بالکل صحیح گرفت کی ہے اور ان غلطیوں کو بروقت طشت ازبام کیا ہے۔

اس طرح موزعین کے اخلاص کا بھی اندازہ ہو گیا اور انکی علمی خیانتیں بھی منظر عام پر آ گئیں۔

آقائے بزرگ لہرائی ظاہر شاہ کا خیال بالکل قرین قیاس ہے کہ روایت میں لفظ ”ارثکم“ رہا ہوگا جسے طبری نے ”ارثکم“ نقل کر دیا۔ وہاں مرثیہ پڑھنے کا تذکرہ تھا اور یہاں میراث کی فکر لگ گئی۔

یہ اور بات ہے کہ طبری کے بارے میں اتنی خوش فہمی بھی اس کے منصوبوں کی کامیابی کی دلیل ہے ورنہ یہ سورخ اعظم تو ابن عباسؓ کی داستانیں بھی تیار کر سکتا ہے۔
 نقلوں کی تبدیلی کا کیا ذکر ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں اس نکتہ کی مکمل وضاحت کی جا چکی ہے۔

قربان گاہِ وفا

حضرت عباسؓ علمدار تھے دفا کی قربان گاہ پر جو فریے پیش کئے ہیں۔ ان میں ان کے تین بھائی بھی ہیں اور دو بیٹے بھی۔

تقاضائے ایشاء کی بناء پر آپ نے پہلے بھائیوں کو شرف شہادت سے مشرف کیا۔ اس کے بعد بیٹوں کو میدان شہادت میں بھیجا۔ تاریخ و مقتل کے بیان کے مطابق آپ کے تین بھائی تھے۔ عبداللہ۔ عثمان۔ جعفر۔

عبداللہ کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ عثمان کی عمر ۲۵ سال اور جعفر کی عمر ۲۱ سال۔ جعفر حضرت امیر کی اولاد میں سب سے کمسن تھے۔ اس لئے کہ آپ کی شہادت ۴۰ھ میں واقع ہوئی تھی اور واقعہ کربلا ۶۱ھ میں ٹھیک ۲۰ سال کے بعد ہوا ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ مولائے کائنات کی شہادت کے موقع پر جعفر کی عمر صرف چند ماہ کی رہی ہوگی۔

آخری فرزند ہونے کے اعتبار سے آپ کو اس فرزند سے بے حد پیار تھا

اور اسی لئے آپ نے ان کا نام اپنے مرحوم بھائی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے جعفر رکھ دیا تھا۔

نام مولائے کائنات نے رکھا تھا۔ اور انجامِ مقدر نے معین کر دیا کہ جس طرح جعفر طیار راہِ خدا میں شہید ہوئے اسی طرح جعفر بن علی بھی راہِ خدا میں کام آگئے۔

حضرت عباسؓ نے حفظِ مراتب کے لحاظ سے سب سے پہلے عبداللہ کو میدان کی طرف روانہ کیا۔

آپ میدان میں آئے اور فوجِ دشمن کو لٹکا کر یہ رجز پڑھا۔
”انا بن ذی النجدة ذوالافعال“

ذات علی الخیر فی القفال
سیف رسول اللہ ذوالنکال

فی کل قوم ظاہر الافعال
ترجمہ: میں اس صاحبِ شرف و کرامت ”علی“ کا بیٹا ہوں

جو رسول اکرمؐ کی شمشیر بریں اور کائنات کا شہرہ آفاق مجاہد تھا۔
جذبہٴ صفی کے بعد اس زور کا حملہ کیا کہ پورے میدان میں آپ ہی آپ نظر آ رہے تھے۔

اربابِ مقاتل کا بیان ہے کہ آپ کے حملے چکی کی گردش کی طرح پورے صفِ کار زاد کو گھیرے ہوئے تھے۔

دشمن کے یہ حالات دیکھ کر حواس اڑ گئے اور اس نے چاروں طرف سے آپ کو گھیر لیا اور آخر میں ہانی بن شہیت حنفی نے سر اقدس پر ایک شدید ضرب لگائی جس کے نتیجے میں آپ شہید ہو گئے۔

کے کا زمانے واضح روشن ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ رسول طیب و طاہر
کے ابن عم تھے۔۔۔۔۔۔ میرا بھائی منتخب رزدار گار۔۔۔۔۔۔ اور
مردار صفار دکنبار ہے۔ اس کا مرتبہ رسول ممتاز اور ولی کردگار
کے بعد سب سے بلند ترقی بالا تر ہے۔

رجز پڑھنے کے بعد فوجوں کے درمیان درآئے اور جہاد میں مصروف ہو گئے۔ ناگاہ غولی بن یزید اصبحی نے ایک تیرمارا اور آپ گودے پر سنبھل نہ سکے۔ تیور کے خاک پر آئے۔ ابان بن دارم کے خاندان کے ایک شخص کو موقع مل گیا اور اس نے بڑھ کر آپ کا سر اقدس قلم کر لیا۔ (ناسخ، بکار)

حضرت عثمان کے بعد جعفر بن علی کی باری آئی۔ آپ اپنے بھائیوں میں سب سے اصغر لیکن جعفر طیار کے ہمنام و ہمسر تھے۔

سیدان جنگ کا رخ کرتے ہی فوج دشمن پر شدید حملہ کر دیا۔ اور زبان انبیا پر رجز کے یہ الفاظ تھے۔

« انى انا الجعفر ذو المعالى

ابن على خيرة النوالى
حسبى بعمى شرفنا وخالى

احمدی حسین ذالندی الفضال

توجہ :- میں صاحب مراتب جعفر ہوں۔ جو ادا کریم
 باپ علی کا فرزند۔ میرے شرف کے لئے میرے چچا اور مائیں
 ہی کافی ہیں۔

میں صائب کرم و فضل حسین کی طرف سے دفاع کر رہا ہوں۔

جہاد کرتے کرتے فوجوں میں گھر گئے۔ اور انی ابن ثبیت حضری نے موقع پا کر ایک داد کر کے آپکی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

بھائیوں کی شہادت کے بعد بڑا ہر حضرت عباس کے حوصلے پست ہو جانا چاہیے تھے۔ اور آپ کی بہت شکستہ ہو جانا چاہیے تھی۔ لیکن تاریخ کو بلا گواہ بے کر ایسا کچھ نہیں ہوا اور جیسے جیسے مجاہدین میدان میں کام آتے گئے سردار لشکر کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔

خدا کا شکر ہے کہ میرے بھائی راہ خدا میں کام آ گئے۔ مادہ گرامی کی تمنا پوری ہو گئی۔ اور میرے بھائیوں نے اپنے مولا کے قدموں پر جان قربان کر دی۔

انہیں حوصلوں کا نتیجہ تھا کہ بھائیوں کی لاش اٹھانے کے بعد فرزندوں کو تیار کر دیا۔ اور سب سے پہلے فضل کو نکلے سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دے کر مولا کے پاس بھیج دیا۔

بٹیا جادو چچا سے اجازت لے کر راہ خدا میں قربان ہو جاؤ۔ فضل نے اجازت چاہی۔ اور مولا نے حالات کے پیش نظر دل پر جبر کر کے اجازت دے دی۔

فضل نے میدان جنگ میں قدم رکھا اور اس شان سے رجز خوانی شروع کر دی۔

”اقسمت لو کنتم لنا اعدا دا

ومثلکم وکنتم فرادی

یا شرّ جیل سکنا البلادا

وشرّ قوم اظہروا الفسادا

سننک جہلمک شرا دا

ونرمی الرؤس عن الاجساد

”میں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ تم کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہو جاؤ۔ میرے اوپر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تم باشندگان دنیا میں بدترین نسل ہو۔ اور مفسدین عالم میں بدترین قوم ہو عنقریب میں تم کو متفرق کر دوں گا۔ اور تمہارے سردوں کو جسموں سے جدا کر کے پھینک دوں گا۔

رجز پڑھ کر دشمن پر حملہ آور ہوئے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں بکثرت دشمنوں کو تہ تیغ کر دیا۔

فوج دشمن کے ایک سردار نے یہ منظر دیکھا تو تڑپ کر میدان میں آیا۔ اور پکار کر کہا کہ یہ جوان بڑا بہادر معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کام میں تمام کروں گا۔ تین دن کے بھوکے پیاسے مجاہد پر ایسے زبردست پہلوان کا حملہ۔ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ فضل نے لاکھ سنبھلنا چاہا لیکن ظالم نے ایسی تلوار لگائی کہ بچہ گھوڑے سے گر کر خون میں لوٹنے لگا۔ امام حسینؑ کو آواز دی۔ چچا غلام کی خبر لیجئے۔ امام حسینؑ نے یہ عالم دیکھا تو زار و قطار رونے لگے اور بھتیجے کی لاش کو میدان سے لاکر گنج شہیداں میں لٹا دیا۔

بھائی کا یہ حال دیکھ کر قاسم بن عباسؑ کو حلال آگیا۔ جو شجاعت میں میدان میں آ گئے اور آواز دی۔ دشمنو! ہو شیار ہو جاؤ۔ اب رسول اکرمؐ کا غلام اور اسلام کا مجاہد آ رہا ہے۔ یہ کہہ کر حملہ کیا اور اسی دشمنوں کو فی النار کر دیا۔ پلٹ کر امام حسینؑ کی خدمت میں آئے اور شدت

عطش کا تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا بیٹا جاؤ عنقریب تمہارے جد بزرگوار تمہیں سیراب کر دیں گے۔

قاسم پلٹ کر میدان میں آئے اور جہاد شروع کر دیا۔ ۲۰ سواروں کو تہ تیغ کیا اور بالاخر شہید ہو گئے۔ امام حسینؑ نے اپنے عزیز فرزند کو گنج شہیدان میں لا کر لٹا دیا

نور العین ص ۶۱ مائتین ص ۴۷

فوجوں کے بادل اور ہاشم کا چاند

بھائیوں اور فرزندوں کی شہادت کے بعد جناب عباسؑ کے لئے آخری قربانی کا مرحلہ آگیا۔

اگر باب مقاتل میں اس شہادت کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس کا موقع و محل کیا تھا۔ اور حضرت عباسؑ نے کس موقع پر اپنی قربانی پیش کی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت علیؑ اکبر پہلے شہید ہوئے اور آپ ہاشمیوں میں آخری شہید ہیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ حضرت علیؑ اکبر سے پہلے درجہ شہادت پر نازل ہو گئے تھے۔ اور اسی لئے امام حسینؑ نے خیمہ گاہ کا رنج کر کے بنی ہاشم کے بچوں کو

آواز دی تھی کہ علیؑ اکبر کی لاش اٹھانے میں مدد کریں۔

بہر حال علیؑ اکبر شہید ہو چکے تھے۔ تو بھی حضرت عباسؑ کے بھیم پر یہ عظیم راز تھا۔ کہ میں زندہ ہوں اور جان برادر دنیا سے رخصت ہو گیا ہے اور اگر علیؑ اکبر موجود تھے تو بھی یہ ایک نازک مرحلہ تھا کہ چپا بھتیجے کو قربان ہونے دے۔ یا بھتیجے چچا کی شہادت کا منظر دیکھتا رہے۔

ایشیائے شرق کے تقاضے معلوم ہیں۔ لیکن طرفین کی ہمت اور دونوں کا غم و غمزدگی کا کوئی فیصلہ کرنے سے مانع ہے۔ مصالحہ امامت کیا ہیں۔ اور قربانی راہ خدا کیا چاہتی ہے۔ اس کا اندازہ نہ کسی مورخ کو کر سکتا ہے اور نہ کسی مولف کو

حالات کی نوعیت سے کچھ فیصلہ کیا جاسکتا تھا لیکن وہ بھی انتہائی پیچ در پیچ ہیں۔

یہ بہر حال مسلم ہے کہ جب جناب عباسؑ نے میدان کا ارادہ کیا تو جنگ کی پوری مشینری حرکت میں آگئی ہوگی۔ اور فوجوں نے از سر نو اپنے آپ کو آمادہ کر لیا ہوگا۔

فوج دشمن کے سامنے عباسؑ کے بارے میں چند اہم مسائل تھے۔

۱۔ یہی وہ مجاہد ہے جس نے ۹۰ سال کی عمر میں صفین کے میدان میں دشمنوں کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔

۲۔ اسی مجاہد کے کمن شاگردوں نے بڑے بڑے پہلوانوں کو تہ تیغ کر دیا ہے۔

۳۔ اسی کے ایک ایک بھائی اور ایک ایک فرزند نے سیکڑوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

۴۔ یہی عباسؑ فوج حسینی کا سردار و علمبردار ہے اور اسی سے فوج کا بھرم قائم ہے

- ۵۔ اس کے خاندانی سابقہ شجاعت ہی شجاعت اور بہت ہی ہمت کے ہیں۔
- ۶۔ یہ اپنی بات کا ایسا دھنی ہے کہ تین دن کی پیاس کے باوجود "امان نامہ" کو ٹھکرا دیتا ہے اور حاکم وقت پر لعنت بھی کرتا ہے۔
- ۷۔ اس سے حسین کی کمر مضبوط اور ان کا بازو طاقتور ہے۔
- ۸۔ یہ حیدر کو ار کے بیشہ شجاعت کا شیر اور بنی ربیعہ کی یادگار ہے۔
- ۹۔ اس نے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر معمولی سے حملے میں فرات کے پہرے کو توڑ دیا تھا اور دریا پر قبضہ کر لیا تھا۔
- یہ تقورات اور خیالات فوج دشمن کو بوکھلا دینے کے لئے بہت کافی تھے۔
- چنانچہ جیسے ہی دشمنوں کو یہ اندازہ ہوا کہ اب عباس کے آنے کی باری ہے پوری فوج میں ہلچل مچ گئی۔
- حالات و کیفیات سے آنکھ بند کر کے صرف کتابوں کے مذکورات پر اعتماد کرنے والے ایک ایک لفظ کے لئے حوالہ تلاش کرتے ہیں لیکن سیاسی بصیرت رکھنے والے اور جنگی حالات کا اندازہ کرنے والے یہ جانتے ہیں کہ ایسے مواقع پر فوج دشمن کا کیا عالم ہوگا۔
- عجب نہیں ہے کہ ابن سعد نے پوری فوج میں اعلان کرادیا ہو کہ خبردار۔
- ہوشیار۔۔۔۔۔ حیدر کو ار کا شیر اور حسین کا علمدار آ رہا ہے۔
- عباسؑ زندہ و سلامت میدان سے جانے نہ پائیں۔ یہ زندہ رہ گئے تو اپنی فوج کی زندگی کا کوئی امکان نہیں ہے۔
- دشمن کا دل دھڑک رہا ہے اور جنگ کی آخری تیاریاں ہو رہی ہیں۔
- اور ادھر ۳۴ سال کا بہادر شیر بولا کی خدمت میں سر جھکائے کھڑا ہے۔

"آقا اجازت ہے۔"

امام حسینؑ حالات کی نزاکت کا مکمل اندازہ کر کے عظمت عباسؑ پر ان حسین لفظوں میں تبصرہ فرما رہے ہیں۔۔۔۔۔ "بھیا تم سردار لشکر ہو۔ سردار کے بعد لشکر کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔"

عباسؑ نے موقع پا کر داہنے بائیں دیکھا۔ اور سر جھکا کر خاموشی سے عرض کیا۔ "مولادہ لشکر کہاں ہے جس کا میں سردار ہوں۔"

امام حسینؑ کے دل پر چوٹ لگی۔ فرمایا۔ بھیا۔ لشکر تو تمام ہو گیا ہے۔ اب فقط سردار ہی باقی رہ گیا ہے لیکن اگر جانا ہی چاہتے ہو تو بچوں کے لئے پانی کا انتظار کرو۔

۲۹۔ جلا العیون مث۔

آپ نے یہ فرمان سنا اور فوراً درخیمہ کا رخ کیا۔۔۔۔۔ آواز دی۔ بچو ! مشکیزہ لاؤ۔ اب عباسؑ پانی کے لئے جا رہا ہے۔۔۔۔۔ سکیئہ دوڑ کر آئی۔

عرض کی۔۔۔۔۔ بچا جان، آپ پانی کے لئے جا رہے ہیں ! اور یہ کہہ کر جلدی جلدی مشکیزہ لائی اور لا کر چچا کے حوالے کر دیا۔ عباسؑ مشکیزہ لے کر چلے۔

ایک مرتبہ امام حسینؑ نے آواز دی۔ بھیا۔ اہل محرم سے آخری مرتبہ رخصت ہو کر آؤ۔ عباسؑ جیسے میں گئے۔ بچوں کو الوداع کہا۔ خدرا ت سے رخصت ہوئے اور مشک و علم لیکر میدان کی طرف روانہ ہو گئے۔

دل بکا رہا ہے۔۔۔۔۔ مالک ! مولائے سانسے عزت رکھ لینا۔ پروردگار بچوں کی آس نہ ٹوٹنے پائے۔۔۔۔۔ میرے پالنے والے۔۔۔۔۔ اوفنا کی آبرورکھ لینا۔

خیمہ نے کل کر میدان میں قدم رکھا تھا کہ ایک مرتبہ فوجیں گھر کر آگئیں۔۔۔۔۔ چاروں طرف سے محاصرہ ہو گیا۔۔۔۔۔ اب فوجوں کے بادل تھے اور ہاشم کا چاند

عباسؑ کے نفسِ مطیئیں پر ان انتظامات کا کوئی اثر نہیں تھا۔ مشکیزہ علم سے باندھ لیا تھا تاکہ پوری فوج ارادے سے باخبر ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ شیر کو ترائی کی طرف جانا ہے۔ ————— مقدار بچوں کے لئے پانی لینے جا رہا ہے اب جسے روکنا ہے وہ راستہ روکے ۔

دشمن نے غم عباس کو دیکھا۔۔۔۔۔ اور ہاتھ میں صرف نیزہ دیکھا۔
اب کیا دھا۔ ایک طرف سے حملہ کے لئے تلواریں بڑھیں۔ دوسری طرف فرات کے پہرہ
داروں کو ہوشیار کیا گیا۔
شیر کے سامنے بیک وقت دو مسائل پیدا ہو گئے۔ دشمنوں کو ہٹائے تو کس طرح
اور دریا تک جائے تو کس طرح۔

یہ جرأت و بہمت کا کمال تھا کہ نیرو سے فوجوں کی ڈھکیلٹے ہوئے آگے بڑھتے گئے اور ایک مرتبہ فوجوں سے خطاب کر کے فرمایا۔

«أَدَأَنْتُمْ كَفْرًا أَمْ مُسْلِمُونَ. هَلْ يَجُوزُ فِي
دِينِكُمْ أَنْ تَمْنَعُوا الْحُسَيْنَ وَأَطْفَالَهُ مِنْ شَرْبِ الْهَاءِ
وَالْكَلَابِ وَالْخَنَازِيرِ يُشْرَبُونَ مِنْهُ وَالْحُسَيْنُ وَ
أَطْفَالُهُ يَمُوتُونَ عَطَشًا أَمَا تَذْكُرُونَ عَطَشَ
الْقِيَامَةِ»

(النزاع الشهادة ٥٥)

تو جواباً :- ” تم لوگ کافر ہو یا مسلمان ————— تمہارے دین میں یہ جائز ہے کہ کتے اور سور دریا کا پانی پیتے رہیں اور امام حسینؑ اور ان کے بچوں پر پانی بند کر دیا جائے۔ کیا تمہیں قیامت کی پیاس یاد نہیں ہے؟“

”یہ ساقی کوثر کا لال ہے۔ اس سے تمہاری عاقبت و آخرت وابستہ ہے۔ تمہیں اس کی آمد سے اختلاف ہے تو راستہ چھوڑ دو۔ یہ کسی دور دراز ملک روم یا ہند وغیرہ چلا جائے اور تمہارا اعراق و حجاز حالی کر دے۔“ (بیچ الاخوان ص ۱۶۳)

دشمن نے اس تقریر پر کوئی توجہ نہ دی۔ اور چاروں طرف سے حملے جاری رہے۔ آخر کار عباس نے بھی ایک شیرازہ حملہ کیا اور دریا کی بلندی پر قبضہ کر لیا۔ ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کر دشمن کو اپنے قبضہ سے خبردار کیا۔ اور فرات کے پہرہ داروں کو آواز دی کہ اب دوسرا قدم فرات میں ہو گا۔ جسے راستہ روکنا ہے آگے بڑھے۔ دشمن نے چاروں طرف سے گھیرا ڈالا۔ اور چار ہزار فوجوں نے فرات کے محاصرہ کو مضبوط کر دیا۔ عباس نے صورت حال کو دیکھ کر رجز شروع کیا۔

اُقَاتِلْ الْكُفْرَ مَا يَقْلِبُ مَهْتَدٍ

أَذْبُتْ عَنْ سَيْطَانِ النَّبِيِّ أَحْمَدِ
أَضْرِبْكُمْ بِالصَّارِمِ الْمُهْتَدِ
حَتَّى تَحِيدُوا عَنْ قِتَالِ سَيِّدِي
إِنِّي أَنَا الْعَبَّاسُ ذُو التَّوَدُّدِ
نَجِلْ عَلَى الْمُؤْتَفَى الْمُرِيدِ

”میں ایک ہدایت یافتہ دل کے ساتھ اس قوم کے ساتھ جنگ

کر رہا ہوں اور سبط بیغیر سے دفاع کر رہا ہوں۔ میں تمہیں اس رت
 تک تہہ و تیغ کرتا رہوں گا جب تک میرے آقا سے جنگ کرنے سے
 باز نہ آجاؤ۔ میں صاحب موزت عباسی ہوں۔ میرا بابا علی شرفی ہے
 جسکی تائید قدرت نے کی ہے

رجز کے بعد صرف ایک مرحلہ رہ گیا تھا کہ گھوڑے کو اڑ لگائیں اور فوجوں کے حصار کو توڑ کر فرات میں داخل ہو جائیں۔

لیکن ایک پیاسے کے لئے یہ کام آسان نہیں تھا۔ مثل مشہور ہے۔ ”پانی دیکھ کر پیاس بھڑک اٹھتی ہے۔“

عباس پیاسے تھے اور کیسے پیاسے۔ تین دن کے پیاسے۔ ایسے پیاسے جس کی پیاس کو زمین کی گرمی۔ آفتاب کی تازات۔ زخموں کی کثرت۔ بچوں کی فریاد۔ اسلحہ کی تپش۔ ہوا کی سوزش۔ آگ کی حرارت اور مجاہدوں کی شہادت نے وہ چند کر دیا تھا۔

ایسے پیاسے کو دریا نظر آجائے تو پیاس کا عالم کیا ہو گا؟ اس کی صحیح تصویر یہ

ہے۔ ۹۰

ستے کا جگر پھٹکتا ہے ساحل کی ہوا سے

پانی میں جو اترے گا تو اٹھے گا دھواں اور

اتنی شدید دشتاریوں کے باوجود عباس نے ایک شیرانہ حملہ کیا اور فوجوں کو ڈھکیل کر فرات تک پہنچ گئے۔ دفعۃً ہلکی خنکی کا احساس ہوا تو جھک کر دیکھا کہ گھوڑا فرات میں گھر رہا ہے۔ فوراً اتر پڑے اور مشکیزہ کو پانی میں ڈال دیا۔ کئی دن کا خشک مشکیزہ کافی دیر تک تر ہوتا رہا۔ اس کے بعد غازی نے اسے بھر اور دوش پر رکھ کر دریا سے نکل آیا۔

ابابہ مقابل کا بیان ہے کہ اس دوران میں عباس نے چلو میں پانی بھی لیا اور ایک برتہ امام حسینؑ اور ان کے بچوں کی پیاس کو یاد کر کے پھینک دیا۔ بتاریخ اور مقتل کو اتنا ہی بیان کرنے کا حق ہے جتنا مشاہدہ میں آیا ہے۔ ارادوں کی تحدید کرنا ان کے حدود بیان سے باہر ہے۔

یہ بہر حال صحیح ہے کہ عباس نے پانی لے کر پھینک دیا۔ لیکن یہ بات کہ پینے کا ارادہ کیا اور بچوں کی پیاس یاد آگئی اس لئے پھینک دیا۔ کسی طرح قریبی عقل نہیں ہے۔

عباس جیسا زندہ انسان اور پینے کا ارادہ کرے؟ معاذ اللہ

بات صرف یہ تھی کہ عباس نے چلو میں پانی لے کر ایک مرتبہ پھر فوج دشمنوں کو متوجہ کر دیا کہ تم نے اپنی بساط وحیثیت دیکھ لی۔ آج پھر فرات میرے قبضہ میں ہے۔ نرید اور اس کے لشکر کی کیا ہستی ہے۔ ہم نے یہ دریا اس کے باپ سے چھین لیا تھا۔

اب یہ اور بات ہے کہ ہم پانی پیئیں گے نہیں۔ پانی پینا ہوتا تو تمہیں دریا سے سبھا چلے ہوتے۔

ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ تمہاری شقاوت کا سلسلہ کب تمام ہوتا ہے اور تم ہمارے لئے پانی کو کب مباح کرتے ہو۔ جب تک تم از خود پانی سے قبضہ نہیں بٹاؤ گے ہم اپنی مظلومیت کا منظر ہر کرتے رہیں گے۔ اور تمہارا ظلم یونہی بے نقاب ہوتا رہے گا۔ چلو سے پانی پھینک کر دریا سے باہر آئے تو زبان پر یہ فقرات جاری کئے۔

يَا نَفْسُ مِنْ بَعْدِ الْحُسَيْنِ هُوَ نِي

فَبَعْدُ لَا كُنْتَ أَنْ شَكُوْنِي

هَذَا الْحُسَيْنِ شَارِبِ الْمُنُونِ

وَتَشْرِبُ مِنَ الْبَارِدِ الْمَوْعِينِ

مِنْهَا مَاتَ مَا هَذَا فَعَالَ دِينِي

وَلَا فَعَالَ صَادِقِ الْيَقِينِ

”اے نفس حسین کے بعد زندگی کا کیا لطف۔ ایسی زندگی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہ حسین موت کا جام پئیں اور تو ٹھنڈا پانی پئے۔ یہ نہ دین کا طریقہ ہے اور نہ کسی صادق الیقین انسان کا طریقہ عمل۔“

غیمہ کا رخ کیا۔ دوش پہ مشک سکینہ۔ ہاتھ میں علم۔ گھوڑے پر سوار۔ تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ دل میں صرف ایک جذبہ ہے کہ پانی خیاام حسینی تک پہنچ جائے۔ اور زربلب ایک دعا ہے کہ مالکِ عباسی کی حسرتوں پر پانی نہ بھرنے پائے۔ اور میں بچوں کے سامنے سرخرو ہو جاؤں۔ عباس کا برصا تھا کہ بھاگی ہوئی فوجیں پلٹ پڑیں۔ چاروں طرف سے محاصرہ ہو گیا۔

دشمن کو ایک فکر تھی کہ پانی خیاام حسینی تک نہ پہنچنے پائے۔ اور عباس کی صرف ایک تمنا تھی کہ پانی غیموں تک پہنچ جائے۔ موقع کی نزاکت کو دیکھ کر تیر اندازوں کو آگے بڑھا دیا گیا۔ اور کانیں دوش سے اتر آئیں۔ ترکش سے ترچھلنے لگے اور دشمن نے یہ منصوبہ بنا لیا کہ اس قدر تسیر برسائے جائیں کہ مشک میں پانی نہ رہ جائے اس کے بعد عباس خیمے کی طرف چلے بھی جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ عباس نے لداکار کر یہ رجز پڑھا۔

لا اصرہب الموت اذا موت و فی
حتی ادا ری فی المصالیات لقا

نفسی لنفیس المصطفی الطہور ق
انی انا العباس اغذ و بالسقاه

ولا اخاف الشر لیم الملتقی

”موت لاکھ سر پر آجائے، میں موت سے ڈرنے والا نہیں۔ تہہ خاک دفن ہو یا نامیرے لئے کوئی ہیبت ناک بات نہیں ہے۔ میرا نفس امام کے نفسِ اقدس کی سپر ہے۔ میں عباسی ہوں عباسی سقائی میرا کام ہے اور میدانِ جنگ سے نہ ڈرنا میرا شعار۔“

اور پھر ہر خطرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مشک سکینہ میں تادیر پانی محفوظ رہا۔ لیکن اس کی حفاظت میں عباسی پر کیا گزر گئی۔ اس کا اندازہ کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

تیروں کا مینہ برستا رہا اور مجاہد میدان کی منزلیں طے کرتا رہا۔ کون حساب کر سکتا ہے کہ اس درمیان میں عباسی کے جسمِ اقدس میں کتنے تیر پہوست ہو گئے اور غازی کا بدن کس قدر زخمی ہو گیا۔

یہ ضرور ہے کہ ابھی تک عباس کو اپنے زخموں کا احساس نہیں ہے۔ اور دشمن ”احساسِ شکست“ سے تباہ ہو ا جا رہا ہے۔ شیر کے قدم بڑھتے جا رہے ہیں اور فوجِ دشمن کی آس ٹوٹی جا رہی ہے۔

آخر کار فوجِ دشمن نے یہ طے کیا کہ جب تک عباسی کے ہاتھ سلامت رہیں گے ان کا راستہ روکنا مشکل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے ان کے ہاتھ قلم کر دیئے جائیں لیکن سوال یہ ہے کہ شیر کے سامنے آئے کون؟ اور حیدر کمرار کے لال کا مقابلہ کون کرے؟

مکر و فریب کی دنیا میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔ اس کے وسائل

(نسخ ۶ ص ۳۹۱ نور العین ص ۵۸)

لیکن یہ عباس کا دل دھجکا تھا کہ ایسے معیبت کے وقت میں بھی مایوسی کا شکار نہیں ہوئے اور اسی بہت و غم کا اعلان کرتے رہے۔
 "یا نفس لا تخشی من الکفار"

مع النبي السيّد المختار

فاصلهم يا رب حر الناس

”خدا کی قسم اگر تم نے میرا ہنا ہاتھ قلم کر دیا ہے تو یاد رکھنا

ابن سعد نے یہ منظر دیکھا تو کمال حیرت و استعجاب اور شدت و وحشت و درہشت میں فوج کو آواز دی۔

”عباش کو روکنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ مشک پر تیر برسائے جائیں جب تک مشک میں پانی رہے گا یہ بہر حال آگے بڑھتے رہیں گے۔“

حکم کا ملنا تھا کہ چاروں طرف سے تیروں کا مینہ برسنے لگا۔ ایک تیر سینہ اقدس میں لگا۔ ایک آنکھ میں پیوست ہوا لیکن عباش کے حوصلوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ناگاہ ایک تیر مشک سکینہ پر لگ گیا اور پانی بہنے لگا۔ پانی کا بہنا تھا کہ عباش کا دل ٹوٹ گیا۔

پشت فرس پر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ سر کا جھکنا تھا کہ ایک ظالم نے اس زور سے ایک گز مارا کہ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے اور زمین کی ٹال ہو گرتے گرتے با آواز بلند مولا کو پکار کر کہا۔

”عَلَيْكَ مِنَ السَّلَامِ يَا أَبَا عَبْدِ اللَّهِ“ ”يَا أَخَا الْأَدْنَى أَخَا“
”بھیا بھائی کی خبر لیجئے۔“

اتنا کہا اور خاک پر آ گئے۔ امام حسینؑ کے کانوں تک عباش کی یہ آواز پہنچی تو آپ کمر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ آواز دی۔

”أَلَا إِنَّكَ لَتَظْهَرِي دُقْلَتِي حَيْلَتِي وَشَيْبَتِي عِدْوِي“
”بھیا اب میری کمر ٹوٹ گئی اور راہ پارہ و تند بیرسرد ہو گئی اور دشمن طعنہ دینے لگے۔“

امام حسینؑ کے پر تاثر کلمات نے عباش کے دل پر کیا اثر کیا اس کا ایک بارنا مجاہد ہی اندازہ کر سکتا ہے۔
کاش کسی کے پہلو میں ویسا ہی حساس دل ہوتا تو سوچتا کہ جب امام مظلوم نے

اپنی مکیسی کا اظہار کیا ہو گا۔ اور یہ فرمایا ہو گا۔ کہ عباس دشمن مجھے طعنہ دے رہے ہیں حسینؑ تمہارا علمدار کہا ہے حسینؑ تمہارا وفادار سردار کہاں ہے؟ تو عباس کے دل پر کیا گزری ہو گی۔ اور بے بسی کے حساس نے جسم اقدس کو کس طرح تڑپایا ہو گا۔
زخموں کے بعد ہر شہدائے دوحاس کا سلامت رہنا عباش ہی جیسے دل و جگر داغ کا کام ہے۔

سینے میں تیر آنکھ میں تیر، سر پر گرز، مغز سر پارہ پارہ۔ شانے کٹے ہوئے اور اس کے بعد اس قدر باہوش کہ امام کی تشریف آوری پر باہمی اخلاق اور اسلامی آداب کا مکمل مظاہرہ ہو رہا ہے۔

امام حسینؑ نے مجاہد کی آواز سنی اور میدان کا رخ کیا۔ ٹوٹی ہوئی کمر، میدان کا راستہ۔ دشمنوں کا زرعہ، راستہ کیوں کر طے ہو اور امام مظلوم کیسے مزے پہنچے یہ سب محفوض قلب و نظر اور حساس ترین دل و جگر کے طالب ہیں۔
راستہ میں عباس کے دونوں ہاتھ کھینچے اور آپ نے گھوڑے سے اتار کر انھیں

سینے سے کھینچ لگایا۔ (ذکر العباس بحوالہ موع النعم ۲/ ۴۷)

علامہ شیخ جعفر شوستری نے اس روایت پر اعتراض کیا ہے کہ بغیر انسانی اعتبار سے حضرت عباسؑ فرات سے واپس آ رہے تھے اور امام حسینؑ فرات کی طرف جا رہے تھے۔ ایسی حالت میں پہلے حضرت عباسؑ سے ملاقات ہونی چاہیے تھی۔ اس کے بعد ان کے ہاتھوں تک پہنچنا چاہیے تھا۔ یہ معاملہ کیسے برعکس ہو گیا۔
مقابل کے بیان کے مطابق پہلے ہاتھ قلم ہوئے ہیں۔ اس کے بعد شہادت واقع ہوئی ہے۔

لیکن یہ تصور مزید بغیر انسانی ملاحظات سے پیدا ہوا ہے۔ کاش اس میں دفاعی تقاضے اور عباسؑ علمدار کی وصیت کو شامل کر لیا جاتا تو یہ خیال نہ پیدا ہوتا۔

دعا کا شدید تقاضا بھی تھا کہ اب خیمہ کا رخ نہ کیا جائے۔ مشک کا پانی تو بہہ چکا ہے۔ اب خیمہ میں جا کر کیا کریں گے۔

عباش کے احساس کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ امام حسین سے وصیت کے دوران فرمایا کہ مولا! میری لاش کو خیمے میں نہ لے جائے گا۔ مجھے سکینہ سے شرم آتی ہے۔ بھلا وہ دغا دار جو مرے کے بعد بھتیجی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا وہ زندگی میں خیمہ کی طرف کس طرح جائے گا؟

عقل و منطق کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ مشک کے پانی کے بہنے کے بعد عباس نے گھوڑے کا رخ موڑ دیا جو گاؤں پھر فرات کی طرف واپس ہو گئے ہوں گے۔ اسی لئے امام مظلوم نے پہلے آپ کے ہاتھ دیکھے اسکے بعد حیم اندر تک پہنچے۔ امام حسین کے نفسیاتی تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے عباس کے مصائب پر بھی نظر کرنا ہوگی۔ جو لاتعداد زخموں کے ماسوا عباس کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ دونوں ہاتھ قلم ہو چکے ہیں۔ سر زخمی ہے اور مغز سرد پارہ ہو چکا ہے۔ ایسے میں جو انسان گھوڑے سے گرے گا اس کا کیا عالم ہوگا۔ نہ ہاتھ ہیں نہ زمین پر ٹیک سکے۔ نہ سر سلامت ہے کہ اس کا سہارا لے سکے۔ مجاہد ہے اور مظلومیت شہید راہ خدا ہے اور بیکسی۔

زمین لرز گئی ہوگی۔ آسمان ہتھرا گیا ہوگا۔ قرعہ کو زلزلہ ہوگا۔ دل ام البنین کانپ رہا ہوگا۔ اور روح زہرا فریاد کر رہی ہوگی۔ میرے لال کے دغا دار بہادر۔ میرے عباس تیرے اوپر کیا گزر گئی۔

کاش زہرا کر بلا کے میدان میں جوتی تو تجھے اپنی گودی میں جگہ دیتی۔ عباس کا یہ صدمہ معصومین کے دلوں کو ہمیشہ تڑپا مارا اور بیمار کر بلا زیارت کے موقع پر فرماتے رہے۔ "اَشْمَدُ آفَاتٍ تَلَّتْ مَظْلُومًا"

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ بڑی مظلومیت کے ساتھ شہید کئے گئے۔"

امام حسین بھائی کی آواز پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے سر ہانے پہنچے۔ سر زانو پر رکھا۔ دونوں میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ نے فرمایا۔

عباش! کوئی وصیت؟ کوئی تمنا؟ کوئی آرزو؟

عرف کی! مولا۔ ایک آرزو ہے کہ وقت آخر آپ کی زیارت کر لوں۔ لیکن کیا کروں کہ ایک آنکھ میں تیرے پوسٹ ہے اور دوسری آنکھ میں خون جم گیا ہے۔ دیکھنے سے بالکل مجبور ہوں۔

امام حسین نے خون کو صاف کیا اور عباس نے جمال امامت کی زیارت کی اور وصیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مولا! میری لاش کو خیمے میں نہ لے جائے گا مجھے سکینہ سے شرم آتی ہے میں نے بھتیجی سے پانی کا دعوہ کیا تھا اور اسے دانا نہ کر سکا۔

امام حسین سر جھکا لے بیٹھے رہے۔ چند لمحے گزرے تھے کہ آخری ہچکی آئی اور عباس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا کو چھوڑ دیا۔

بیکسی نے مرثیہ پڑھا۔

اليوم نه مت اعين بلك لمر تتد

وتسعدت اخري فخر من دها

"عباس آج وہ آنکھیں سو گئیں جو تیری ہیبت سے نہ سو سکتی تھیں

اور وہ آنکھیں بیدار ہو گئیں جن کا اب سونا شکل ہے"

امام حسین اٹھے اور لاش عباس کو فرات کے کنارے چھوڑ کر خیمہ کا رخ کیا۔

ادھر اہل حرم انتظار میں تھے کہ عباس آ رہے ہوں گے۔ بچے مچل رہے تھے کہ پانی آ رہا ہوگا۔ سکینہ بچوں کو تسکین دے رہی تھی کہ اب پانی ضرور آئے گا۔ اب میرا بچا پانی لیتے گیا ہے کہ اچانک درخیمہ پر مولائی آواز آئی۔

سکینہ دوڑ کر دروازے تک پہنچی۔ خیمہ کا پردہ اٹھایا۔ کیا دیکھا کہ بچا کے بجائے بابا کھڑے ہیں۔ دوڑ کر قدموں سے لیٹ گئی۔

”یا ابا! ہل نہ! علم بعسی العباس۔“

بابا کیا آپ کو چچا عباس کا کچھ علم ہے؟ انھوں نے بڑی دیر لگا دی ہے وہ مجھ سے پانی کا دھرہ کر کے گئے تھے۔ میرا بچا بے وقاف نہیں ہے۔

امام کے جگر پر خنجر چل گیا۔ بچی سے کیا کہیں۔ اور کیا کہہ کر تسلی دیں۔
مظلومیت نے پکار کر کہا۔ سکینہ اب چچا کا ذکر نہ کرو۔ چچا فرات کے کنارے ابدی میند سو رہا ہے۔

شانِ جہاد

ادیاب مقابل نے جناب عباس کے اندازِ جہاد کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ کے شہرین کے اعداد و شمار کو بھی جمع کیا ہے۔ اور اس کی پوری تفصیل بھی درج کی ہے کہ کس طرح پر کس عالم میں اور کس قدر افراد کو وصلِ جہنم کیا ہے؟

فرات سے پہلے فرات کے بعد۔ شانے قلم ہونے سے پہلے اور شانہ لہم ہونے کے بعد۔ طادیہ گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے اور طادیہ پر سوار ہونے کے بعد وغیرہ

یہ مجموعی تعداد علامہ اسفرائینی اور علامہ در بندہ کے بیان کے مطابق ڈھالی

ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ جب کہ ملا جعفر تبریزی مرحوم کے بیان کے مطابق ”لیلۃ الہریرین“ امیر المومنین کے مقتولین کی تعداد صرف ۵۳۳ تھی۔

۱۵۸۰ء

ظاہر ہے کہ ان اعداد و شمار پر مکمل طور پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ میں درج ہو جانا اس کے مستند اور سند ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ درایت و منطق بھی ایک چیز ہے۔ ”لیلۃ الہریر“ کی گھسان کی لڑائی میں رات کے وقت مقتولین کا شمار کر لینا محض مورخ کے بس کی بات ہے اور نہ کسی رپورٹر کے امکان کی۔

گر بلا میں بھی حضرت عباس کے جہاد سے چھائی ہوئی ہیبت اور اڑے ہوئے حواس میں کسے فرصت و سمیت تھی کہ وہ مقتولین کے اعداد و شمار جمع کرانے اور دیکھی اس تفصیل کے ساتھ کہ کس مقام پر کس عالم میں کتنے افراد قتل کیا گیا ہے یہ صرف ایک اندازہ ہے جو حقیقت سے کہیں کم ہے۔ دشمن یوں بھی مقتولین کی تعداد کو چھپا دیا کرتے ہیں۔ پھر رپورٹر کو انھیں افراد کی اطلاع ہو سکتی ہے جن کی لاشیں غلت میں سامنے آگئیں ان کا شمار کیا جاسکا۔

مختلف حالات کے مقتولین کی تعداد کا تعین مقاماتِ قتل کے اعتبار سے ہوا ہوگا کہ مجاہد فلال حالت میں فلال مقام پر تھا اس لئے یہ مقتولین کا ڈھیر اس حالت کے مقتولین کا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ تین دن کا بھوکا بیاسا انسان۔ زخموں سے چور۔ حالات سے شکستہ دل اور بے دست و بازو ہونے کے بعد بھی کتنی ہیبتِ مردانہ سے جہاد کرتا رہا اور دشمنوں کو مسلسل موت کے گھاٹ اتارتا رہا۔

امیر المومنین کے مقتولین سے موازنہ اس لئے بھی نامناسب ہے کہ آپ الہامِ وقت

اور صاحب علم غیب تھے۔ آپ کی ذمہ داریاں دوسرے کسی بھی مجاہد سے کہیں زیادہ مختلف اور کہیں زیادہ بالاتر تھیں۔

آپ کی جلالت و ہمت کا معیار مقتولین کی تعداد نہیں ہے بلکہ وہ انداز قتل ہے جس میں ستر ستر پشت کے موئین کا خیال رکھا جاتا تھا اور نسلوں میں آنے والے صاحبِ ایمان کی خاطر مقابلہ پر آنے والوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں امام حسین کا نام یقیناً لیا جاسکتا ہے کہ آپ بھی ان تمام مراتب و خصوصیات کے حامل تھے۔ اور آپ کے مقتولین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔ جبکہ امام زین العابدین کا بیان ہے کہ میرے بابا ایک شخص کو قتل کرتے تھے اور ایک کو اس کی نسل کی بناء پر چھوڑ دیتے تھے۔

ہر زور پر آجانے والے کو قتل کر دینا غیر لائق اور غیر معصوم کا کام ہے اور نسلوں کا لحاظ کر کے تو اور اٹھانا امام معصوم کی ذمہ داری ہے۔ پھر بھی کربلا میں موت کی ایسی گرم باز آئی تھی کہ بنی ہاشم کا کسمن بچہ بھی آیا ہے تو دس بیس کو تہہ دیخ گئے بغیر دنیا سے رخصت نہیں ہوا۔

عباس تو بہر حال عباس تھے۔ ان کی ہمت و ہمت اور ان کی طاقت و شجاعت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

افسوس کہ لڑنے کی اجازت نہ ملی
وزنہ در کوفہ در خیبر ہوتا

وصیت :-

مقاتل میں جناب عباس کی یہ وصیت بھی درج کی گئی ہے کہ بھیا! میرے لاشے کو خیمے میں نہ لے جائیے گا۔ مجھے سکینہ سے شرم آتی ہے۔

علمائے اسلام نے اس وصیت کے اسباب کو بھی موضوع بحث قرار دیا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ عباس کو زائقاً سکینہ سے شرمندگی تھی اور وہ یہ پرچہ رہے تھے کہ اگر لاش کے سرانے کھینچی نہ آکر پانی کا دودھ یاد دلادیا تو میری روح پر کیا غور جائے گی۔ تقاضائے وفا یہی ہے کہ اب کھینچی کا سامنا نہ کیا جائے۔

بعض علما نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ صرف ایک بہانہ تھا اور حضرت عباس امام حسین کی شکستہ کمر کا لحاظ کرتے ہوئے آپ کو یہ زحمت نہیں دینا چاہتے تھے کہ آپ لاش کو خیمہ میں لے جائیں۔

علامہ عبد الرزاق مقرر کی تحقیق یہ ہے کہ امام حسین نے ایک عظیم معلومت کے تحت لاشہ کو دریا کے کنارے چھوڑ دیا تھا تاکہ حضرت عباس کا مزار مبارک عام شہداء سے الگ رہے اور آپ کے کرامات و کمالات صبح قیامت تک جدا گانہ انداز سے ظاہر ہوتے رہیں۔

کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ اس توجہ میں اور دوسرے وجوہ میں کوئی منافات نہیں ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ اس توجہ کا تعلق امام حسین کے مصالح سے ہے اور ان کا تعلق حضرت عباس کے جذبات سے ہے۔

یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ امام حسین پارہ پارہ جسم کو اٹھانے کی طاقت رکھتے تھے لہذا دوسری توجہ کسیرے محل ہے۔

اس لئے کہ امام حسین کے اقتدار و اختیار میں شک نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ بھی حالات کے پیش نظر دیکھنا پڑے گا کہ حضرت عباس کے جذبات و فدا کا تقاضا کیا تھا اور وہ امام حسین کا اس زحمت کو برداشت کر سکتے تھے یا نہیں؟

پہلی وجہ بالکل واضح ہے اور حضرت عباس کے جذبات و احساسات کے عین مطابق ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ وصیت ثابت کبھی ہے یا نہیں؟

علامہ مقرر کا کہنا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ثبوت سے ان کی مراد کیا ہے؟

وہ کس قسم کا ثبوت چاہتے ہیں۔ کتب مقاتل میں روایت کا درج ہونا ایک بہترین ثبوت ہے جب کہ روایت کبھی بھی مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے۔

بنا بریں وجہ اول زیادہ وجہ اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ وصیت بالکل بے بنیاد ہے اور حضرت عباس نے اس قسم کی کوئی وصیت نہیں کی تھی۔ تو علامہ مقرر کا بیان سب سے زیادہ قرین قیاس اور مطابق عقل و منطق ہے۔

ادامع رہے کہ بعض ضعیف روایات میں حضرت عباس کی لاش کے خیمے میں لے جانے کا بھی ذکر ہے۔

خدا جانے کہ اس راوی کو کہاں سے دھوکا ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ اشتباہ بھی اسی اشتباہ کی ایک فرع ہو کہ حضرت عباس کی شہادت نوزین محرم کی شام کو واقع ہو گئی ہے عجب کہ یہ واقعہ عباس اصغر کا ہے عباس علمدار کا نہیں۔

اندازِ رجز

حضرت عباس کی عظمت و جلالت کا اندازہ کرنے کے لئے آپ کے ان اشعار پر بھی نظر کرنا پڑے گی جو آپ نے جہاد کی منزل میں رجز کے طور پر ارشاد فرمائے تھے۔

عام طور سے حضرت عباس کی بلندی اور برتری ان کی ہمت و طاقت کے اعتبار سے ہی سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہمت و طاقت انسانی عظمتِ کردار کی دلیل نہیں بنا سکتی۔ حضرت عباس کی جلالتِ قدر اس عظیم معرفت کی بنا پر ہے جس نے طاقت کو بھی اپنے سانچہ میں ڈھال لیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے رجز میں اپنی ہمت و طاقتِ جبرأت و ہیبت کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ واضح طور پر دینِ خدا کی عظمت اور امام حسین کے مراتب و مناقب کا تذکرہ کیا ہے۔

تاکہ فوج دشمن یہ اندازہ کر لے کہ جس قافلہ پر بغاوت و خروج کا الزام لگایا گیا ہے۔ یہ دین کے پرستار اور مذہب کے وفادار ہیں۔ امام حسین کے جدِ بزرگوار حضرت احمد مختار اور ان کے پد زائد حمید رکھار تھے۔ ان کے خلاف صفِ آراءئی کرنا دین سے بغاوت اور اسلام سے مقابلہ ہے۔ ان پر خروج و بغاوت کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔

تبلیغِ حق اور اتمامِ حجت کا یہ اندازہ صرف اس مجاہد کو زیب دیتا ہے جو شجاع اور بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ نیابت و سفارت کی عظیم ترقیمہ داریوں کا حامل ہو اور جنگ کو مکمل اسلامی آئین کے تحت سر کرنا چاہتا ہو۔



تاثرات

انسان کی عظمت و جلالت کے بے شمار پیمانوں میں ایک عظیم پیمانہ تاثیرات بھی ہیں جو اس کے مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

زندگی میں اخلاص و محبت کا مظاہرہ کرنے والے بے شمار مل جاتے ہیں۔ اخلاق کے اظہار پر مکر و دیار۔۔۔۔۔ اور معلومت و حالات کے لا تعداد غلاف چڑھتے رہتے ہیں۔

یقین مرنے کے بعد یہ حالات یکبارگی بدل جایا کرتے ہیں۔ نہ مردوت و درداداری کا کوئی سوال رہ جاتا ہے اور نہ مکر و دیار کا۔ نہ گناہوں کا سامنا مدرج و شاپر آئادہ کرتا ہے نہ مصالح و دقت ہر بلب بنتے ہیں۔

ایسے میں جو تاثر بھی قائم ہوتا ہے وہ بڑی حد تک حقیقت کا امینہ دار اور شفقت کے جذب و کشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔

امام حسینؑ کی شہادت پر زمین کا خون اگلنا۔ آسمان کا لہو برسانا۔ جنات و ملائکہ کا نوحہ پڑھنا۔ رسول اکرمؐ کا اُم سلمہ کے خواب میں گریباں چاک آنا۔۔۔۔۔ ایسے تاثیرات ہیں جن سے شفقت کی عظمت و جلالت اور اس کی گونا گوں محمودیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت عباسؓ کی جلالت و برتری کا اندازہ بھی اسی پیمانے سے کیا جاسکتا ہے۔ زندگی میں آپ کی محبوبیت و اخلاص پر تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔

دیکھنا صرف یہ ہے کہ شہادت کے بعد آپ کے نہ رہنے کا احساس کس قدر اثر انگیز واقع ہوا ہے اور آپ کی کمی کا نہات کے لئے کس قدر محسوس کی گئی ہے۔

ان تاثیرات کو الگ الگ شخصیتوں کے اعتبار سے دیکھا جاسکتا ہے اور تجزیہ و تفصیل کے بعد ہی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس اثر لینے والے کی کیا منزل تھی اور اس کے تاثیرات کا کیا اندازہ تھا؟

امام حسینؑ

ادب و مقاتل کا بیان ہے کہ حضرت عباسؓ کی آخری آواز آتے ہی امام حسینؑ کی زبان اقدس پر یہ فقرات آ گئے۔

”اَلَا تَرَ اَنْكَسَرَ ظَهْرِيْ وَ قَلْتُ حَيْلَتِيْ“

”عباسؓ! کمر ٹوٹ گئی۔ تدبیر کی راہیں بند ہو گئیں“

تاریخ اسلام میں یہ فقرہ ایک مرتبہ جناب امیرؓ نے حضرت جعفر طیارؑ کی شہادت پر استعمال کیا تھا اور ایک مرتبہ امام حسینؑ نے کربلا میں استعمال کیا ہے۔ حضرت امیرؓ کے اس فقرے کو صرف منہاج الدروعؒ نے نقل کیا ہے اور امام حسینؑ کے اس فقرہ کو بیشتر ادب و مقاتل نے درج کیا ہے۔

منہاج الدروعؒ کی روایت کی صحت و عدم صحت سے قطع نظر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں یہ فقو ایسے ہی طویل القدر انسان کی شہادت پر استعمال ہوتا ہے جو جعفر طیارؑ جیسا ذادار، علمبردار و نیک کردار ہو۔

اور شاید یہی وجہ تھی کہ روایات نے صرف حضرت عباسؓ کو مثیل جعفر طیارؑ قرار دیا ہے اور دونوں کے لئے باغ جنت میں پروردار عطا کرنے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

اس کے باوجود حضرت عباسؓ کو ایک الفردیت اور امتیاز بھی حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب امیرؓ کے سامنے ان کے کسی ایسے بھائی نے انتقال نہیں کیا تھا جس کا مرتبہ جعفر طیارؓ سے بلند تر ہو کہ جعفر طیارؓ کے بارے میں اس فقرہ کے استعمال سے یہ اندازہ کیا جائے کہ ان کی جلالت و عظمت ٹولا کی نگاہ میں کیا ہے۔

لیکن امام حسینؓ کے سامنے ان کے ایک معصوم بھائی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اور ان کی شہادت پر امام حسینؓ نے نوحہ بھی پڑھا تھا۔ گریہ بھی کیا تھا۔ آنسو بھی بہائے تھے۔

یہ ادبات ہے کہ امام حسینؓ کے مرثیے میں یہ نہیں فرمایا تھا کہ بھیا — آج میری کمر ٹوٹ گئی!

یہ خیال نہ ہو کہ یہ فقرہ چھوٹے بھائی کی شہادت پر استعمال ہوتا ہے اور امام حسنؓ بڑے بھائی تھے۔

اس لئے کہ امیر المومنینؓ نے اسے جعفر طیارؓ کی شہادت پر استعمال کیا ہے جو بلاشبہ مولائے کائنات سے بڑے اور عمر کے اعتبار سے بزرگ تر تھے۔ سوال صرف یہ ہے کہ امام حسینؓ نے یہ فقرہ کل کیوں نہیں استعمال فرمایا تھا اور آج کے لئے کیوں اٹھا رکھا تھا۔

کیا اس کا سبب یہ ہے کہ آپؐ کی نظر میں جناب عباسؓ کا مرتبہ امام حسنؓ سے بلند تر تھا۔؟ ہرگز نہیں۔

امام حسنؓ امام وقت تھے۔ معصوم تھے۔ منعب الہی کے حامل تھے۔ اور حضرت عباسؓ ان تمام فضائل و کمالات میں کسی فضیلت کے مالک نہیں تھے۔

اس کے بعد بھی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ امام حسنؓ کی شہادت پر موقع پر حضرت عباسؓ موجود تھے۔ اس لئے امام حسینؓ کو اس تنہائی اور کمزوری کا احساس نہیں ہوا جو ایک

ایسے بھائی کی شہادت پر ہوا کرتا ہے۔

لیکن جب کہ بلا میں عباسؓ عہدار نے آخری سلام کیا۔ تو امام حسینؓ کے قلب نازنین نے محسوس کر لیا کہ اب کوئی ایسا نادار اور جاں نثار ممکن نہیں ہے۔ اب نہ تو کمری طاقت ہے اور نہ بازو کا زور۔

یہی وجہ تھی کہ شہادت حضرت عباسؓ کا تاثر امام حسینؓ کے پورے وجود سے ظاہر ہوا ہے۔ ہاتھ کمر تک پہنچ گئے۔ اور چہرہ حزن و الم سے تصویر غم بن گیا بلکہ قتل کا بیاں تو یہ ہے کہ:-

"يَا اَكْلَ الْكَسَا دُرِّيَّ وَجْهَ الْحُسَيْنِ فَحَسَنٌ
مَهْمُومًا مَغْمُومًا وَدُمُوعُهُ تُجْرِي عَلَى خَدَيْهِ"

"امام حسینؓ کے چہرے خستگی و تشنگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور آپؐ مہموم و غمگین ہو کر بیٹھ گئے۔ عالم یہ تھا کہ دولوں و خساروں پر مسل آنسو بہہ رہے تھے۔" (دمعہ ساکبہ ص ۳۸)

امام زین العابدین

صاحب دمعہ ساکبہ ناقل ہیں کہ جب امام حسینؓ رخصت آخر کے لئے غیمہ میں آئے تو جناب زینبؓ انھیں لئے ہوئے بیمار بیٹھے کے پاس آئیں اور شانہ ہلا کر بیدار کیا فرمایا۔ "میرے لال! باپ رخصت آخر کے لئے آیا ہے"

بیمار نے رخصت آخر کا نام سنا اور دل ٹپ گیا۔ عرض کی بابا جان! یہ رخصت آخر کا کیا مطلب ہے؟ آپ کے اصحاب و انصار کہاں ہیں؟ وہ چاہئے اسے جاں نثار کہاں گئے؟

امام حسینؓ نے ایک ایک کی شہادت کی خبر سنائی۔ بیمار کر بلا کا دل تڑپتا رہا۔

آخر میں آپ نے پوچھا بابا جان! غیر اچھا عباس کہاں ہے؟
عباس کے بارے میں سوال کا ہونا تھا کہ جناب زینبؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اللہ اس قدر نازک سوال۔ دیکھیں بھیا کیا جواب دیتے ہیں۔

امام حسینؑ چند لمحے خاموش رہے اور آخر میں فرمایا۔
"يُنْتِی اِنِّیْ عَمَّاکْ قَدْ قُتِلَ"

"بٹیا وہ بھی شہید ہو گئے۔"

شہادت کا نام سننا تھا کہ

"يَكُنْیْ عَلٰی بَنِی الْحُسَيْنِ بَكَاءٌ اَشَدَّ بَدَا"

بیابا کڑ بلا چیخ کر رونے لگے۔ اسے میرے چچا۔ ہائے میرا چچا۔

امام حسینؑ پر اس شہادت کا یہ اثر ہوا کہ چہرہ کا رنگ ارگیا اور کمر ٹوٹ گئی تو بیابا
کمر بلا پر یہ اثر ہونا ہی چاہیے تھا۔

یہ چچا کی شہادت ہی کی خبر نہیں تھی۔ باپ کی بکیسی اور اپنی مجبوری کی خبر تھی غیام
کے لٹنے اور چاروں کے چھٹنے کی خبر تھی۔ لشکر کے خاتمہ اور دشمن کے طعنے کی خبر تھی۔ یہ خبر
اشارہ کر رہی تھی کہ اب مصائب کے نئے باب کا وقت آگیا۔ اب آلِ محمدؐ کو دیا بد یا بد یا قیدی
بن کر جانا ہے۔

امام زین العابدینؑ کا اس شدت سے گریہ کرنا حضرت عباسؑ کی عظمت و جلالت
کی بہترین دلیل ہے۔ اور اس کے بعد حضرت کا یہ ارشاد گامی کہ میرے چچا کے مرتبہ پر تمام
شہداء اولین و آخرین غبط کریں گے، اس امر کا ثبوت ہے کہ حضرت عباسؑ کی عظمت بڑی
کی مثال صرف اس است میں نہیں۔ امم سابقہ میں کبھی موجود نہیں ہے۔

جناب زینبؓ:

مشہور و معروف روایت ہے کہ جب جناب زینبؓ کو حضرت عباسؑ کے رخصت ہو کر
میدان میں جانے کی اطلاع ملی اور آپ نے دیکھا کہ اب بھائی سے ملاقات کا امکان نہیں ہے
تو ایک مرتبہ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اور فرمایا۔ "مَدَّقَ آبِیْ"۔ میرے بابا نے یہ کھا تھا۔
امام حسینؑ نے فرمایا۔ بہن اس فقرہ کا مطلب کیا ہے۔

عرض کی بھیا! میں بابا کی خدمت میں تھی۔ بابا میرے بازوؤں کو بوسہ دیکر فرمائے لگے
زینب! ایک دن ان بازوؤں میں رسیاں باندھی جائیں گی۔ میں مضطرب تھی اور جس وقت
مجھے اس اسیری کا خیال آیا تھا یہ سوچ کر دل کو مطمئن کر لیتی تھی کہ جس کا عباسؑ جیسا بھائی
سلامت ہو اس کے بازوؤں میں کون دسی باندھ سکتا ہے۔
لیکن بھیا اب معلوم ہو گیا کہ وہ وقت آگیا جب زینبؓ فوجِ شام کی قیدی بنے گی اور
اسے دیا بد یا بد پھر لایا جائے گا۔

جس کو اللہ نے بخشا ہے برادر کوئی
حصین سکتا نہیں اُس بی بی کی چادر کوئی
وقت کی بات جو پابندِ رسن ہے زینبؓ
دردِ عباسؑ سے بھائی کی بہن ہے زینبؓ

(پیامِ اعظمی)

مخدرات عصمت

امام ابواسحاق اسفرائینی کا بیان ہے کہ "جب امام حسین لاش عباس علمدار سے پٹ کر خیمہ میں آئے تو درخیمہ پر کھڑے ہو کر یہ خبر غم سنائی۔ سیرانیو! عباس فرات کے کنارے شہید ہو گئے۔"

یہ سننا تھا کہ بیسیاں خیموں سے باہر نکل آئیں اور گریہ و شیون کا ایک شور برپا ہو گیا۔ شدت گریہ کا عالم یہ تھا کہ ملائکہ آسمان بھی آنسو بہا رہے تھے اور ماتم کر رہے تھے۔

"امام حسین نے یہ منظر دیکھا تو در در کر بیسیوں کو خیموں میں داپس کیا اور سب کو تسلی دی۔" نور العین ص ۲۱

امام منقولہ کی میدان سے داپسی کا منظر علامہ جہندہ نے اپنے ان الفاظ میں

پیش کیا ہے۔
 "رَبِّحِ اِنِّی الْخِیْمَۃُ وَهُوَ یَقْلِبُ دُمُوعَہُ بِلَحْمَہِ"

"امام حسین اس عالم میں خیمے کی طرف پہلے کہ آپ اپنے آنسوؤں کو آستین سے خشک کر رہے تھے۔"

بیسیوں کے خیمے سے نکلنے میں جناب زمینٹ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ عام مخدرات ٹرپ کر باہر نکل آئی ہوں اور یہ چاہتی ہوں کہ کسی طرح اپنے کو لاش عباس تک پہنچا دیں۔ لاش خیمہ تک آگئی ہوتی تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔
 لیکن۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔

جناب سکیٹ

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب علمدار کی شہادت کی خبر سن کر عام مخدرات کا یہ عالم تھا تو بیماری کھیتی "سکیٹ" کا کیا عالم ہو گا۔

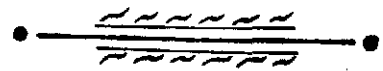
سکیٹ نے جچا کو دریا پہ بھیجا تھا۔ سکیٹ ہی نے مشکیزہ لا کر دیا تھا۔ سکیٹ آس لگائے بیٹھی تھی۔ سکیٹ کے گرد بچے جمع تھے اور وہ بچوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ بچو! گھراؤ نہیں۔ اب میرا چچا دریا پر گیا ہے۔ اب پانی فردر لائے گا۔

لیکن ایک مرتبہ اطلاع ملی کہ چچا کے بجائے بابا میدان سے آئے ہیں اور چچا کا علم اپنے ہمراہ لائے ہیں۔ بچوں کی آس ٹوٹ گئی اور سکیٹ ٹرپ کر درخیمہ پر آگئی۔ بابا آپ کو کچھ میرے چچا عباس کی خبر ہے۔ انہوں نے بہت دیر لگائی۔ بابا وہ پانی کا وعدہ کر کے گئے تھے۔ اور میرا چچا بے وفا نہیں ہے۔ (سرار الشہادات ص ۲۲)

یہ معصومانہ جذبات صاف صاف آواز دے رہے ہیں کہ عباس کا اعتماد و وفادار ان کا کردار بے مثال تھا۔ انہوں نے آل محمد کی راہ میں قربانیاں کی تھیں۔ اور انہیں قربانیوں کا اثر تھا کہ امام حسین اور ان کے اہل حرم پر جب بھی کوئی مصیبت پڑتی تھی تو بے ساختہ عباس یاد آتے تھے۔

امام مظلوم گھوڑے سے گرے تو عباس کو پکارا — (مقتل ابو مخنف ص ۳۷۶)
ظالموں نے تلواروں سے حملے کئے تو عباس کو یاد کیا — (ابو مخنف ص ۳۷۷)
خیموں میں آگ لگی تو سیدانوں نے عباس کو پکارا — (ریاض القدس ص ۱۸۷)
جناب زینب شام غریباں میں غلایہ پھرنے لگیں تو عباس کو آواز دی۔
سکینہ کے دامن میں آگ لگی تو گھبرا کر عباس کو فریاد کے لئے پکارا۔
اسیروں کا قافلہ روانہ ہونے لگا تو ناتھ پر سوار ہونے کے لئے ثنائی زہر ہونے
عباس کو آواز دی۔ (اسرار الشہادات ص ۳۷۸)

یاد آتے ہیں حضرت عباس
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا



راہِ کوفہ و شام

مقاتل کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہادتِ امام مظلوم کے بعد آپ کا سراقدس
اُمی شبِ خولی کے ہمراہ کوفہ بھیج دیا گیا۔ اور اسے کوفہ میں کوچہ بہ کوچہ دیارِ بدریاد پھرایا
گیا تھا۔ مسجدِ حنظلہ کے زیرِ سایہ آپ ہی کا سراقدس رکھا گیا تھا جس کے زیرِ اثر مسجد
کی دیواریں جھک گئی تھیں۔

باقی سرہائے شہداء اُگیا دھوی محرم کو اسیروں کے ساتھ کوفہ لے جائے گئے اور
انھیں لوگ ہائے نیرہ پر لٹھب کیا گیا۔

صرف حضرت عباس کے سر کے بارے میں یہ روایت ہے کہ آپ کا سر گھوڑے
کی گردن میں آدیزاں تھا اور ظالم جب گھوڑے کو دوڑاتا تھا تو سر مبارک برابر ٹھوکر
کھاتا جاتا تھا۔

مقاتل میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ یہ تفریق کیوں تھی۔ لیکن بعض روایات
سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سراقدس لوگ نیرہ پر ٹھہرتا ہی نہ تھا اور جب کبھی اشتیاق
لوگ نیرہ پر لٹھب کرنے کی کوشش کرتے تھے، اپنے ارادہ میں ناکام ہو جاتے تھے۔
یہ بات بظاہر تعجب خیز ہے۔ اور اس وقت مزید تعجب خیز ہو جاتی ہے جب
شام کے واقعات میں آپ کا سر لوگ نیرہ پر دکھایا جاتا ہے

یہ ممکن ہے کہ پہلے واقعہ کا تعلق کوفہ سے ہو اور دوسرے کا شام سے۔ لیکن

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور کوفہ میں یہ سرکولوک نیزہ پر کیوں نہیں ٹھہرا۔

شاید اس کا سبب یہ ہو کہ کوفہ حضرت علیؑ کا دار الخلافہ رہ چکا ہے۔ یہاں کے لوگ آپؐ سے باقاعدہ طور پر واقف تھے۔ اور حضرت زینبؓ اس احترام کے ساتھ رہ چکی تھیں کہ کوفہ کی عورتیں ملاقات کے لئے اجازت طلب کیا کرتی تھیں۔ شام کی یہ نوعیت سرگز نہیں تھی۔ یہ جنگاں سے دشمنان اہل بیتؑ کا مرکز تھی اور یہاں یزید کا باپ معاویہ حکومت کر رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ جس قدر بے پردگی کا نفسیاتی اثر کوفہ میں ہو سکتا ہے شام میں نہیں ہو سکتا۔

حضرت عباسؓ نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ لوک نیزہ پر اس طرح سر بلند ہو کر جب آنکھیں کھلیں تو اپنی بہنوں اور سیدائوں کو کوفہ کے دربار و بازار میں سر پر بند دیکھیں۔ شام میں حالات کبھی قدر تبدیل ہو گئے تھے اور تماشائی بھی عادی ہو گئے تھے اس لئے آپؐ نے لوک نیزہ پر ٹھہرنا گوارہ کر لیا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپؐ کے سرکولوک نیزہ پر لقب کرنے کی کوشش کی گئی ہو اور جب آپؐ نے اس منصوبہ کو نام بنادیا ہو تو ظالم خنڈ نے انتقام میں اہل حرم کو تازیانوں سے اذیت دی ہو اور انھوں نے ٹرپ کر آپؐ سے گزارش کی ہو کہ ————— ہاشم کے چاند اب نیزہ پر بلند ہو جا ورنہ ہم یوں ہی تازیانوں پر تازیانے کھاتے رہیں گے۔

حضرت عباسؓ کے لئے دروزن باتیں بے حد سخت تھیں۔ لوک نیزہ سے سیدائوں کے کھلے سروں کا دیکھنا اور سیدائوں کی پشت اقدس پر ظالموں کے تازیانوں کے نشان دیکھنا۔ آپؐ نے پہلے اپنے مذہباتِ حمت کا اعلان کیا اس کے بعد جب سیدائوں کی تازہ معصیت سامنے آئی تو قلبِ نازنین پر جبر کر کے یہ معصیت بھی برداشت کر لی۔

شام

عمیار جو یں محرم کا چلا ہوا قافلہ یکم صفر کو دارِ سرزمینِ دمشق ہوا۔ تین دن تک قافلہ کو بیرونِ شہر روک کر شہر کو راستہ کیا گیا۔ بازاروں کی آئینہ بندی کی گئی۔ دربار میں اعیانِ ملکیت کو جمع کیا گیا۔ راستوں پر تماشا یوں کا مجمع رکھ دیا گیا۔ اور ایسے عالم میں رسولِ اکرمؐ کی ذریت کو دربار میں داخلہ کا حکم دیا گیا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب بھی انسان پر کوئی تازہ معصیت وارد ہوتی ہے تو اسے اپنے یار و مددگار اور اعرانِ و انصار یاد آتے ہیں۔ جتنی اہل حرم کی نگاہ میں عباسؓ سے بڑا معین و مددگار کون ہو سکتا ہے؟

بھلا جن بچوں نے شدتِ عطش میں عباسؓ کو یاد کیا ہو خیام کی غارتگری میں عباسؓ کو بھکارا ہو، شمر کے طعناں جو پر عباسؓ کا نام لیا ہو۔

جس خاتون نے گنجِ شہیداں پر نظر ڈالنے کے بعد فرات سے عباسؓ کو آواز دی ہو ————— وہ جب تازہ معصیت سے دوچار ہوں گے تو سوائے عباسؓ کے کسے بلائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ جب مقاتل کے بیان کے مطابق بازارِ شام میں سکینہ کی نظر چٹکی کے سر پر پڑ گئی تو چچا چچا کہہ کے ایک لغو مارا اور دلِ تڑپ گیا۔

شام سے رہائی کے موقع پر قید خانے میں شہیدوں کے سر اُٹے تو جنابِ ام کلثومؓ نے دُھڑ کر سر عباسؓ اٹھایا اور بن کر ناشروع کر دیئے۔

نفسیات کے اس تجزیہ کے بعد یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مقابل نے اہل حرم کے تاثرات کو کس انداز سے بیان کیا ہے اور اس میں کہاں تک صداقت ہے۔ یہ باتیں عین مطابق فطرت ہیں۔ ان کے لئے کسی مقتل کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔

ہاں اگر کوئی موقع اس کے خلاف آجائے تو مقتل کا فرض ہے کہ اس کی نشاندہی کرے۔ تاریخ عالم کے تازہ حوادث کی ترجمانی کرتی ہے۔

مطابق فطرت حالات کی عکاسی تاریخ کا کام نہیں ہے۔ ان حالات کو ہر انسان اپنے ذوق سے محسوس کر سکتا ہے۔

شعراء کرام کو "تلا میذ الرحمن" اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ان کا یہ احساس شدید تر ہوتا ہے اور وہ ان کیفیات کا دجہانی ذوق رکھتے ہیں۔ حالات کی ترجمانی میں "زبانِ حال" کو اسی لئے اہمیت حاصل ہے کہ اس سے مذکورات کا علم نہیں ہوتا بلکہ احساس کا علم ہوتا ہے۔

"زبانِ مقابل" میں فریبِ ریاکاری خود ستائی کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔

لیکن زبانِ حال میں ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ احساس صحیح اور وجدانِ ذوقِ صحت مند اور سالم ہو۔ اس کے بغیر نہ حال کا احساس ہو سکتا ہے اور نہ اس کی ترجمانی ممکن ہے۔

قافلہ اہل حرم مدینہ میں

ایک سال تک قید و بند کی مصیبتیں بھیلنے کے بعد قافلہ اہل حرم کو رہائی نصیب ہوئی اور یہ لٹا ہوا قافلہ کربلا ہوتا ہوا مدینہ کے لئے روانہ ہوا۔ ایک مدت کے بعد "مدینہ والے" مدینہ واپس آئے تو اس عالم میں کہ جناب ام کلثومؑ نے مدینے کو دیکھتے ہی آواز دی۔

"ما مانا کے مدینے! ہمارے آنے کو قبول نہ کرنا۔ ہم حشر میں لے کر آئے ہیں۔ مدینے! ہم تجھ سے رخصت ہوئے تھے تو پھر اگر ہمارے ساتھ تھا۔ اور واپس آئے ہیں تو نہ بچے ہیں اور نہ والی و وارث۔"

بیرونِ مدینہ قافلہ ٹھہرا۔ امام زین العابدینؑ نے بشر بن جزیل کو حکم دیا کہ مدینہ والوں کو ہماری آمد کی اطلاع کر دے۔ "بشر" حکم پا کر چلا۔ شہر میں داخل ہو کر آواز دی۔

يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مَقَامَ لَكُمْ هِجَا

تَتَبَلَّ الْحُسَيْنُ فَإِذَا مَعِيَ صِدَارٌ

الْجِسْمُ مِنْهُ بَكْرٌ بِلَاءٍ مُضْطَرِّجٌ

وَالرَّاسُ مِنْهُ عَلَى الْفَنَاءِ يُدَارُ

ترجمہ:- "مدینے والو! مدینہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ حشر میں مارے گئے!"

دیکھو میرے آنے پر برابر یہ ہے میں۔۔۔۔۔ مدینہ والو

قیامت ہے کہ حیثین کا جسم خاک و خون میں آغشته زمین کر بلا پر رہا اور ان کے سر کو نوک نیزہ پر دیار بدیار بھرا دیا گیا۔“

اس آواز کا سننا تھا کہ سارا مدینہ بیتاب ہو کر کل پڑا۔ شہر میں ایک کبیرام برپا تھا۔ بشیر محلہ بنی ہاشم میں پہنچا تو کیا دیکھا کہ ایک معقلہ ”با حالت تباہ“ اس کی طرف دوڑتی چلی جا رہی ہیں جہاں قافلہ ٹھہرا ہوا ہے۔ زبان پر دوحسینا دوحسینا کے نعرے ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ جناب ام البنین اور حضرت عباس بن جنہیں اپنا شہزادہ یاد آ رہا ہے اور اس کے غم میں اپنے فرزند کے غم کو بھلا دیا ہے۔

اس عالم میں ایک بچہ بر بھی نظر پڑی جو سردار کھڑا ہوا تھا۔ بشیر قریب پہنچا۔ بچہ نے بڑھ کر دستہ زد کا اور کہا بشیر ٹوٹا تو شہید ہو گئے۔ یہ بتا میرے بابا آئے ہیں یا نہیں۔ بابا آئے ہوں تو میں اچھے کپڑے پہن کر آؤں ورنہ سیاہ لباس پہن لوں!!

بشیر نے پوچھا فرزند! تمہارا بابا کون ہے اور تم کس کے انتظار میں ہو عبید اللہ بن عباس نے کہا۔ میرا بابا عباس علمدار ہے۔“

بشیر کا دل تڑپ گیا۔ سر جھیکا کر بولا۔ ”بیٹا! اب ماتمی لباس پہن لو۔ تمہارے بابا کو بلا کے میدان میں شہید ہو گئے۔“ (ریاض القدس ص ۱۵۸)

مدفن مقدس

”مدفن“ اس جگہ کا نام ہے جہاں کسی مرنے والے کو سپرد خاک کیا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مسلمان جب عالم ناپائیدار سے رفعت ہوتا ہے تو اس کے اغراض چاہنے والے قبر کا اہتمام کرتے ہیں اور نہایت ہی اہتمام کے ساتھ اسے سپرد خاک کرتے ہیں۔

شرعیات اسلامی نے کبھی دفن اموات کو بے حد اہمیت دی ہے اور اسے ہر مسلمان کی ایک ذمہ داری قرار دی ہے۔ ”دفن اموات“ واجب کفائی ہے لیکن واجب کفائی اپنے وجوب میں کفائی نہیں ہوتا۔ وجوب کے ادا کرنے میں کفائی ہوتا ہے۔ اس کے وجوب کا تعلق ہر مسلمان سے ہوتا ہے

یہ اور بات ہے کہ مقصد کے حصول کے بعد باقی افراد سے یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔

کر بلا کی تاریخ اس مسئلہ میں کبھی ایک انفرادیت رکھتی ہے۔ یہاں کے نام بنیاد مسلمانوں نے اپنے مقتولین کی لاشوں کو دفن کر دیا۔

لیکن فرزند رسول اور دیگر شہداء اور اہل خدا کی لاشوں کی طرف کوئی توجہ بھی نہیں کی اور انھیں ایک گرم صحرا پر چھوڑ کر انکے وارثوں کو قیدی بنا کر چلے گئے۔

ان شہداء کے دفن کا اہتمام مالک کائنات نے کیا۔ امام زین العابدین نے باعجاز قید کو ذرہ سے تشریف لا کر بنی اسد کے لقادہ سے بھینر و تکفین کے فرائض انجام دیئے۔ آپ کا خصوصی اہتمام یہ تھا کہ ایک قبر تیار کر کے اس میں بنفس نفیس اپنے پدر بزرگوار کو دفن کیا اور کسی کو اس امر میں شریک نہیں ہونے دیا۔

دوسری قبر میں اپنے بھائی حضرت علی اکبر کو دفن کیا۔ تیسری قبر میں حبیب ابن مظاہر کو دفن کیا۔ اور ایک قبر میں تمام شہداء کو بلا کو دفن کیا۔

ان سب سے فرصت پانے کے بعد فرات کے کنارے ایک قبر تیار کر لی اور اپنے چچا عباس علیہ السلام کو دفن فرما دیا۔

حضرت عباس کا امتیاز یہ ہے کہ آپ کی قبر مطہر تمام شہداء کی قبروں سے جدا اور قدرے دور ہے۔ علماء اعلام نے اس جگہ کی تعبیر ”شط فرات“ ”مقابل مائر“ جیسی لفظوں سے کی ہے۔ اعلام الورعی ص ۱۲، عمدة الطالب ص ۳۳۹، انوار الغمانیہ ص ۳۳۲ وغیرہ۔

اس امتیاز کے مختلف اسباب بیان کئے گئے ہیں۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ امام حسین سے حضرت عباس کی وصیت کا احترام ہے کہ میری لاش خیمہ میں نہ لے جائے گا۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ شیر کے قبضہ کا احترام ہے کہ صبح قیامت تک فرات کے کنارے ایک پیاسے ہی کا قبضہ رہے گا۔

”علامہ مقرر“ نے تو یہ توجیہ کی ہے کہ یہ صبح قیامت تک حضرت عباس کی امتیازی شان کو باقی رکھنے کا اہتمام ہے۔ کہ دنیا قبروں کا اندازہ ہی دیکھ کر یہ سمجھ لے

کہ اس شہید میں کوئی خصوصیت ہے جو دیگر شہداء میں نہیں ہے۔ اور اس کے کرامات و کمالات بھی اسی کے نام سے موسوم ہوتے رہے اور ان کی عظمت صاحب کرام کی عظمت کا اعلان کرتی رہے۔

شہداء کو بلا میں سب ہی ”عام تاریخ دفن“ کے اعتبار سے ایک امتیاز و حیثیت کے مالک ہیں۔

دنیا میں ہر شخص کا دفن ایک ہوتا ہے اور یہاں ایک ایک شہید کے دور و مدفن پائے جاتے ہیں۔ کہیں جسم دفن ہوا ہے اور کہیں سراقہ۔

لیکن حضرت عباس اس میں بھی ایک انفرادیت کے حامل ہیں۔ آپ کے حسب اقدس کو تین مدفن میسر ہوئے۔ ایک وہ جگہ ہے جہاں تن پاس پاش کو دفن کیا گیا۔ ایک وہ منزل ہے جہاں سراقہ کو سپرد دعا کیا گیا۔ اور ایک وہ مقام ہے جہاں دو لڑائی ہاتھوں کو تھوڑے فاصلہ پر زیر خاک چھپایا گیا ہے۔

یہ مقامات کہاں ہیں۔ اور ان نوعیت کیا ہے؟

یہ ایک الگ بحث ہے جس میں کوئی تحقیقی رائے قائم کرنا سخت مشکل ہے۔ اتنا ضرور مسلم ہے کہ جسم اقدس اسی مقام پر دفن ہوا ہے جہاں روضہ مطہر بنا ہے اس کے علاوہ دو لڑائی باز اور سراقہ طہر کے بارے میں روایات مختلف ہیں اور یہ اختلاف روایت کسی اور شے کی نشاندہی کرے یا نہ کرے اتنا ضرور بتاتا ہے کہ اس شہید کی لاش مطہر بھی صحیح و سالم نہ رہ سکی اور اسے ظالموں نے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

سراقہ کے بارے میں علامہ محسن الامین عالمی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ دمشق کے قبرستان ”باب الصغیر“ میں دفن ہے۔ اور میں نے خود اس جگہ پر ایک کتبہ دیکھا ہے۔ یہ روایات ہے کہ اب یہ کتبہ محفوظ نہیں ہے۔ ص ۲۹۰ واقعہ ۱۳۲۱ھ کا ہے۔

حبیب السیر کی روایت ہے کہ امام زین العابدین تمام سروں کو اپنے ہمراہ دمشق سے کرلا لائے اور وہیں جموں سے ملحق فرمادیا۔

تاریخی اعتبار سے کسی ایک بیان کی صحت کا قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن کرامات کی تفصیلات اور جذبانِ وِذوق کی اعانت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نظام کے خاتمے کے بعد شہیدوں کے سروتن میں جدائی نہیں رہ سکی اور ہر سراپے جسم کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔

اب یہ کس طرح ہوا اور اس کے دسائل و اسباب کیا تھے؟ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔

صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص کو بلائے معلیٰ میں شہید اہرام کی قبروں کے قریب کھڑا ہو کر نحو مناجات ہو جائے اور استغراقی کیفیت پیدا کرے تو یہ ضرور محسوس ہوگا کہ جسم بے سر سے مخاطب نہیں ہوں بلکہ ایک ایسے جسدِ اقدس سے خطاب کر رہا ہوں جس کا سر اس کے ساتھ ملحق ہے اور وہ برابر میرے حالات کو دیکھ کر اپنی نگاہ عنایت سے اشارہ کر رہا ہے۔

زیارت

کسی عظیم شخصیت کی بارگاہ میں حاضری دینے کا نام ہے۔ زیارت۔۔

زیارت انسان کے قلبی تاثرات کی ترجمان اور اس کے داخلی جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔

زیارت اس بات کی دلیل ہے کہ زائر اپنے تمزور کا احترام کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کو لائقِ تعظیم سمجھتا ہے۔

قانونِ اخلاق میں زیارت اور ملاقات کی بے حد اہمیت ہے۔ انسانی برادری کا قیام اسی سرور و اخلاق اور اسی طرز معاشرت سے وابستہ ہے اور انسان اسی باہمی

لقادون کے سہارے زندہ ہے۔

مادی قانون میں اس ضابطہٴ اخلاق کی حدیں موت پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اور موت کے بعد نہ کوئی حاضری کے لائق رہ جاتا ہے۔ نہ کسی کی زیارت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

رسمی طور پر قبروں کا احترام ضرور ہوتا ہے اور ان کے نشانات کو بھی باقی رکھا جاتا ہے۔

لیکن حیات کے مجملہ تصورات ختم ہو جاتے ہیں اور بقا کے سارے جذبات خاک میں مل جاتے ہیں۔

مذہب کا قانون اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام نے جن بزرگ شخصیتوں کی زیارت کا حکم دیا ہے انہیں زندگی اور موت دونوں میں یکساں حیثیت عطا کی ہے اور ان کے احترام میں حیات و موت کا کوئی امتیاز نہیں رکھا۔

زیارات میں سلام سے پہلے ”اذن و دخول“ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ سلام کرنے والا کسی مردہ کو سلام نہیں کر رہا ہے اور نہ حاضری دینے والا کسی میت کے سر ہانے کھڑا ہے۔

خالص میت کی قبر ہوتی تو دعائے مغفرت کی جاتی سلام نہ کیا جاتا۔ فاتحہ پڑھا جاتا۔ اجازت نہ لی جاتی۔

زیارت اور اس کے بعد سلام اس بات کی دلیل ہے کہ صاحبِ قبر حقیقی معنوں میں زندہ ہے اور موت نے صرف مادی رشتہٴ حیات کو قطع کیا ہے۔

مرسلِ اعظم کا ارشاد ہے کہ زیارت سے روکنے والے امت کے اشرار ہیں۔ انہیں زمیری شفاعت نصیب ہو سکتی ہے اور نہ وہ حوضِ کوثر پر وارد ہو سکتے ہیں۔

(سفینۃ البحار)

عام مومنین کی قبروں کی زیارت کے مستحب و مطلوب ہونے کے بعد حضرت عباس

کی زیارت کی عظمت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔

یہ ایک ایمانی فریضہ۔ ایک اخلاقی ذمہ داری۔ ایک وفا کا اقتضا۔ اور ایک غیرتِ اسلامی کا مطالبہ ہے جیسے کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

زیارت نہ کرنا بے توجہی کی حد تک پہنچ جائے تو ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے زیارت کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی ہے کہ جس طرح بزرگانِ قوم کی نظر میں مرنے والے کی عظمت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

دنیا بے فانی سے رحمت ہو جانے والے کے مراتب و مناقب کے بارے میں ہزار روایات ایک طرف ہیں اور ایک زیارتِ معصوم ایک طرف۔

زیارت کا ایک ایک فقرہ عظمت کا عمارت ہے اور ایک ایک اندازِ عطا قدر کا نشان۔

حضرت عباس کی زیارت آغا کتاب میں نقل کی جا چکی ہے۔ اس کے الفاظ پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عباس کا مرتبہ کمال کس بلندی پر ہے اور بعض اوقات تو یہ تفصیل مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کسی امام معصوم کی تعریف ہے یا ایک ایسے بلند کُڑا انسان کی مدح و ثنا ہے جو کمال معرفت کی بنا پر اپنے کو امام معصوم کا عطا کتب اور سمجھتا تھا۔

زیارت کے ساتھ در رکعت نماز زیارت بھی مستحب ہے۔ روایت ابو جرم

سہ بعض علما نے حضرت عباس کی زیارت کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اسے "علی پور" زیارت امام حسین پر بھی مقدم کیا ہے۔ انکی دلیل یہ ہے کہ حضرت عباس امام حسین کے لئے "بابِ انجاء" کا مرتبہ رکھتے ہیں اور انسان کیسے مناسب ہی ہے کہ وہ گمراہ آئے تو دروازے کی طرف سے آئے۔

میں نے سال گزشتہ ۱۳۹۲ھ میں زیارت کے موقع پر سرکارِ آیتہ اللہ السید محمد باقر الصدر طاب ثراہ کو اسی ترتیب سے زیارت کرتے دیکھا ہے۔ (جمادی)

اس نماز کا ذکر نہیں ہے۔

لیکن بعض دوسرے روایات، اور علماءِ اعلام کے ارشادات میں اس کا ذکر ضرور ملتا ہے اور اثباتِ استحباب کے لئے اتنی مقدار کافی ہے۔

علامہ مجلسی نے اس نکتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ روایت میں نماز کا ذکر نہ ہونا اس کی حرمت کی دلیل نہیں ہے۔ بہت سے بہت استحباب ثابت نہ ہو سکے گا تو "برجائے" مطلوبیت ہی پڑھ سکتے ہیں۔ اور بعنوان "ایصالِ ثواب" و "کارِ خیر" بھی پڑھی جائے تو استحباب بھی ثابت ہو جائے گا۔

علامہ مرقم طاب ثراہ کا بیان ہے کہ خود زیارت کے ساتھ بھی نماز کا استحباب ثابت ہے اس کے لئے کسی اور عنوان کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ اکثر علماءِ اعلام نے نماز کا ذکر کیا ہے اور علماءِ اعلام بدعت کو استحباب کا درجہ نہیں دے سکتے۔

ذکر نماز کا مطلب ہی یہ ہے کہ ان کی نظر میں اس کا استحباب ثابت ہے یہ اور بات ہے کہ ہم تک وہ دلیل نہیں پہنچ سکی۔

دوسری بات یہ ہے کہ بعض روایات میں مفتی زیارت کے ساتھ نماز زیارت کا ذکر ہے۔

اس میں معصوم اور غیر معصوم کی تفصیل بھی نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر معصوم کی طرف سے وارد ہونے والی زیارت میں "نماز زیارت" بالعموم مستحب ہے۔ اور باقی زیارات میں "ہدیہ میت" اور ایصالِ ثواب وغیرہ کے عنوان سے پڑھی جاسکتی ہے۔

بوسہ قبر

قبر اطہر کی زیارت کی طرح اسے بوسہ دینا بھی ایک امر محبوب ہے۔
مزارِ بجا رضی اللہ عنہ کی روایت کی بنیاد پر خود صادق آل محمد نے صفوان جمال کو تقبیلِ قبر کا حکم دیا ہے اور علماء اعلام نے بھی اپنی کتابوں میں قبرِ اقدس کو بوسہ دینے کا ذکر کیا ہے۔
قبرِ اقدس کی طرح چوٹ کو بوسہ دینا بھی ایک تعظیم و احترام کا طریقہ ہے جو قطعاً ایک محبوب عمل ہے۔ سرکارِ محمد و محمد باقرؑ بہیسانی حرم سید الشہداء کی طرح حرم حضرت عباسؑ میں بھی عتبہ مبارکہ کو بوسہ دیا کرتے تھے۔

علماء اعلام کی سیرت مبارکہ شرعی حجت کے نہ ہونے کے باوجود ایک اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔ ان کے شرعی اعمال اس بات کی دلیل ہوتے ہیں کہ ان کی نظر میں جواز یا استحباب کی کوئی اہم دلیل ہے جو ہماری نگاہوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔ واضح رہے کہ بوسہ دینا سجدہ کرنے سے مختلف ایک امر ہے۔ بوسہ دینا ایک محبوب عمل ہے۔ اور سجدہ کرنا قطعاً غیر محبوب ہے۔

سجدہ کا مسلم قانون یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لئے قطعاً بجا اثر نہیں ہے۔ معصوم کی چوٹ پر خدا کا سجدہ شکر ہوتا تو سبحان اللہ۔ ورنہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ صرف ایک عقلی احتمال ہے ورنہ در معصوم پر سجدہ کرنے والے معصوم کو معصوم اور بزرگ کو بزرگ ہی سمجھتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ تصور بھی نہیں پیدا ہو سکتا کہ یہ بندے خدا ہو گئے ہیں، یا انھیں بھی خدا کا شریک قرار دیا جاسکتا ہے۔ ————— "العیاذ باللہ"

مرثیہ

اخلاقی دنیا کا عظیم ترین فرض اور نفسیاتی انسان کا اہم ترین منظر مرثیہ ہے۔
مرثیہ۔ ان جذباتِ دلی کا کے اظہار کا نام ہے، جو کسی انسان کے غم میں ابھرا کرتے ہیں۔ اور والہندگان کے قلوب کو بر باد دیا کرتے ہیں۔ ہیئت اور تکنیک سے قطع نظر مرثیہ صرف جذباتِ غم کا اظہار ہے اور بس۔

یہ اور بات ہے کہ اس سے منفی طور پر مرنے والے کے کردار اور اس کی شخصیت و حیثیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ جذبہ کا تعلق ایک خصوصیت اور امتیاز پیدا کرتا ہے اور مرثیہ کی حقیقت اس کے بغیر نام رہ جاتی ہے۔

تقصیدہ اور مرثیہ کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ تقصیدہ ان جذبات کے اظہار کا نام ہے جو کسی صاحبِ کمال کے کمال سے متعلق ہوتے ہیں اور مرثیہ ان جذبات کے اظہار کا نام ہے جو صاحبِ کمال کے غمِ دالم سے پیدا ہوتے ہیں۔

مرثیہ کی تاریخ انسانِ نفسیات کی تاریخ ہے۔ اور مرثیہ کا وجود انسانی جذبات

کی پیداوار ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ صاحب کمال انسان دنیا سے اٹھ جائے اور اس کے دلبستان اس کا مرثیہ نہ پڑھیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مرثیہ کبھی نشر میں ہوتا ہے اور کبھی نظم میں۔ اصلاحی طور پر نشر میں اظہار غم کو مرثیہ نہیں کہا جاتا۔ لیکن یہ مفہوم مرثیہ کا تصور نہیں ہے۔

یہ صرف عربی میزان کا تقاضا تھا کہ عرب فطری طور پر شاعر ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو اجتماعی طور پر نظم ہی میں ظاہر کیا کرتے تھے۔ ان کا جز۔ ان کی مدح۔ ان کی جو سب عام طور پر نظم ہی سے متعلق ہوا کرتی تھی۔ مرثیہ بھی انہیں اصناف اظہار میں سے ایک صنف کا نام تھا۔ اس لئے اس کا بھی نظم میں ہونا ناگزیر تھا۔

دھیرے دھیرے ان کے اصول و قوانین مرتب ہونے لگے اور اردو شاعری میں مرثیہ قصیدہ سے بالکل الگ ایک صنف بن گیا۔ عربی شاعری میں اس قسم کے امتیاز کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہاں قصیدہ اور مرثیہ کا فرق صرف جذبات سے متعلق تھا۔ ہدیت اور تکنیک سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اردو زبان میں دونوں کا فرق مادہ اور ہدیت دونوں سے متعلق ہو گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب مرثیہ پڑھنا ایک اخلاقی فرض اور جذباتی مطالبہ ہے تو جس قدر مرنے والا صاحب اوصاف و کمالات ہو گا اتنا ہی مرثیہ جامع اور ہمہ گیر ہو گا اور جس قدر متاثر شدید ہو گا اسی قدر مرثیہ کی اثر انگیزی بھی ہو گی۔

جناب عباس کی شخصیت بھی ایک عظیم ترین شخصیت ہے۔ آپ کے کمالات بے حد جامع اور ہمہ گیر تھے۔ اس لئے آپ کے مرثیہ کا انداز عام افراد سے مختلف

ہونا چاہیے تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب بقیع میں جناب ام البنین آپ کا مرثیہ پڑھا کرتی تھیں تو مسروان حبیب دشمن اہل بیت بھی چند لمحہ ٹھہر کر آنسو بہایا کرتا تھا۔ اور آپ کے بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

عام طور سے مشہور یہ ہے کہ سب سے پہلے جناب عباس کا مرثیہ آپ ہی نے پڑھا ہے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے اس سے پہلے بھی مرثیہ کا وجود ملتا ہے اور تاریخ کر بلا کے بیان کے مطابق سب سے پہلے آپ کا مرثیہ امام حسین نے پڑھا ہے۔ لاش عہدار کے نمرانے پہنچ کر امام حسین نے جن جذبات کا مظاہرہ کیا ہے وہ یہ ہیں۔

أَجْبَىٰ يَا نَوْرَ عَيْنِي يَا شَقِيقِي

فَلَيْ قَدْ كُنْتَ كَالرُّكْبِ الْوَشِيقِ

أَيَا ابْنَ أَبِي نَصْحَتٍ أَخَاكَ حَتَّىٰ

سَقَاكَ اللَّهُ كَأَسَا مِنْ وَحِيقِ

أَيَا قَمْرًا مَنِيرًا كُنْتَ عَوْنِي

عَلَىٰ كُلِّ النَّوَائِبِ فِي الْمَضِيقِ

بَعْدَ لَيْلٍ لَا قَطِيبَ لَنَا حَيَاةَ

سَمَجْعٍ فِي الْخَدِّ إِذْ عَلَى الْمَقِيقِ

أَلَا لِلَّهِ شُكْرًا وَصَبْرًا

وَمَا الْقَاهُ مِنْ ظِلْمٍ وَفَيْقِ

(اسرار الشہادت)

اس کے بعد جناب ام البنین کے دوسرے ہیں جن میں آپ نے اپنے جذباتِ غم کا اظہار کیا ہے اور اپنے لال کی اس مصیبت کا تذکرہ کیا ہے جو پورے واقعہ کر بلا میں ایک انفرادی مصیبت ہے اور جس کے بیان کرنے کی نصیحت ایک ذاکرِ حنین کو عالمِ دریا میں خود جناب عباس نے کی تھی۔

فرماتی ہیں سو

يَا مَنْ رَأَى اَنْعَبَا س

كَرَّ عَلَى جَسَا هَيْبِ النَّفْدِ

وَوَرَاةُ مِنْ اَبْنَاءِ حَيْدَرٍ

كُلَّ لَيْثٍ ذِي لِبَدٍ

اُنْبِتُ اَنْ اَبْنَى اُصْبَبَ

بِرَاسِهِ مَقْطُوعٍ يَدِ

رَيْبِي عَلَى شَيْبِي اَمَالٍ

بِرَاسِهِ ضَرْبُ الْعَمَدِ

لَوْ كَانَ سَيْفُكَ فِي يَدِي لَكَ مَا دَانِي مِنْكَ اَحَدٌ

(البہار العین ص ۳۱ منتہی الآمال)

ترجمہ :- ”اے وہ شخص جس نے میرے لال عباس کو عظیم لشکر پر ایسے عالم میں حملہ کرتے دیکھا ہے جب اس کے پیچھے بہت سے حیدری شیر اور بھی تھے۔ مجھے خبر دی گئی ہے کہ میرے لال کے سر پر اس دقتِ ضربت لگی جب اس کے ہاتھ قطع ہو چکے تھے اور اس ضربت نے اسے گھوڑے سے گرایا تھا۔“

میرے لال! کاش تیری تلوار تیرے ہاتھ میں ہوتی تو کوئی شخص تیرے قریب بھی آنے کی ہمت نہ کرتا۔“

دوسرا مثنوی

اس مثنوی میں آپ نے اپنی کنیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اظہارِ غم کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ام البنین اس مال کا نام ہوتا ہے جس کے فرزند زندہ رہتے ہیں اور میرے لال تو کر بلا میں کام آچکے ہیں۔ اب مجھے ام البنین نہ کہنا چاہیے۔

”لَا تَدْعُوْنِي وَيَا اُمَّ الْبَنِيْنِ

تَذْكُرِيْنَ يَلِيُوْتُ الْعَرِيْنِ

كَانَتْ تُبَوِّنُ لِيْ اُدْعَى بِهِمْ

وَالْيَوْمَ اصْبَحْتُ وَاَمِنْ بَنِيْنِ

اَرْبَعَةٌ مِثْلُ سُورَةِ رَبِّيْ

قَدْ وَاَصَلُوا اَلْمَوْتَ يَقْطَعُ اَلزَّيْنِ

تَتَارَعُ اَلْمَحْرَصَاتُ اَمْثَلًا بِهِمْ

فَكَلَّمَهُمْ اَمْسَى صَرِيْعًا طَعِيْنِ

يَا لَيْثَ شَعْرِيْ اَكْمَا اَخْبِرْ

بَاَنْ عَيَّاسًا قَطِيعَ السَّيْكِ

(البہار العین ص ۳۲)

”میری بہنو! مجھے ام البنین نہ کہو۔ مجھے میرے شیر یاد آجاتے ہیں۔ کبھی میرے بیٹے زندہ تھے تو میں ام البنین تھی۔ اب تو ان میں کوئی زندہ بھی نہیں رہ گیا۔“

ہائے میرے چار شیر تھے۔ اور سب ہی کلا کٹائے پڑے ہوئے
ہیں۔ یہ اُس وقت شہید ہوئے جب بھوک اور پیاس نے ان کے جوڑ بند
تک خشک کر دیئے تھے۔
کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے کہ میرے عباس کے
ہاتھ قلم کر دیئے گئے۔

مرثیہ فضل بن حسن

علامہ عبدالحسین امینی طاب ثراہ نے الغدیر ۵/۳ پر ایک مرثیہ درج کیا
ہے جس کے بارے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ امام حسینؑ کا مرثیہ ہے اور
بعض کا خیال ہے کہ امام حسینؑ کی زبانِ مال ہے۔ اور بعض حضرات نے حضرت عباسؑ
کے پوتے فضل بن حسن بن عبد اللہ بن عباسؑ کی طرف منسوب کیا ہے۔

أَحَقُّ النَّاسِ أَنْ يُبَكِّيَ عَلَيْهِ

فَتَى ابْنِ الْحُسَيْنِ بِكَوْبِلَاءِ

أَخُوهُ وَابْنُ وَالِدِهِ عَلِيٌّ

أَبُو الْفَضْلِ الْمَضْرُجُ بِالْبَدْمَاءِ

مَتَّى وَاسَاةَ لَا يُثْنِيهِ شَيْءٌ

وَجَادَ لَهُ عَلَى عَطِيشٍ بِمَاءِ

(قمر بنی ہاشم مقرر ۱۷)

ترجمہ :- "کائنات انسانیت میں سب سے زیادہ مستحقِ گریہ

وہ جوان ہے جس نے کربلا میں امام حسینؑ کو رلا دیا۔ وہ امام حسینؑ کا

بھائی ابو الفضل ہے جو خاک و خون میں آغشته ہے اور جس نے
بھوک و پیاس کے باوجود جنگ بھی کی اور بھرپور بھائی کی لوازمات
اور سپردی بھی کی۔

ان مراثی کے علاوہ بے شمار مرثیے مختلف زبانوں میں تاریخ میں موجود ہیں۔
ان مراثی کا امتیاز یہ ہے کہ یہ اسی دور کے ہیں جس دور کا واقعہ ہے اور واقعہ سے
قریب ترین تعلق رکھنے والوں کے تاثرات ہیں۔

لیکن ابو الفضل العباسؑ کے حالات کا تجزیہ گواہ ہے کہ وہ ایک مردِ کامل تھے
اور ان کی زندگی یقیناً ایسی تھی کہ انھیں مردِ کامل کہا جائے۔

وہ علم و عرفان کے اعتبار سے بھی کامل تھے اور عزم و ہمت کے اعتبار سے
بھی۔ فنِ حرب کے اعتبار سے بھی کامل تھے۔ (اور جذبہ خدمت کے
اعتبار سے بھی۔ ان کا کمال ان کی میراث تھا۔ ان کے غزائم کی بلندی انھیں اب
وجد سے ملی تھی۔

ان کے ارادوں کی پختگی ان کی آغوشِ تربیت کا عطیہ تھی ان کا حوصلہ جہاد
ان کے نسلِ ابوطالب میں ہونے کا نتیجہ تھا۔

ازواج و اولاد

ازواج و اولاد کی بحث سیرت النجاری کے موضوع سے زیادہ مربوط نہیں ہوتی —
لیکن بعض جہات سے ان امور کا بھی ارتباط قائم ہو جاتا ہے اور ان سے بھی انسانی سیرت و کردار کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ مختصر طور پر اس موضوع کی بھی وضاحت کر دی جائے اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج بھی نشاندہی کر دی جائے۔

علماء النساب کا اتفاق ہے کہ جناب عباس کی زوجہ محترمہ کا اسم گرامی لبابہ تھا جو پدری رشتہ سے جناب عبید اللہ بن عباس بن عبد المطلب کی صاحبزادی —
اور مادری رشتہ سے جناب ام حکیم جویریہ بنت خالد بن قسریہ کنانیہ کی لڑکھنظر تھیں۔

آپ کی زندگی روز اول سے مصائب سے دوچار رہی — ابتدائے حیات میں معادیہ کے حاکم بسر بن ارطاة نے آپ کے دو بھائی عبد الرحمن اور قثم کو ماں کی گود سے چھین کر ان کے سامنے قتل کر دیا تھا، جس کی وجہ سے آپ کی مادر گرامی کو اس قدر صدمہ ہوا کہ ان کا دماغ ماؤں ہو گیا۔ ہر وقت اپنے فرزندوں کو یاد کیا کرتی تھیں اور نالہ

شیون میں مصروف رہا کرتی تھیں۔

آپ کے گریہ و زاری کا یہ عالم تھا کہ ایک مہینی شخص کو آپ کے حال پر دم آگیا اور اس نے بسر کے دربار میں تقرب حاصل کر کے موقع نکالا اور اس کے دونوں فرزندوں کو قتل کر دیا۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب نے عبید اللہ بن عباس کے دونوں بچوں کی شہادت کا حال سنا تو آپ کو بے حد صدمہ ہوا اور آپ نے بسر کے بارے میں بددعا کی جس کے بعد اُس کا دماغ خراب ہو گیا۔ اور وہ غلیظ کھا کھا کر ۸۶ھ میں واصل جہنم ہو گیا۔

امیر المومنین کی اس بددعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو جناب عبید اللہ اور ان کے فرزندوں سے کس قدر محبت تھی۔ اور آپ ان کی قربانیوں سے کس قدر متاثر تھے۔ انھیں عبید اللہ کی بیٹی تھیں جناب لبابہ جن سے جناب عباس کا عقد ہوا تھا۔ اور اس عقد کے نتیجہ میں مالک نے چند فرزند و دختر عطا کئے تھے۔

جناب عباس کے فرزندوں کی تعداد میں شدید اختلاف ہے۔ ایک عبید اللہ کا ہونا یقینی ہے۔ کہ باتفاق مورخین جناب عباس کی نسل انھیں سے چلی ہے — باقی کا وجود مختلف اعتبار سے اختلافی حیثیت رکھتا ہے۔

مقاتل کا بیان ہے کہ آپ کے دو فرزند کربلا میں شہید ہوئے ایک کا نام فضل تھا اور دوسرے کا نام قاسم۔

علامہ مقرر نے حدیقہ النیب کے حوالہ سے ایک حسن کا اضافہ کیا ہے اور ایک دختر کا بھی ذکر ہے جسے حدائق الانس نے لکھا ہے۔

عبید اللہ کے بارے میں ایک روایت داہی اہل حرم کے موقع پر درج کی جا چکی ہے۔

آپ اپنے وقت کے عظیم علماء میں شمار ہوتے تھے۔ اور ان کی تین بیویاں تھیں۔ رقیہ بنت الحسن۔ بنت عبید بن عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب۔ بنت مسور بن خرمہ زبیری۔

امام زین العابدین آپ کا بے حد احترام کیا کرتے تھے اور جب بھی آپ کو دیکھتے تھے بے ساختہ رونے لگتے تھے۔

آپ کا ارشاد تھا کہ میں عبید اللہ کو دیکھتا ہوں تو ان کے پدر بزرگوار کے کارنامے اور ان کی مظلومیت یاد آ جاتی ہے۔

جناب لبابہ کی مصائب خیر زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتداء میں دو کسں بھائیوں کی شہادت دیکھی اور انتہا میں دو کسں بچوں کی شہادت دیکھی۔ درمیان میں شوہر کی شہادت کے ساتھ ایک بھرے گھر کی شہادت کا منظر بھی دیکھا۔

آپ کے تفصیلی حالات کتابوں میں نہیں ہیں۔ لیکن بچوں کے حوصلے اور ان کا جذبہ شہادت اس بات کی دلیل ہے کہ باپ کے ساتھ مال نے بھی تربیت میں مکمل حصہ لیا ہے اور اس حوصلے کے ساتھ سزا دے کہ دین الہی پر قربان ہو جائیں اور بولاکے کام آئیں۔

جناب عبید اللہ کی تربیت میں تو زیادہ تر آپ ہی کا ہاتھ تھا۔ ان کی جلالت و عظمت اور ان کا علمی وقار دلیل ہے کہ مال نے اپنے لال کو پر دان چڑھانے میں کس مشقت کا سامنا کیا ہے اور کربلا کے ہولناک مصائب کو نظر میں رکھنے کے باوجود اپنے لال کو اپنے مرحوم شوہر کی یاد بٹا دیا ہے۔

جناب لبابہ کے کردار کو ان کی مادر گرامی کے کردار سے ملایا جاتا ہے تو ان کی عظمت کا ایک اور نقش ابھر آتا ہے۔

ان کی والدہ ماجدہ کے سامنے ان کے دو بچے قتل ہوئے تھے تو ہوش و حواس کھو

بیٹھی تھیں اور عقل و دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

لیکن جناب لبابہ نے نہایت ہی حوصلے سے اپنے بچوں کو قربان کر دیا اور ہوش و حواس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

مصائب کی اس تاریخ کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ صبر و ضبط کے ابتدائی مرحلہ کا نام ہے حکیم اور صبر و ضبط کی معراج کا نام ہے لبابہ! جناب عبید اللہ کے صرف ایک فرزند دتھے حسن۔

جناب حسن کے پانچ بیٹے تھے۔ ۱۔ انفعل۔ ۲۔ حمزہ۔ ۳۔ ابراہیم۔ ۴۔ عباس۔ ۵۔ عبید اللہ۔ اور حسن اتفاق یہ ہے کہ یہ سب کے سب علماء و فضلاء اور اہل شعر و سخن تھے۔

فصل۔ اپنے وقت کے عظیم ترین ادیب اور شجاع تھے۔ ان کے تین فرزند تھے اور تینوں ادیب تھے۔

حمزہ۔ اپنے جد بزرگوار امیر المومنین کی تشبیہ تھے۔ اور بقول علامہ مقرر "اسی بنا پر ماموں نے انھیں ہزار درہم الغام دیا تھا۔

ان کی شادی جناب عبد اللہ بن جعفر کے فرزند علی بن عبد اللہ کے بیٹے حسین کی دختر زینب سے ہوئی تھی۔ جن کے دادا علی کو لوگ زینبی کے نام سے یاد کرتے تھے اور انکی شہرت انکی مادر گرامی زینب کی وجہ سے تھی۔

ابراہیم۔ ایک عظیم فقیہ اور ادیب تھے۔ انکے ۱۹ فرزند تھے جن میں ابو الحسن علی بن یحییٰ بن علی بن ابراہیم لقب لبند (عمدۃ الطالب)

عباس۔ اپنے وقت کے بہت بڑے ادیب تھے۔ ان کے کارنامے تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

عبید اللہ۔ ان کے بارے میں محمد بن یوسف کا بیان ہے کہ ان سے زیادہ

بارعب اور بامروت شخص دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ ماموں کے زمانے میں حرمین کے متولی اور قاضی شہر بھی تھے۔

”ابوعلیٰ حمزہ“

حضرت عباسؓ کی نسل میں دردم حاضر کی معروف ترین شخصیت جناب حمزہ کی ہے، جن کی قبر مطہرہ میں پائی جاتی ہے ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ حمزہ بن قاسم بن علی بن حمزہ بن الحسن بن عبید اللہ بن عباس بن علی بن ابی طالب۔ بخاشی۔ خلاصہ۔ علامہ سفینہ البحار۔ تیفیح المقال، المتقانی؟

آپ اپنے وقت کے عظیم ترین علماء میں شمار ہوتے تھے۔ تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں آپ کا در حیات تھا جس کی وجہ سے آپ ثقت الاسلام کلینی صاحب کافی کے معاصر تھے۔

سعد بن عبد اللہ اشعری۔ محمد بن اسماعیل بن زاذیرہ القمی۔ حسن بن مشیل۔ علی بن عبد اللہ بن یحییٰ جعفر بن مالک فزاری کوئی۔ ابو الحسن علی بن الجندی الرازی۔ محمد بن علی بن حمزہ بن الحسن جیسے جلیل القدر علام امت آپ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ حکومت وقت کے شدید ترین مظالم کے دور میں جناب زحیل خاتون کو آپ ہی نے پناہ دی تھی۔

آپ کی قبر کا سرانجام آیت اللہ محمد ہدیٰ قزوینی نے اس طرح لکھا تھا کہ آپ حرمین قیام پذیر تھے اور قبر حمزہ کی زیارت کے لئے نہیں جاتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ جناب حمزہ کی قبر رے میں ہے اور یہ قبر جعلی ہے۔

ایک دن خواب میں دیکھا کہ بزرگ زیارت کی دعوت دے رہے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ قبر حمزہ کی ہے اور اس کا تذکرہ کتب جال میں موجود ہے۔

صبح کو اٹھ کر آپ نے جملہ کتب رجال کا مطالعہ کیا اور قبر کی تحقیق کے بعد زیارت کے لئے آئے۔ اتفاق سے اسی شکل و صورت کا ایک عرب نظر آگیا۔ آپ نے باصرہ تمام اس سے دریافت کیا۔

لیکن اس نے معذرت کی کہ میں مرد عامی ہوں۔ مجھے کتب رجال کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ حاضرین روضہ نے بھی اس امر کی تصدیق کی۔

تو سرکار موصوف کو اندازہ ہو گیا کہ یہ امام عصر کی عنایت تھی اور آپ کا منشاء تھا کہ اس قبر مطہر کی زیارت کی جائے۔ جنتہ المساوی حکایت ۴۵۔

مولفہ!۔ نجف اشرف کے قیام کے دوران اکثر حرم کے تذکرہ کے دوران حمزہ وقاسم کا نام سنا کرتا تھا۔ لیکن ان حضرات کی شخصیت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ ایک تعطیل میں قبلہ مشرق مولانا شمیم الحسن صاحب قبلہ بنارس اور علامہ طالب جوہری (کراچی) کے ہمراہ حرم کی زیارت کے لئے روانہ ہوا تو چاروں طرف گردش کرتے کرتے بمشکل تمام جناب حمزہ کی قبر تک پہنچا۔ معلوم ہوا کہ یہ نسل حضرت عباسؓ میں ایک جلیل القدر شخصیت کے مالک تھے اور ان کا روضہ آج تک مرجع خلافت بنا ہوا ہے۔

گرد و نواح کے عرب مرد و زن نہایت ہی عقیدت سے روضہ پر ماضی دیتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔

مالک کائنات اس جلیل القدر سید و عالم دین کے طفیل میں ان کی مرادیں کو پورا کرتا ہے اور ان کے دامن تمنا کو گھر مراد سے بھر دیتا ہے۔

حضرت عباسؓ کا یہ امتیازی شرف ہے کہ آپ کی اولاد طاہرین میں جن شخصیتوں کے نام تاریخ میں ملتے ہیں۔ سب اہل علم و فضل اور ادب کمال و جمال تھے۔

قربانی کے صلہ میں آخرت کے مدارج اپنے مقام پر ہیں۔ دنیا میں اتنی بڑی
 نیک نامی بھی عنایت الہیہ کا عظیم ترین نمونہ ہے۔
 جو ہر فرد بشر یا مجاہد راہِ خدا کو نصیب نہیں ہوتا۔



باب المراد

انسانی زندگی میں قاریق عادت اور غیر معمولی افعال کا مادہ کوئی غیر معمولی
 بات نہیں ہے۔ آئے دن نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں اور صبح و شام تازہ
 یہ تازہ ایجادات عالمِ ظہور میں آتی رہتی ہیں۔
 فکر و نظر اور علم و سنہری دنیا میں وہ مناظر مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جن کا
 تصور بھی تقریباً محال تھا۔

کون سوچ سکتا تھا کہ زمین پہ رہنے والا انسان خلاؤں میں پرواز کرے گا۔
 کس کے تصور میں تھا کہ گھر کی محدود دفن میں زندگی گزارنے والا
 ایک لمحہ میں آفاق کی وسعتوں میں سیر کرے گا۔

کس کے دہم و گمان میں تھا کہ آن کے آن میں دنیا الہر کی خبریں اور تصویریں
 نگاہوں کے سامنے آجائیں گی۔ نہ کوئی مجہ قابل جستجو رہے گی نہ کوئی مرض ناقابل علاج
 رہ جائے گا۔

خطہ ادم کا گوشہ گوشہ انسانی قدموں کا روندنا ہوا ہو گا اور جسم انسانی

کی ایک ایک رگ طیب حاذق کے ہاتھ میں ہوگی۔

یہ غیر معمولی اعمال اور خارق عادت ایجادات صبح و شام کے نظارے بن چکے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے یہ تصور انتہائی لغو ہے کہ انسان غیر معمولی اعمال پر قادر نہیں ہے یا خارق عادت افعال انجام نہیں دے سکتا۔

فرق صرف یہ ہے کہ یہ سارے اعمال و ایجادات اپنے مادی اسباب کے تحت عالم ظہور میں آتے ہیں۔

فضا پیا آلات اور فلک سیر سیارات اپنے مخصوص اسباب و آلات کے تابع ہیں۔ یہ ادبات ہے کہ فکر انسانی کے درجات و مراتب کی بنا پر ایک انسان اس درجہ اگشان تک پہنچ جاتا ہے اور دوسرا نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ منزل تک پہنچ جانے والا غیر معمولی اسباب کی بنا پر پہنچ گیا ہو یا اس کے مادی اسباب ہی نہ ہوں۔

اسباب سب موجود ہیں صرف ذہن کی رسائی درکار ہے جس کا ذہن رسا ہو گیا وہ موجد کہا گیا اور جس کا ذہن رسائی نہ پاسکا وہ متبع شمار کیا جائے گا۔

مذہبی دنیا میں کرامت و اعجاز کا سلسلہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں غیر معمولی اور خارق عادت کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن ان کے عام مادی اسباب نہیں ہوتے۔ ان کا تعلق تمام تر روحانی اسباب اور ربانی فیوض و برکات سے ہوتا ہے۔ مادی اسباب کے تحت منظر عام پر آنے والے غیر معمولی عمل کو ایجاد و انکشان کہتے ہیں۔ اور غیر مادی اور غیر معمولی اسباب کی بنا پر منصفہ شہود پر آنے والے عمل کو کرامت و اعجاز کہتے ہیں۔ کرامت و اعجاز کی دنیا کا کوئی تعلق عالم مادیت سے نہیں ہے۔ اس کے اسباب عام عالم اسباب میں تلاش نہیں کئے جاسکتے۔ اس کے ظہور میں مالک کی عنایت اور رب العالمین کے فیض و کرم کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔

صاحب ایجاد و انکشان سیکڑوں اور ہزاروں ہو سکتے ہیں۔ لیکن صاحب کرامت و اعجاز بہت کم ہوتے۔ کرامت و اعجاز سے لئے روحانی کمال اور معنوی ارتقاء درکار ہے۔ اور معنوی ارتقاء کی منزل تک پہنچنے کے لئے ریا منیت نفس، اطاعت الہی، بندگی رب، تسلیم و رضا جیسے عظیم مذہبات درکار ہیں۔ جن کا وجود ہر فرد بشر میں ممکن نہیں ہے۔

کرامت و اعجاز میں بھی باہمی طور سے ایک نازک فرق پایا جاتا ہے۔ کرامت کا تعلق کبھی خدائی دعویٰ کے اثبات اور منصب کے اظہار سے ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ کرامت صرف ضرورت مندوں کی حاجت روائی اور بے نواؤں کی مشکل کشائی سے متعلق ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی غیر معمولی اعمال کو معجزہ کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کے اعمال کو کرامت۔

معجزہ و کرامت دونوں ہی بلند نفس اور پاکیزہ کردار کے طالب ہیں۔ دونوں ہی کے لئے عظیم عرفان اور غیر معمولی روحانیت درکار ہے۔ لیکن صاحب اعجاز کا مرتبہ کچھ بلند ہوتا ہے۔

وہ اپنے منصب کی بنا پر ایک مزید امتیاز کا حامل ہوتا ہے۔ اسے رب العالمین خصوصی اعتماد کے قابل سمجھ کر منصب بھی عنایت کرتا ہے۔ صاحب کرامت کا یہ امتیاز نہیں ہوتا ہے۔ وہ بلند نفس اور بلند کردار ضرور ہوتا ہے لیکن صاحب منصب و مہر الہی نہیں ہوتا۔ جس کے بعد یہ واضح ہے کہ صاحب اعجاز ہونا ایک خدائی دین اور ربانی عطیہ ہے۔

اور صاحب کرامات ہونا اتنا بلند مرتبہ نہ ہونے کے باوجود کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے بھی روحانیت و معنویت اور عظیم تر علم و عرفان درکار ہے۔ درجہ حاضر میں ہر مرنے والے کو "صاحب کرامات" سمجھ لینا اور ہر ایک کی قبر

سے توسل کرنا ایک رسم عام بن گیا ہے۔
توسل کرنے والے کو صاحب قبر کا اسم و رسم تک نہیں معلوم ہوتا۔ اور وہ گرد قبر اٹکنا
کئے مسلسل مرادیں مانگتا رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب کرامت ہونے کے لئے
کوئی شرط ہی نہیں ہے۔ اور اس کے لئے کسی روحانی مرتبہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہی
جہالت تھی جس نے وہابیت کی تحریک کو آگے بڑھایا اور یہ تحریک روز بروز آگے بڑھتی
چلی جا رہی ہے۔

متوسلین و معتقدین کے اذہام کے باوجود جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا
ہے کہ یہ قبر ہی نہیں ہے۔ یا کسی جانور اور پست ترین انسان کی قبر ہے۔
ایسے حالات میں مرادیں پوری ہونے کا پروپیگنڈہ قہری طور پر ایک ذہنی رد عمل پیدا
کرتا ہے۔ اور مذہب سے بیزاری کا جذبہ عام ہو جاتا ہے۔ وہابیت کی تحریک ایسے
ہی مواقع کی تلاش میں رہتی ہے کہ مذہب سے بیزاری کا جذبہ پیدا ہو اور وہ اپنی تحریک
کے لئے راہیں ہموار کر لے۔

"ہوشمند انسان" اور دانش جو طالب علم کے لئے یہ برا آؤ مائشی لمحہ ہے۔
اس کا ذوق مذہب توسل اور توجہ پر محدود کرتا ہے۔ اور اس کے گرد پیش کے حالات
بدگمانی اور بدظنی کی فضا ہموار کرتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ کوئی ایسا معیار مقرر کر لیا جائے جس سے بزرگان ملت کی عظمت
و برتری بھی برقرار رہے اور "قبر پرستی" جیسے توہمات کو فروغ بھی نہ ملنے پائے۔
اسلامی نقطہ نظر سے ایک عام مرد مومن کا احترام بھی موت و حیات میں مختلف
نہیں ہوتا۔ اور مرنے کے بعد اس کا وہی احترام باقی رہ جاتا ہے جو مالیت حیات
میں تھا۔

اولیاء خدا اور خاصان رب کی منزل اس سے بلند تر ہے۔ ان سے تو یہ توقع

قطعی صحیح اور برحق ہے کہ وہ بعد موت بھی اسی طرح رہنمائی اور حاجت روائی کرتے رہیں
گے جس طرح حیات کی حالت میں کیا کرتے تھے۔

عام افراد کے بارے میں یہ تصور بھی قطعی ہے کہ وہ نہ حالت حیات میں کچھ کر سکتے
تھے اور نہ بعد الموت ہی کچھ کر سکتے ہیں۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ کون "دلی خدائے" اور "خاصہ رب" ہے اور کس میں ان
صفات کا فقدان ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا معیار عوام کی رائے کو نہیں قرار دیا جاسکتا۔ وہ تو بہر حال
ہر قبر کے گرد جمع رہتے ہیں۔ اور ہر خاص و عام کو دلی و مرشد تصور کرتے ہیں۔ ان کی
نظر میں صاحب قبر کی حقیقت کرنا کبھی ولایت کی توہین اور ایک قسم کا کفر ہے۔ ان کے
معتقدات کا کوئی اعتبار نہیں ہے

ضرورت ہے کہ ان کی رائے سے ہٹ کر کوئی معیار تلاش کیا جائے۔ اور اس کی روشنی
میں دلی بغیر دلی کے درمیان خطا فاصل کھینچا جائے۔

بظاہر یہ مسئلہ زیادہ دشوار نہیں ہے اور اس کا واحد حل یہ ہے کہ کرامت کے
مفہوم پر غور کر لیا جائے اور پھر حالات کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے۔

کرامت مادی اسباب کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے غیر معمولی عمل کا نام نہیں
ہے کہ ہر صاحب فیر صاحب کرامت ہو جائے۔ اور اس میں مسلم و کافر اور مؤمن و مشرک
کا بھی فرق نہ رہ جائے۔

کرامت ایک خدائی عطیہ اور ربانی فضل ہے جس کے بعد بندہ اس قدر صاحب
اختیار ہو جاتا ہے کہ حیات و موت دونوں حالات میں رہنمائی اور حاجت روائی کر سکتا
ہے۔ اور اس کا فیصلہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کہ اس نے کس کو یہ حیثیت دی ہے
اور کسے نہیں دی۔ کس کے شامل حال یہ فضل کیا ہے اور کس کو اس فضل سے محروم رکھا ہے۔

وہ جسے صاحبِ فضل کہہ دے گا صاحبِ فضل ہوگا۔ کائنات میں کوئی اس کے پاس آئے یا نہ آئے۔ اور وہ جسے صاحبِ فضل نہ کہے گا وہ صاحبِ کرامت نہ ہوگا چاہے ساری کائنات اس کی بارگاہ میں جمع ہو جائے۔

اس کے کہنے کے انداز بھی مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی وہ خود اعلان کرتا ہے اور کبھی اپنے مستند صاحبِ منصب کے ذریعہ اعلان کروا دیتا ہے۔ اور جس کی شخصیت و حیثیت کو غیر معمولی کہہ دیتا ہے وہ صاحبِ کرامات ہو جاتا ہے۔ اور جس کو ایک عام انسان سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا وہ صاحبِ کرامات نہیں قرار پاتا۔

حضرت عباس کے صاحبِ کرامات ہونے کی بہترین دلیل یہ ہے کہ انھیں الہی منصب دار۔ سبطِ رسول الثقلین حضرت امام حسینؑ نے ایک عظیم مرتبہ کا حامل بتایا ہے۔ اور اپنی طرف سے ”باب المراد“ قرار دیا ہے۔ اب امام حسینؑ سے طلبِ فیض کرنے والا حضرت عباسؑ کے در پر آئے گا۔ اور امام حسینؑ کی بارگاہ میں رسائی کا طلب گار حضرت عباسؑ کی چوکھٹ پر سر نہیادھکائے گا۔

حضرت عباسؑ صاحبِ علم و عرفان کبھی ہیں اور صاحبِ روحانیت و معنویت بھی۔ ان کے فضائل و کمالات اور ان کے مراتب و مناقب کے بارے میں مختلف معجزات کی شہادتیں موجود ہیں۔

ان کی عظمت و برتری کا مسلم ہونا یقینی ہے اور انھیں مالک کی طرف سے کرامت و امتیاز کا عطا ہونا کوئی عجیب و غریب بات نہیں ہے۔

واقعہ کر بلا سے آج تک کی تاریخ پر نظر رکھنے والا انسان جانتا ہے کہ حضرت عباسؑ سے اس قدر کرامات کا ظہور ہوا ہے کہ شاید ہی کائنات میں کسی ”فرد بشر“ سے اتنے کرامات کا ظہور ہوا ہو۔

زائرینِ کربلا کی رہنمائی، صاحبانِ حاجت کی حاجتِ روائی، اسیرانِ مشکلات کی رہائی

وہ بے شمار مواقع ہیں جہاں حضرت عباسؑ یا ان کے آثار و فیوض و برکات کا مسلسل مشاہدہ کیا گیا ہے۔

واقعات کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ان کے نقل کرنے کی کوئی خاص افادیت ہے۔

واقعات وہاں نقل کئے جاتے ہیں جہاں واقعہ کسی معصوم سے متعلق ہوتا ہے۔ تو اسے سند بنایا جاتا ہے۔ یا واقعہ کی مدت گزر چکی ہوتی ہے تو اس کی یادوں میں تازہ رکھی جاتی ہے۔

لیکن جہاں مدت کے تمام ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور صاحبِ کرامت ہر آن حاجتِ روائی کے لئے تیار ہے وہاں واقعات کی نہیں جذبات و توجہات کی ضرورت ہے۔

آج بھی کوئی انسان کرامات و کمالات کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے تو صدقِ دل سے ”باب المراد“ کی بارگاہ میں آئے یا ان سے توسل کرے۔ انشاء اللہ مراد ضرور پوری ہوگی۔

اور بعض واقعات سے تو یہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات روضہ حضرت سید الشہداء سے مراد پوری نہیں ہوتی تو صاحبِ ضرورت روضہ ابوالفضلؑ میں آیا اور مراد پوری ہو گئی۔

اور جب یہ سوال اٹھایا گیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ تو جواب ملا کہ ”عباسؑ“ ”باب المراد“ ہیں۔ عباس باب الحسینؑ ہیں۔ دروازہ چھوڑ کر منزل تک آنے والا ہمارا نہیں ہو سکتا۔ مراد حاصل کرنا ہے تو باب المراد تک جاؤ۔ اور حسینؑ کی بارگاہ سے کچھ لینا ہے تو دروازہ کی طرف سے آؤ۔

بعض اعلامِ امت کا زیادتِ امام حسینؑ سے پہلے زیارت حضرت عباسؑ کے لئے

جانا اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ منزل تک پہنچنے کا واحد وسیلہ ”دروازہ“ ہے۔ یہ ادبیات ہے کہ یہ تربیت شرط نہیں ہے اور اس کے برخلاف بھی ہو سکتا ہے۔

اس لئے کہ عباس معنوی اعتبار سے ”باب الحسین“ ہیں۔ صرف ظاہری اعتبار سے نہیں۔ زیارت میں یہ تربیت بھی نہ رہ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

زین میں یہ ضرور رہنا چاہیے کہ مثلاً کانیف حضرت ابو الفضل کے درویش مے گا اور حضرت ابو الفضل سے جو کچھ ملتا ہے وہ امام حسینؑ ہی کا فیض و کرم ہے۔

”امام سولہین و مصنفین کی رسم ہے کہ جذبہ عقیدت و محبت کی تسکین کے لئے بعض ایسے واقعات درج کر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ تبرکات یہاں بھی بعض واقعات کا اندراج کیا جاتا ہے۔ اور ان واقعات میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ان سے کرامت ابو الفضل کے علاوہ بھی کسی نکتہ کا علم حاصل ہو سکے۔

(۱) آیت اللہ خاتم المجتہدین حضرت شیخ مرتضیٰ الفارسی طاب ثراہ کے شاگرد رشید آقا شیخ عبدالرحیم شوستری متوفی ۱۳۱۳ھ کا بیان ہے کہ میں زیارت سید الشہداء سے فارغ ہونے کے بعد حرم ابو الفضل میں آیا۔ مشغول زیارت و دعا تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص عرب اپنے مفلوج بچے کو لیکر آیا اور فریح ابو الفضل سے باندھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بچہ صحت یاب ہو گیا اور وہ عرب خوش خوش اسے لیکر چلا گیا۔

میرے دل پر اس واقعہ کا بے حد اثر ہوا۔ اور میں نے کہا یا ابا الفضل! کیا آپ کی نظر میں میری ایک عام عرب کے برابر کبھی قیمت نہیں ہے کہ اس کا مدیٰ فوراً پورا ہو گیا اور میں اتنی دیر سے مانگ رہا ہوں اور میری مراد پوری نہیں ہوتی۔

یہ کہنے کے بعد معاذ بن میں خیال آیا کہ یہ سودب ہے مجھے یہ نہیں کہتا چاہیے تھا۔ فوراً توبہ و استغفار کیا اور حرم سے باہر نکل آیا۔

بخلاف اشرف آنے کے بعد شیخ الفارسی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے درویش

عطا کیں۔ اور فرمایا کہ ایک مکان خرید لینا اور ایک سے حج کے لئے جانا۔

میں یہ دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ اور بے حد شرمندہ ہوا۔ اس لئے کہ میں نے حضرت عباس سے اتنا ہی مطالبہ کیا تھا۔

اس واقعہ سے جناب عباسؑ کی عظمت کے علاوہ شیخ الفارسی جیسے علما ان عباسؑ کی جلالت قدر اور ان کی بندگی کردار کا بھی اندازہ ہوتا ہے

ایک حضرت عباسؑ تھے جنہوں نے اپنے سائل کو نامراد نہیں پلٹایا۔ ایک شیخ الفارسی تھے جنہیں ”باب المراد“ کی طرف سے وسیلہ قرار دیا گیا۔ اور ان کے ہاتھوں برکات تقسیم کئے گئے۔

اور ایک آقا شوستری تھے جنہیں عام بشری جذبات نے ”اسانت ادب“ پر آمادہ کر دیا۔ تو توجہ کے بعد فوراً توبہ و استغفار کر لیا کہ حضرت عباسؑ کی جلالت بہت بلند ہے۔ ان کی بارگاہ میں کوئی نامناسب کلمہ نہیں کہا جاسکتا۔ توبہ و استغفار عزت و عظمت کا وسیلہ ہے تو میں ذلت کا ذریعہ نہیں۔

ادب علم کے لئے یہ واقعہ شمع راہ ہے۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ اگر حبیب اللہ بارگاہوں میں کوئی بھی ”اسانت ادب“ ہو جائے تو فوراً توبہ و استغفار کریں۔ اور اپنے دامن مراد کو گہر مغموم سے مالا مال کر لیں۔

(۲) علامہ سید نصر اللہ الحائری طاب ثراہ کا بیان ہے کہ میں حرم ابو الفضل میں خدام کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کہ ایک مرتبہ حرم کے اندر سے ایک عرب روتا ہوا نکلا۔ اس کی ایک انگلی کٹی ہوئی تھی اور اس سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اسے روک کر پوچھا کہ یہ کیا اجزا ہے۔

اس نے کہا کہ یہ انگلی حضرت عباسؑ نے کاٹ دی ہے۔ میں فوراً حرم کے اندر آیا اور دیکھا کہ وہ انگلی مزج سے معلق ہے۔ اور اس میں ایک قطرہ خون بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوا

اس شخص نے حرم اقدس میں کوئی بے ادبی کی تھی۔ اور اس کی سزا اسے دی گئی ہے۔ دوسرے دن وہ شخص شدتِ الم سے انتقال کر گیا۔

(۳) خطیب شہیر علامہ شیخ محمد جو اس نے علامہ اجل شیخ جاسم فحام کے حوالے سے بعض خطباءِ ایران کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ایران کا ایک صاحبِ ثروت انسان کاظمین میں مقیم تھا اور وہ برابر لوگوں کو خصوصی کے مواقع پر زیارتِ امام حسینؑ کے لئے بھیجا کرتا تھا۔ ایک سال مالِ خراب ہو گئے اور وہ معذور ہو گیا۔ دفعتاً خیال آیا کہ مجھے زوار کو بھیجنا چاہیئے۔ اس کے بعد جو بھی حشر ہو گا دیکھا جائے گا۔

جواز کرایہ پر لئے اور کہا کہ کرایہ کر بلائے معلىٰ میں روں گا۔ زوار کو جمع کیا۔ اور قافلہ کو لے کر چلا۔ حرمِ امام حسینؑ میں آکر فریاد کی!

”مولّا! آپ کے زوار کو لایا ہوں۔ ان کو کرایہ عطا کیجئے۔“ کوئی جواب نہ ملا۔ دل نے آواز دی۔ تو نے غلطی کی۔ دردِ ازسے کے بغیر منزل تک آگیا۔ جا۔ اور جا کر عباسؑ سے التماس کر۔ میں فوراً حرمِ ابوالفضلؑ میں آیا۔ اور یہی گزارش کی۔

ابھی میری التجا تمام نہ ہوئی تھی کہ ایک شخص نے ایک تھیلی لاکر دی جس میں میری ضرورت سے کہیں زیادہ درہم درہم دینار تھے۔ میں خوش خوش پلٹ آیا۔ اور سب کا کرایہ ان کو دیا۔ قمر بنی ہاشم مقرباً۔

(۴) آقائے عباس طباطبائی کا بیان ہے کہ میں کربلا میں مشغولِ درس تھا۔ ایک مرتبہ حرمِ حضرت عباسؑ میں شور ہوا کہ معجزہ ہو گیا ہے۔ میں دوڑ کر حرم میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک جم غفیر ہے۔ اور اس کے درمیان ایک عورت بے ہوش پڑی ہے۔ اور ایک طوقِ حرم کی ایک قندیل میں معلق ہے۔ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر ماہر کیا ہے؟

تو ڈی دیر کے بعد اُس کے اعزاء و اقرباء آ گئے اور سب نے مل کر بے مدآہ دزاری اور نالہ و فریاد کیا۔ یہ مشکل وہ عورت ہوش میں آئی۔ تو اس نے بیان کیا کہ میرا بچہ بیمار تھا

میں نے نذر کی تھی کہ جب شفا یاب ہو جائے گا تو میں یہ طوقِ روضہ حضرت عباسؑ میں نذر کروں گی۔

بچہ شفا یاب ہو گیا تو میں ایٹھائے نذر کے لئے آئی۔ یہاں آکر یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ طوق بہت قیمتی ہے۔ اب کام مکمل چکا ہے۔ بہتر ہے کہ اس کے بدلے سونا چڑھا دیا جائے۔

یہ خیال آتا تھا کہ ایک پرچھائیں سی نظر آئی اور میں بیہوش ہو گئی۔

(موسم الغوم ص ۳۲)

(۵) ایک عظیمِ فضل و کرم جو خود حقیر کے شامل حال ہوا۔ ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۹ء کا زمانہ تھا۔ میں نجف اشرف میں مشغولِ تحصیل تھا۔ میرے ہمراہ والدہ گرامی بھی وہیں مقیم تھیں۔ ذی الحجہ کا مہینہ آیا تو والدہ محترمہ نے فرمایا کہ عشرہ محرم کربلائے معلیٰ میں کرنا ہے۔ میں نے عرض کی کہ اس سال حالات اچھے نہیں ہیں۔ یہاں کرایہ کا مکان موجود ہے اور کربلا میں مکان کرایہ پر لینا پڑے گا۔ اس زمانہ میں کرایہ وغیرہ بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اس سال نجف اشرف کا محرم کیا جائے۔

وہ بے حد غلغلین ہوئیں اور ان کا اصرار جاری رہا کہ کربلا جانا ضروری ہے۔ میں نے عرض کی کہ ہم لوگ محرم سے قبل دورہ کی زیارت سے جلیں۔ (۱۰ دینار اپنے پاس ہے۔ اس میں یہ زیارتیں ہو جائیں گی۔ واپسی میں تیسری جو تہی محرم کو ایک روز کربلا معلیٰ میں قیام کر کے نجف اشرف واپس آجائیں گے۔

درحقیقت یہ اس جذبہ کی سزا تھی درنہ بارگاہِ ابوالفضلؑ کو کسی کے طوق و زنجیر کی ضرورت نہیں ہے۔ ایٹھائے نذر کرنے والا دورہ قیامت جواب دہ ہو گا اور اسے مالک کی بارگاہ میں جواب دہ ہونا پڑے گا۔

۲۸/۲۸ رزی الحج کو ہم لوگ روانہ ہوئے۔ پہلے کہ بلا آئے۔ یہاں مکان کے بارے میں دریافت کیا تو ایک ہوٹل میں ایک کمرہ کا کرایہ دس دینار بتایا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقدار اپنے تصور سے بالآخر تھی۔ اس لئے ہم لوگ شام کو کاظمین کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں ایک روز قیام کر کے سامرہ چلے گئے۔ دو روز وہاں قیام کیا۔ اسکے بعد واپس ہوتے ہوئے پھر کہ بلا آئے۔ کہ بلائے معلیٰ میں آقائے حجت الاسلام مولانا سید حسن الرضوی دام ظلہ لکھنؤی مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔ اور ہر سال اپنے گھر میں عشرہ حرم کرتے ہیں اور خود ہی ڈاکری فرماتے ہیں۔

میں حسب روایات اس مجلس میں حاضر ہوا تو ان کے فرزند عزیز محترم علامہ سید سلیمان الرضوی نے بعد مجلس کہا کہ آپ در اٹھ جائیے گا۔ والد ماجد کو آپ سے کچھ کام ہے۔ میں حسب خواہش حاضر ہوا تو جناب موصوف نے فرمایا کہ ایک صاحب افریقہ سے آئے ہیں اور آپ کی کوئی امانت لائے ہیں۔

اس وقت تک میرا کوئی رابطہ افریقہ سے نہیں تھا۔ میرے برادر معظم حجت الاسلام مولانا السید علی عابد الرضوی دام ظلہ (جو عرصہ دراز سے افریقہ میں قیام پذیر ہیں) بھی عراق میں زیر تعلیم تھے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ افریقہ سے میرا کیا کیا تعلق ہے؟

میں نے عرض کیا کہ وہ بزرگ کہاں ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اب کل مجلس میں ملیں گے۔

برادر غلام بھی بسلسلہ عشرہ حرم وہیں مقیم تھے۔ میں نے بمشکل تمام انہیں کے ساتھ ایک مختصر کمرہ میں قیام کیا اور دوسرے دن بھی گیا تو بعد مجلس ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ڈاکری دیکھ کر پوچھا کہ سید زیشان حیدر آپ کا نام ہے؟ میں نے

کہا جی ہاں۔

انہوں نے فرمایا اور سید علی عابد رضوی؟ میں نے کہا کہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں؟۔

انہوں نے کہا کہ آپ دونوں کی امانتیں میرے پاس ہیں۔

میں نے کہا کہ افریقہ میں میرا کوئی شناسا نہیں ہے۔ غالباً آپ کو اشتباہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے پھر ڈاکری کو دیکھا اور کہا نام یہی لکھے ہیں۔ میں نے کہا بڑی مشکل کی بات ہے کہ اس نام کا میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ بہر حال میں آپ کی امانت لئے لیتا ہوں۔ اب اگر دوسرا مستحق نکل آیا تو ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ میں واپس کرنے کے لائق نہیں ہوں۔

انہوں نے خوشی سے اس شرط کو منظور کر لیا اور دے کر چلے گئے۔ میں مولائے کرم اور اپنی دعاؤں کی قبولیت پر خوشی خوشی گھر واپس آیا اور والدہ ماجدہ کو واقعہ کا اطلاع دی۔ وہ بھی بے حد مسرور ہوئیں۔

اسی دن کرایہ پر مکان لے لیا۔ اور عشرہ حرم بھر کر بلائے معلیٰ میں قیام کیا۔ سرزمین کر بلائے معلیٰ کی یہ برکت اور باب الخوان حضرت عباسؑ کی بارگاہ سے یہ اتفاق حقیقی زندگی کا وہ یادگار واقعہ ہے جسے ماحشر نہیں بھلایا جاسکتا۔

اب تک کئی مرتبہ افریقہ جانے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ اور برادر غلام دام ظلہ ۲۲ سال سے وہاں مقیم ہیں۔ لیکن آج تک نہ معلوم ہر سکا کہ اس رقم کا بھجیے والا یا لاسے والا کون تھا۔

ظاہر ہے کہ اس کو حضرت "باب المراد" کے فیض و کرم کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ اس میں میری پریشانیوں سے زیادہ میری والدہ گرامی

کے اخلاص کا دخل ہے۔

بارگاہ البرافض میں ان کا اخلاص عجیب و غریب حیثیت رکھتا ہے۔ خدا نے
کریم اس اخلاص میں اضافہ فرمائیے۔ اور ہر صاحب ایمانی کو ان فیوض و برکات سے استفادہ
کرنے کا موقع دے! والحمد للہ اولاد آخرہ۔

جوادِ

۲۳، شوال المکرم ۱۳۹۳ھ

نظر ثانی ۱۳، جمادی الثانی ۱۴۰۵ھ

جب زباں پر کبھی آجاتا ہے نامِ عبّاس

دیر تک ہونٹوں سے خوشبوئے وفا آتی ہے

جوادِ